خصوصی شمارہ

ہندی کہانیاں (۴)

آج

۷۳

پھنیشور ناتھ رینو

مدرا راکھشس

اصغر وجاہت

پنکج سُبیر

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 73

جنوری 2012

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 800 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 80 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

بینک: میزان بینک، صدر برانچ، کراچی

اکاؤنٹ: City Press Bookshop

اکاؤنٹ نمبر: 0100513669

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 35650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

پھنیشور ناتھ رینو

اچھے آدمی	9
تھیٹر والا	31
رسول مستری	38
رومانس سے خالی پریم کہانی کی تمہید	49
ٹیبل	67
لکیریں، دائرے	89

❁

مدرارا کھشس

ہیرابائی ناچے گی	104
چوہے	116
سانچی بولو راجہ	129
رس کہی	138
آسیب	147
ایک بندر کی موت	159
جلے مکان کے قیدی	171

Scanned with CamScanner

جنگ 192
ماتم پرسی 205
نی 214
خرگوش 224
کشتی 231

❁

اصغر وجاہت

سرگم کولا 242
اُن کا ڈر 252

❁

پنکج بِسِٹ

ایسٹ انڈیا کمپنی 262
کفر 270
گھیراؤ 278

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

R s.200

روشن دان

(خاکے)

جاوید صدیقی

R s.200

لغاتِ روزمرہ (تیسرا ایڈیشن)

اردو زبان میں غیر معیاری استعمالات کی

فہرست و تنقید کچھ مزید لسانی نکات کے ساتھ

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.400

اردو کا ابتدائی زمانہ

(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

بوفِ کور

(ناول)

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.200

گمشدہ چیزوں کے درمیان

عالمی ادب سے انتخاب

(منتخب ترجمے)

محمد سلیم الرحمٰن

Rs.250

شہنشاہ

(ناول)

ریشارد کاپوشنسکی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.200

زٹل نامہ

(کلیات)

جعفر زٹلی

مرتب: رشید حسن خاں

Rs.300

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 71 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں کابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔ (یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 800 روپے
بیرون ملک: 80 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

ہماری کتابیں

ساری نظمیں
(کلیات)
ذی شان ساحل
Rs.750

وجہِ بیگانگی
(غزلوں کا مجموعہ)
ذی شان ساحل
Rs.150

زندگی میرے پیروں سے لپٹ جائے گی
(نظمیں)
تنویر انجم
Rs.350

بے یقین بستیوں میں
(نظمیں)
علی اکبر ناطق
Rs.150

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)
قاسم یعقوب
Rs.160

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

خودکشی کے موسم میں
(نظمیں)
زاہد امروز
Rs.120

سویرے کا سیاہ دودھ
(نظمیں)
جرمن شاعر پاؤل سیلان
ترجمہ: آفتاب حسن
Rs.150

مٹی کا مضمون
(نظمیں)
فرخ یار
Rs.150

رات
(نظمیں)
سعیدالدین
Rs.50

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کراچی کی کہانی
(جلد اول و دوم)
ترتیب: اجمل کمال
Rs.1100

ریت پر لکیریں
(انتخاب)
محمد خالد اختر
Rs.300

قرۃ العین حیدر کے خطوط
ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

انیس
(سوانح)
نیر مسعود
Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.150

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
Rs.500

لغاتِ روزمرہ
(تنقید و تحقیق)
شمس الرحمن فاروقی
Rs.250

آئینۂ حیرت
اور دوسری تحریریں
سید رفیق حسین
Rs.375

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
Rs.280

کافکا کے افسانے
(افسانے)
نیر مسعود
Rs.70

Scanned with CamScanner

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

اچھے آدمی

اُجاگر نے دونوں کیتلیوں کو تازے چولھے پر چڑھا کر سامنے، پورب کی طرف دیکھا۔ رات سے ہی برسات کا موسم شباب پر ہے۔ سورج اُگا ہے یا نہیں، پتا نہیں چلتا۔ بادل ہلکی ہلکی پُروائی کے جھونکے پر اُمڈے آرہے ہیں۔ دور پھوہیا ورشا (ہلکی بارش) میں پیڑوں کی پتیاں چھپ رہی ہیں۔ سامنے — کھلا ہوا بڑا میدان! ہریالی پر بچھی ہوئی — پکی پیچ روڈ۔ نئی سڑک۔ اُجاگر کا جی نہ جانے کیوں اچانک ہلکا ہو گیا۔ من میں رات بھر اس پسنجر کی بولی چبھتی رہی تھی — کھچ! کھچ! — ''تم تو منھ دیکھ کر چائے میں چینی ڈالتے ہو۔ اُدھر پکوڑیوں میں بھی ہاتھ کی صفائی کا کھیل ہوتا ہے۔ کسی کو ہری مرچی اور ادرک کے ٹکڑے ڈال کر گرما گرمی پکوڑی دی جاتی ہے اور کسی کو سڑے پیاز اور باسی بیسن کی۔''

ضرور وہ پسنجر جوگ بنی یا فاربس گنج سے دارو پی کر چلا ہوگا۔ ایسا منھ پھٹ پسنجر اُجاگر نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اجاگر نے پھر میدان کی طرف دیکھا۔

میدان کا داہنا حصہ پھوہیا ورشا میں ڈھک چھپ رہا ہے۔ سرکاری جنگل محکمے کے نئے بانس کے بن میں ہزاروں پتاکے (جھنڈے) اڑ رہے ہیں، مانو بانس کے نئے پودوں کی نئی 'کنچیوں' کے ہرپتاکے، کاس کے صاف غالیچے، سب ڈھک گئے۔ دو ہی سال کے بعد یہ بانس کا جنگل بیجو بن بیجو کھنڈ ہو جائے گا۔

Scanned with CamScanner

اجاگر کا گھر گاؤں کے سب سے دکھنی چھور (کنارے) پر اونچی جگہ پر ہے۔ سامنے دور تک ڈھلوان زمین ہے۔ کوسی ندی کی ماری ہوئی زمین کوسی کی سوکھی اور بالو سے بھری دھارا تک اوبڑ کھابڑ ہے۔ کٹیہار سے جوگ بنی تک پکی سڑک پچھلے سال ہی بن کر تیار ہوئی ہے، کھلی ہے۔ جب پہلی بار کاغذ والا نقشہ زمین پر ابھرا تو لگا کہ اجاگر کے گھر تک آنے کے لیے ہی سڑک ادھر آئی ہے۔ اجاگر کے گھر کو چھو کر پھر داہنی طرف مڑ گئی ہے۔

اجاگر نے دیکھا... لیٹی ہوئی دھرتی کے گلے میں چندر ہار کی طرح پڑی — پچ روڈ!

ایک کیتلی کا پانی گنگنا اٹھا۔

پھر دوسری کیتلی کا بھی۔

اجاگر کی آنکھوں میں پردیپ کمار کی مائے (ماں) کے گلے میں پڑے چندر ہار کی جھلک لگی... آج پردیپ کمار کی مائے اتنی سست کیوں ہے؟ کیتلیوں میں چائے کا پانی کھول رہا ہے۔ ابھی تک نہ بیسن کا گملا کھنکھنایا اور نہ کڑاہی کڑچھی ہی۔ آخر بات کیا ہے؟

اجاگر نے اپنے تین برس کے اکلوتے بیٹے کو پکارا، ''کیا ہو پردیپ کمار! بوا! مائے سے کہو، سادہ گاڑی کے آنے کا وقت ہو گیا۔ ادھر ہمارے 'ڈپاٹ' کا سب کام 'فنس' ہے!''

اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

اجاگر نے اپنے 'ڈپاٹ' پر نگاہ ڈالی۔ اجاگر کا شعبہ — چائے ڈپاٹ — کپ، طشتری، گلاس، چھننا، چمچ، چائے، دودھ — سب۔ سب ٹھیک ہے، لیکن آخر بات کیا ہے؟

اجاگر کا گھر اس علاقے کا 'غیر سرکاری بس پڑاؤ' ہے۔ قریب بیس پچیس گاؤں کے لوگ یہیں آ کر چڑھتے اترتے ہیں بسوں میں۔ دکھن کٹیہار سے آنے والی بس اَرریا کورٹ سے ڈیڑھ گھنٹے میں اور اُتر جوگ بنی، فاربس گنج سے چلنے والی گاڑی کو ایک سے سوا گھنٹہ تک لگ جاتا ہے۔ اسی لیے اجاگر کے گھر اور دکان کے سامنے دس پندرہ منٹ رکتی ہے۔

اس 'لائن' (سڑک) میں اجاگر کی دکان کے پکوڑوں اور چائے کا خوب نام ہو گیا ہے۔ سادہ، خاکی اور لال گاڑیوں کے ڈرائیور، کنڈکٹر، پسنجر، کلینر، سبھی تعریف کرتے ہیں۔

پردیپ کمار کی مائے آئی۔

نہائی دھوئی پردیپ کمار کی مائے کو دیکھ کر اجاگر کا ہلکا جی اور بھی گدگدا اٹھا۔ گلاس میں گرم پانی ڈالتے ہوئے وہ مسکرایا۔ پردیپ کمار کی مائے بھی تنک مسکرائی۔ مانو من کی بات کو وہ من میں اب نہیں رکھ سکا۔ بول پڑا، ''اب ریڈیو 'فٹ' کرانا ضروری ہے!''

کل تک اجاگر کی سمجھ میں دکان میں ایک دیوار گھڑی 'فٹ' کرنا ضروری تھا۔ آج اچانک ریڈیو کی بات سن کر پردیپ کمار کی مائے کو اچنبھا ہوا۔ وہ اچکچائی۔

اجاگر بولا، ''ریڈیو میں ایک ہی بات نہیں، تین تین بات ہے... من ہو تو گانا سنو، من ہو تو خبر سنو اور جاننا ہو تو 'ٹیم' بھی معلوم کر لو۔''

پردیپ کمار کی مائے نے کڑاہی چڑھا دی۔

آنگن سے آنکھیں ملتا ہوا پردیپ کمار نکلا۔ اجاگر نے پیار سے بلایا، ''اِدھر آؤ بابو... بوا!''

ہر روز پہلے تین گلاس... سب سے پہلے پردیپ کمار کو، پھر پردیپ کمار کی مائے کو، اور تب خود... پردیپ کمار دن بھر میں پانچ گلاس چائے پیتا ہے۔

بسوں میں چڑھنے والے 'کچہریا پسنجر' ایک ایک کر آنے لگے۔ بیل گاڑی پر کوئی نئی دلہن ہے کیا؟ ساون بھادوں میں نیہر (میکے) جا رہی ہے۔ یہ سائیکل والا آ کر پھر تنگ کرے گا۔ یہ سائیکل رکھنے کی ذمے واری اب اجاگر اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔ تالا لگانے پر بھی نہیں۔

پہلی بوہنی کی کشن پور کے بابو نے۔ ''چار آنے کے پکوڑے اور دو گلاس چائے۔ دودھ، چینی برابر برابر۔ گلاس ذرا بڑھیا سے دھو کر۔''

پردیپ کمار کی مائے نے گھونگھٹ کے اندر سے ہی دیکھا۔ کشن پور کے بابو کی نظر اس کی کلائی سے لے کر بانہہ تک گدی ہوئی مچھلیوں پر ہے۔ کئی جوڑی مچھلیاں! چلبلا رہی ہیں۔

پردیپ کمار کی مائے نے بانہہ کی مچھلیوں کو آنچل کھینچ کر ڈھک لیا۔ کشن پور کے بابو نے کہا، ''پکوڑے ذرا اور کھرے گرم رے...''

چھوٹے میں چھنے پکوڑوں کو پھر سے کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا پردیپ کمار کی مائے نے۔

گیلی پروائی کے جھونکے میں گرم پکوڑوں کی سوندھی سلونی سگندھ گاؤں میں دھیرے دھیرے پھیلنے لگی۔

Scanned with CamScanner

پکوڑے! چاہ! چائے! اچھا!

گاؤں کا بوڑھا سنتوکھی سنگھ روز اسی وقت آتا ہے۔۔۔ روز، 'ٹیم' بندھا ہوا ہے، یہی۔ اگر بوہنی نہیں ہوئی ہو تو بڑے صبر کے ساتھ انتظار کرتا ہے۔ بوہنی ہوئی کہ اس کی چٹکی بجی۔ ''جے سری سیتا رام!''

آج بوہنی ہونے کے بعد بھی سنتوکھی سنگھ کی طرف دھیان نہیں دیا اجاگر نے۔ سنتوکھی سنگھ ایسے موقعوں پر کوئی گپ شروع کر دیتا ہے۔ گپ یقینی طور سے کسی چوری ڈکیتی، یا 'گھر گھسّی' کی ہوگی۔ گھر گھسّی میں پکڑے گئے چور کو 'چم چور' کہتے ہیں۔

آج سنتوکھی سنگھ نے پاس کے گاؤں میں ہوئی چم چوری میں پکڑے گئے کسی چم چور کی کہانی شروع کی۔

سنتوکھی سنگھ کو اس علاقے کے سبھی نامی گرامی لوگ جانتے ہیں۔ جاتی (برادری) والوں نے مل کر بوڑھے سنتوکھی سنگھ کو برادری باہر کر دیا ہے۔ جاتی کا حقہ پانی چھوٹے، مگر سنتوکھی سنگھ اُجاگر کی دکان کی چائے اور پکوڑوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اور اب تو پکوڑے چائے کھا پی کر ہی وہ سارا دن رہتا ہے۔ نہ آگے ناتھ، نہ پیچھے پگھا۔ سنتوکھی سنگھ ریٹائرڈ دفعدار ہے۔ بہت بہت 'اس پی' اور داروغہ کے ماتحت کام کر چکا ہے وہ۔ جب کہیں کوئی نئی واردات نہیں ہوتی ہے تب سنتوکھی سنگھ کوئی پرانی کہانی یوں ہی شروع کر دیتا ہے۔

لیکن آج کی کہانی تازہ ہے، جو کل رات کو ہی ہوئی ہے۔

کشن پور کے بابو نے ہری مرچ کی کڑواہٹ پر سی سی کرتے ہوئے اس بات کی تائید کی۔

''ہاں، اس لیے رات میں اُدھر ہلا گلا ہو رہا تھا، کیوں؟۔۔۔ سی سی۔۔۔''

معاملے کو گاؤں کے پنچوں نے مل کر رفع دفع کر دیا ہے، سنتوکھی سنگھ کو یہ خبر بھی مل چکی ہے۔

مدعی بیچاری سادھو ساہ کی بیوہ، کیا کر سکتی ہے؟ پانچ پنچ کی بات سے باہر کیسے جائے بیچاری۔

پردیپ کمار کی مائے نے پکوڑے نہیں دیے۔

اجاگر نے چائے کا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا، ''سنتوکھی کاکا، پکوڑے گاڑی جانے کے بعد۔''

''سو کیوں؟'' سنتوکھی سنگھ نے نقد پیسہ دے کر کھانے والے کھرے گاہک کی طرح ٹھنکنا کر

پوچھا۔

پردیپ کمار کی مائے نے گھونگھٹ کے اندر سے ہی اجاگر کو اشارے سے کچھ کہا۔ کیلے کے پتے پر گرم پکوڑے لاکر سامنے رکھ دیے اُجاگر نے۔ اِدھر کئی دنوں سے سنتو کھی سنگھ اسی طرح تیور چڑھا کر باتیں کرنے لگا ہے۔

سنتو کھی سنگھ نے کشن پور کے بابو سے کہا، ''راسو بابو، یہ سسری سڑک جب سے چالو ہوئی ہے، چوری چکاری اور بھی بڑھ گئی ہے۔ پہلے تو سالا گاؤں کے آس پاس کے ہی چور ڈکیت چوری ڈکیتی کرتے تھے۔ اب تو منیہاری گھاٹ کا چور سالا جوگ بنی آ کر چوری کر جاتا ہے — راتوں رات — بے داغ!''

کشن پور کے بابو نے اعتراض کیا، ''اس میں سڑک کا کیا قصور؟ بنا سڑک کھلے ہی کلکتہ کے لوگ کٹیہار میں پاکٹ مارتے ہیں۔''

کشن پور کے بابو کو معلوم ہے۔ سڑک بنتے وقت علاقے میں کئی سڑک مخالف تحریکیں چلی تھیں۔ لوگوں کو ابھارنے کے لیے تحریک کے نیتاؤں نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا تھا — سڑک کھلتے ہی کلکتیا پاکٹ ماروں سے لے کر پٹنہ کے ٹھگ دن دہاڑے گاؤں میں گھس کر دندناتے پھریں گے۔

کشن پور کے بابو نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، پھر کان کے پاس لاکر سنا — بس لیٹ ہے یا گھڑی بند ہے؟

اجاگر بولا، ''دونوں طرف کی گاڑی آج لیٹ ہے۔ رات میں جوگ بنی کی طرف زور سے برکھا ہوئی ہے۔''

سنتو کھی سنگھ بولا، ''پورب میں بھی ہوئی ہے۔''

اجاگر کو چوری ڈکیتی کی کہانی ذرا بھی نہیں اچھی لگتی۔ تس پر آج چم چوری کا قصہ۔

اجاگر نے چم چوری کے موضوع کو اچھی طرح بدلنے کے لیے بات کا سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا، ''پورب پچھم، اُتر دکھن، سب طرف پانی برسا ہے۔ صرف اپنے علاقے میں ...''

سنتو کھی سنگھ نے بیچ میں ہی کاٹ دیا، ''ارے! اس علاقے میں کیا پانی برسے گا۔ سالا، دن

دہاڑے چم چوری جہاں ہوتا ہے وہاں پانی برسے گا؟ بجلی گرے گی، ہڑ ہڑیا بجلی!''

بادل سچ مچ گرجا۔ پردیپ کمار کی مائے گھونگھٹ کے نیچے ہنسی۔ ''بادل نہیں، بس کی آواز!''

پردیپ کمار کی مائے کو پچھلے سال کی برسات کی بات یاد آئی۔ برسات میں پکوڑے اور چائے کی بکری بڑھ جاتی ہے۔ چھاتا دھوتی گروی رکھ کر بھی آدمی پکوڑے کھا کر چائے پیتا ہے۔

کشن پور کے بابو نے پلاسٹک پیپر کے بڑے تھیلے سے 'واٹر پروف' نکالا۔ ملیریا محکمے کے دوا چھڑکنے والے سے بہت پیروی کے بعد یہ برساتی ملی ہے۔ جھما جھم پانی پڑے لیکن کپڑے کا ایک سوت بھی نہیں بھیگتا۔

کشن پور کے بابو نے اٹھتے اٹھتے اُجاگر کو صلاح دی، ''اِدھر چار ہاتھ اور بڑھا کر بیٹھنے کی جگہ بنا کر چھاؤں کیوں نہیں دیتے؟''

پردیپ کمار کی مائے نے بانہہ کے اوپر ساڑھی کھینچ کر اُجاگر سے کچھ کہا۔ کشن پور کے بابو کی آنکھوں میں گدی ہوئی مچھلیاں پھر سے چلبلانے لگیں۔

اجاگر نے کہا، ''راسو بابو، ایک گاڑی بانس کے بنا سب کام رکا ہوا ہے۔ آپ کے دربار میں ایک دن عرضی لے کر...''

کشن پور کے بابو نے دیکھا، گھونگھٹ سے ایک جوڑی آنکھیں بھی کچھ کہہ رہی ہیں۔ بولے، ''اچھی بات ہے، ایک دن آنا۔ ایک گاڑی کیوں، دو گاڑی بانس مل جائے گا۔''

اجاگر نے دانت نپور کر پردیپ کمار کی مائے کی طرف دیکھا۔ پردیپ کمار کی مائے نے آنکھوں سے ہی باتیں کیں، ''میں نے کہا تھا نا، راسو بابو اچھے آدمی ہیں۔''

سنتو کھی سنگھ بولا، ''ایک گاڑی گھاس کیوں نہیں مانگی تم نے؟ آج راسو بابو کا دل دریاؤ ہو گیا ہے۔''

بارش شروع ہوئی۔ دونوں طرف سے بس آئی۔ ایک ہی ساتھ!... پکوڑے، چائے، پیسے، نئے پیسے۔ اجاگر کو آج بات کرنے کی فرصت نہیں۔

''ایک پتّل پکوڑے، بنا مرچ کے۔''

پردیپ کمار کی مائے نے گھونگھٹ کے نیچے سے ہی کچھ کہا۔ وہ آج بنا مرچوں کے پکوڑے

Scanned with CamScanner

الگ سے کسی گاہک کے لیے نہیں بنا سکے گی۔

''لال گاڑی کے ڈرائیور جی مانگتے ہیں۔''

پردیپ کمار کی مائے بنا مرچ والا بیسن پھینٹنے لگی۔

لال گاڑی کا ڈرائیور اچھا آدمی ہے۔ معیاری گھاٹ میں جہاز سے اترنے والے مسافروں کو بھی وہ اجاگر کی دکان کے پکوڑوں اور چائے کی تعریف سنا کر پھانس لاتا ہے۔

''بھائی، راستے میں کہیں چائے پینا اور پیسہ پھینکنا برابر ہے۔ چائے ناشتہ چل کر رہک پور میں کیجیے گا۔ ایک بار چکھ کر دیکھیے گا تو پھر کبھی نہیں بھولیے گا۔ گرما گرم چائے اور کرمرے پکوڑے!''

لال گاڑی کا ڈرائیور ایسی جگہ گاڑی لگاتا ہے جہاں سے پردیپ کمار کی مائے کی آنکھیں ترچھی نگاہ سے دیکھنے پر ٹکرا جاتی ہیں۔

گاڑی میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی نظر دکان کے سامنے والے حصے پر ہی پڑتی ہے۔ جدھر پردیپ کمار کی مائے بیٹھتی ہے اُدھر بانس کی تیلیوں کی ٹٹی لگی ہوئی ہے— چھوٹی سی، آڑ میں بیٹھی ہوئی پردیپ کمار کی مائے کا صرف ہاتھ دکھائی پڑتا ہے۔ پکوڑے ڈالتی ہوئی انگلیاں۔ چھنوٹے سے پکوڑے نکال کر برتن میں رکھتے وقت کانچ کی چوڑیاں میٹھے سُر میں بج اٹھتی ہیں۔

اُجاگر کو اِدھر اُدھر دیکھنے کی چھٹی کہاں!

گلاس، چینی، پانی، پتی، چمچ، پیسہ، گاہک۔

پکوڑوں کا پتّل لیتے وقت ایک بار وہ پردیپ کمار کی مائے کی طرف ضرور دیکھ لیتا ہے۔

''دیکھیے بھائی، ہلّا گلّا نہیں، شانتی سے —شانتی سے!''

دونوں گاڑیاں آ کر چلی گئیں۔

پردیپ کمار کی مائے اٹھ کر اندر گئی۔ اُجاگر ریزگاریوں کا حساب کرنے لگا۔

سنتو کھی سنگھ کو ایک گلاس چائے اور چاہیے۔ زوروں کی بارش شروع ہوئی۔ اجاگر نے کہا، ''پانی گرم ہونے دیجیے۔''

اجاگر نے لڑکپن سے ہی چائے بنانے کا کام کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

کمل دہ کے زمیندار کی ڈیوڑھی میں ہر کام کے لیے الگ الگ نوکر چاکر تھے — چائے بنانے والا، چلم سلگانے والا، تیل مالش کرنے والا، بھنگ گھوٹنے والا۔

کمل دہ کے زمیندار کی زمینداری چلی گئی۔ لیکن اجاگر کے ہاتھ کا 'علم' ہاتھ میں ہی رہ گیا۔

اس 'علم' نے اس کے من کی کامنا پوری کی۔ گھر میں لکشمی آئی...!

ربک پور گاؤں کی اپنی آبائی زمین پر گھر بنا کر ایک 'روپ والی' گھرنی لانے کی خواہش اس کے دل میں بچپن سے ہی گھر بنا کر بیٹھی تھی۔ کمل دہ کے چھوٹے بابو کی دلہن جیسی گھر والی مل جائے تو اجاگر ساری عمر صرف روپ پی کر رہ سکتا ہے۔

روپ والی دلہن!

بالو والی زمین کا کوپ (کنواں) اور گاؤں کی لڑکی کا روپ — دونوں برابر۔ بالو والی زمین کے کنوئیں کا پانی کنچن ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ایک گھونٹ پی کر ہی آتما میں تراوٹ آجائے۔ گاؤں کی لڑکی کا روپ ایک بار نہار کر نیند آجاتی ہے آنکھوں میں۔ لیکن بالو والا کنواں دو سال میں بیٹھ جاتا ہے۔ گاؤں کا روپ سال لوٹتے ہی ڈھل جاتا ہے۔

اجاگر نے بھاگلپور، دربھنگہ اور پٹنہ جیسے شہروں میں گھوم گھوم کر نوکری کی۔ کہیں روپ کی جھلک ہی نہیں ملی۔ سب نقلی — کچی کلی کچنار جیسی اوپر سے... اس کو بھلا روپ کہتے ہیں؟

شہر سے وہ روپے کی گٹھری لے آیا۔ من کی جھولی اس کی خالی ہی رہی۔

گاؤں کے گھٹک دلالوں نے اجاگر کو ٹھگ کر بہت پیسہ کھایا۔ برادری کے پنچوں نے پان سپاری کے نام پر پچاسوں روپے جھٹک لیے — 'روپ والی' گھرنی نہیں ملی۔

لیکن اجاگر مایوس نہیں ہوا۔ کمل دہ کی چھوٹی دلہن نے ایک دن کہا تھا: ''اجاگر، چائے پلا کر تم اندراسن کی پری کو بھی پھسلا کر مٹھی میں کر سکتے ہو!''

اجاگر نے چھوٹی دلہن کی بات یاد کی اور ایک دن گھر سے نکل پڑا — کہیں چائے کی دکان پر نوکری بھی مل جائے، وہ کرنے کو تیار ہے۔

اجاگر اس (شبھ) دن کو کیسے بھول سکتا ہے بھلا۔

گرسیلا اسٹیشن پر اتر کر وہ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

Scanned with CamScanner

کھیرا خرید کر کھاتے وقت اس کو بچپن کے ایک کھیل کی یاد آئی تھی۔ بچے کھیرے ککڑی کے بیج کو انگلیوں میں دبا کر کہتے: ''فلاں کی شادی کدھر ہوگی؟'' بیج چھٹک کر جس طرف گرے۔ اُدھر ہی، اُسی دِشا میں۔

اجاگر نے کھیرے کے ایک بیج کو انگلیوں میں دبا کر من ہی من میں کہا تھا، ''بیج جس طرف چھٹکے گا، میری ہونے والی خوبصورت دلہن اُدھر ہی ہوگی۔''

بیج اُتر کی طرف چھٹکا اور بنا کچھ سوچے بچارے وہ کرسیلا سے رانی گنج جانے والی بس پر جا بیٹھا تھا۔

کنڈکٹر نے پوچھا، ''کہاں جائے گا؟''

اجاگر کیا جواب دے؟ نہ جانے یہ گاڑی کہاں کہاں جاتی ہے! تب تک بغل کے مسافر نے برولی کا ٹکٹ مانگا اور اجاگر نے بھی برولی تک کا ٹکٹ کٹا لیا۔

گاڑی برولی پہنچ کر پکوڑوں والی سہوائن کی دکان کے سامنے رکی۔ برولی میں اترنے والے اتر گئے۔ اجاگر بیٹھا رہا۔ برولی گاؤں میں اتر کر وہ کیا کرے گا؟ وہ آنکھیں موند کر کچھ سوچ رہا تھا کہ کنڈکٹر نے اسے ٹھیل کر جگایا، ''اے، برولی آ گیا، اترو۔''

اجاگر نے اپنی جھولی سنبھالی اور نہ چاہتے ہوئے اترا۔

بس سے اترنے والے لوگ پکوڑے والی کی دکان پر تھوڑی دیر رکے اور جل پان کر کے چلے گئے۔ اجاگر چپ چاپ بغل میں ایک موڑھے پر بیٹھا رہا۔ بوڑھی سہوائن نے پکوڑوں کی کڑاہی اتار کر اجاگر سے پوچھا، ''کہاں جانا ہے؟''

اجاگر نے گھُمنا کر جواب دیا، ''کہیں نہیں۔ ایک آنے کے پکوڑے ہم کو بھی چاہییں۔''

بوڑھی جھنجھلائی، ''اتنی دیر سے منہ سی کر بیٹھے رہے۔ اب کڑاہی اتارنے کے بعد ایک آنے کے پکوڑے! اب پکوڑے نہیں، اگر بینگنی پکوڑے کھانے ہیں تو بولو، چڑھاؤں کڑاہی؟ ... اری او سیتیا! کب تک بیٹھ کر بینگن کاٹے گی؟ اے، دے جا جلتا ہوا ہے۔ گاہک بیٹھا ہوا ہے یہاں۔''

جھونپڑے کے اندر سے اسی انداز سے پتلی آواز میں جواب آیا: ''کل سے میں کانا کیڑا بینگن نہیں کاٹوں گی۔ ایک ایک بینگن میں پانچ پانچ پلّو (کیڑے)!''

بوڑھی نے سیتیا نام کی لڑکی کو بینگن لگا کر ایک بھدی سی گالی دی۔

سیتیا سوپ میں بینگن کے ٹکڑے لے کر آئی۔ ''میں روز تم سے کہتی ہوں موسی، پردیسی یاتری کے سامنے گالی مت بکا کرو۔''

اجاگر سیتا عرف سیتیا کا روپ دیکھ کر پسینے سے تر بتر ہو گیا تھا۔ ایک ایک بینگن میں پانچ پانچ پلّو اور بینگن بھری گالی سن کر اس کو متلی آ رہی تھی، سو سیتا کو دیکھنے کے بعد ہی دور ہو گئی۔۔۔ یہی ہے روپ! یہی ہے روپ!

اس نے گلا صاف کیا۔ ''ماتا رام! ایک آنے کی بینگنی نہیں، چار آنے کی۔''

بوڑھی بولی، ''اوں! ای آدمی کا من رہ رہ کر بدلتا ہے۔ جو بولنا ہو، ایک ہی بار کیوں نہیں بولتے؟''

اجاگر خاموش رہا۔ لیکن گاہک کی طرفداری کرتے ہوئے سیتا بولی، ''ایک بار بولے چاہے ہزار بار— تو اس طرح گاہک سے بات بات پر رگڑ کرے گی تو ایک پائی کی بینگنی بھی نہیں بکے گی۔''

بوڑھی کڑاہی میں بینگنی ڈالتی ہوئی بولی، ''بڑی آئی ہے 'بھتار' (شوہر) کی طرفداری کرنے والی!''

جب بوڑھی اور جوان زبانوں کی 'بت گئی' (لفظی جنگ) زور پکڑنے لگی تو اجاگر نے مردانگی دکھلائی۔ ''چھی چھی، آپ لوگ اس طرح بے وجہ لڑیے گا تو رکھیے اپنی بینگنی! ایسی بینگنی کون کھائے؟''

سیتا بولی، ''لو، سنتی ہو؟ اب چھانو بیٹھ کر چار آنے کی بینگنی۔ دیکھوں کون کھاتا ہے؟''

بوڑھی بولی، ''نہیں کھائے گا تو پیسہ دے جائے گا۔''

سیتا نے اجاگر کو پہلی بار نظر اٹھا کر دیکھا اور منھ کی بات منھ میں ہی رکھ کر اندر چلی گئی۔

اجاگر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ چار آنے کی بینگنی وہ کھا سکے گا؟ یہ چنگیری بھر بینگنی؟

بوڑھی سہوائن نے پھر پکارا، ''اری او سیتیا! پتّل کہاں ہے؟ بینگنی تیرے سر پر پروسوں؟''

اجاگر بینگنی کھانے لگا۔ تب بوڑھی نے نرم لہجے میں کہا، ''بھیا، برا مت ماننا۔ منھ جلی سیتیا سیدھی بات کبھی سنتی ہی نہیں۔ ٹھہرو، میں پانی لا دوں۔''

بوڑھی کے اٹھنے سے پہلے ہی سیتیا پانی دے گئی۔ ''میں جانتی ہوں، اب گاڑی آنے کا وقت

Scanned with CamScanner

ہوا تو ٹو کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر چولھے کے پاس سے اٹھے گی ہی۔ کڑاہی اٹھا کر سڑک پر پھینک دوں گی، ہاں۔''

بوڑھی پھر بیٹھ گئی۔ وہ کوئی بھدی گالی زبان پر چڑھا رہی تھی کہ اجاگر نے ٹوک دیا، ''یہاں ایک چائے کی دکان خوب چلے گی، ماتا رام۔''

سہوائن نے پوپلے منھ کو کچھ پھیلا کر پوچھا، ''کیا چلے گی خوب؟''

''چائے کی دکان۔''

''کون کھولے گا؟''

''کوئی بھی کھولے، چلے گی خوب۔''

بوڑھی اب کُڑھ کر بولی، ''آگ لگے چائے کی دکان میں۔ ایک پکوڑے کے چولھے میں ہی میری ہڈی جل کر راکھ ہو رہی ہے۔'' سیتا نے اس بار پھر اجاگر کو دیکھا۔ چائے کی دکان کی بات سن کر ہی اس نے ایسی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اجاگر بولا، ''چائے میں آٹھ گنا منافع ہے۔ چار آنے کے مال میں دو روپے منافع!''

''دو روپے!'' بوڑھی موسی اور جوان سیتا نے ایک ہی ساتھ حیرت بھرے لہجے میں کہا، ''دو روپے!''

بوڑھی کچھ لمحے چپ رہنے کے بعد بولی، ''رہنے دو بابا منافع۔ یہاں چائے کون پیے گا؟''

سیتا نے کہا، ''ملنے پر سبھی پیے گا۔''

اجاگر بولا، ''واجب بات۔''

بوڑھی نے چھنوٹا چمکا کر پوچھا، ''میں پوچھتی ہوں چائے بنائے گا کون، تیرا بھتار (میاں) ایں؟''

سیتا نے اس بار پلٹ کر گالی دی، ''میرا نہیں، تیرا!''

حیرت! گالی سن کر پوپلی بوڑھی ہنس پڑی۔ سیتا بھی ہنسی اور اجاگر کا کلیجہ زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر تک چپ رہنے کے بعد اس نے تول کر بات شروع کی، ''ہاں، چائے کی دکان تو مرد ہی چلا سکتا ہے۔''

Scanned with CamScanner

بوڑھی نے لمبی سانس لی۔ سیتا پھر آنگن کے اندر چلی گئی۔ اجاگر بہت دیر تک بوڑھی موسی کو تفصیل سے چائے کی دکان کے منصوبے کے بارے میں سمجھاتا رہا۔

دوسری گاڑی کے لوٹنے سے پہلے ہی اجاگر نے بوڑھی کو اپنی میٹھی بولی سے موہ لیا۔''ماتا رام! آپ لوگوں کی مرضی ہو تو میں آج ہی جا کر سامان لے آؤں۔''

''تمھارا گھر کہاں ہے؟''

''ربک پور۔''

''کون جات؟...ارے، تب تو برادری کے ہی نکلے۔''

بات پکی ہوگئی۔

اجاگر کرسیلا بازار آیا اور چائے کی دکان کا سارا سامان خرید کر رات کی گاڑی سے ہی واپس لوٹا۔ بوڑھی نے کہا،''ارے تم سچ مچ لوٹ آئے! میں تو سمجھ رہی تھی کہ کوئی لچا لفنگا آ کر بے پر کی ہانک کر چلا گیا۔''

اندر سے سیتا نے جھڑکی دی،''موسی، تو بوڑھی ہوئی لیکن آدمی کو پہچاننا نہیں آیا۔''

چائے کا سامان دیکھ کر بوڑھی اور جوان آنکھیں حیرت سے بڑی ہوگئیں۔''اتنا سامان لگتا ہے چائے کی دکان میں؟''

رات میں سیتا نے اپنے ہاتھ سے بھات دال پروس کر کھلایا تھا— پہلی بار۔

پرانی باتیں یاد کر کے آج بھی اجاگر کا جی جھوم اٹھتا ہے۔ سیتا کی بولی، سیتا کی ہنسی، سیتا کا چلنا پھرنا۔ دن رات اجاگر مانو سپنوں کی دنیا میں ہی رہتا تھا— روپ پی کر جیتا تھا۔

چائے کی دکان کھلی اور چل نکلی۔

پورے گاؤں میں بات پھیل گئی۔''بوڑھی سہوائن کا ایک رشتے دار آیا ہے۔ چائے کی دکان کھولی ہے۔ اب پیو گھر بیٹھے— چائے گرما گرم!

بس کے ڈرائیور، کنڈکٹر، پسنجر، کلینر نے ایک زبان ہو کر تعریف کی،''کیا بہترین چائے بناتا ہے جوان! چلے گی دکان۔''

لیکن چائے کی دکان چھ مہینے بھی نہیں چل سکی۔ پانچویں مہینے میں ہی سیتا نے اجاگر کو اکسایا۔

Scanned with CamScanner

''کیوں؟ تمھارا کلیجہ اتنا چھوٹا ہے؟ بوڑھی سے صاف صاف کہتے کیوں نہیں؟''

''اگر بوڑھی انکار کردے؟''

''بلا سے! پہلے کہہ کے دیکھو۔''

''اگر کہے، گھر جمائی رہنا پڑے گا؟''

''ابھی مان لینا۔ بعد میں پھر...''

بوڑھی موسی آنکھ سے کم دیکھتی تھی اور کان سے ذرا کم سنتی تھی۔ لیکن بنا کچھ دیکھے سنے ہی وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ اس لیے جس دن اجاگر نے ہکلا تتلا کر اپنی بات رکھی، بوڑھی نے ایک بھدی گالی دی تھی، ''سو بار ستوَن اور بھتار کے آگے دتوَن! اب باقی ہی کیا رہا ہے۔ جوٹھے برتن میں اب کون پنڈت پروہت وید منتر پڑھے گا؟ خوب پیو گرما گرم چائے!''

بوڑھی سہوائن اپنی پکوڑوں کی دکان پر بیٹھی آج بھی گالیاں دے رہی ہوگی، ''اس ماٹی ملے نے آتے ہی چائے پلا کر اس موئی کو مٹھی میں کرلیا... دن رات کھسر پھسر میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جواب دے دیا: تم لوگ اپنا راستہ دیکھو۔''

اور اسی کو کہتے ہیں: تریا کے بھاگ سے ملے راج!

سیتا نہیں، لکشمی!

رانی گنج سے کُرسیلا جانے والی بس پر سوار ہو کر، روپ والی دلہن کو ساتھ لے کر اجاگر گاؤں لوٹ آیا۔ لوٹ کر اس نے سنا، ''اِدھر بھی نئی سڑک کھلنے والی ہے۔ بہت جلدی ہی!''

سچ مچ لکشمی ہے پردیپ کمار کی مائے!

بننے والی نئی سڑک کے ٹھیکیدار نے اجاگر کی جھونپڑی میں ہی ڈیرا ڈالا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے گھما پھرا کر اجاگر کو سمجھایا، ''گھر میں جوان اور خوبصورت بہو، اور باہر چھپر کے نیچے پردیسی کا رہنا، اچھی بات نہیں۔''

سنتوکھی سنگھ جب ملتا، دن دہاڑے چم چوری کی کوئی کہانی سنانا نہیں بھولتا۔ اجاگر گھر لوٹ کر اپنی روپ وتی کو تکتے ہوئے کہتا، ''جانتی ہو، گاؤں کے لوگ کیا کہتے ہیں؟''

Scanned with CamScanner

''گاؤں کے لوگوں کی بات سنو گے یا ٹھیکیدار جی کی؟ ٹھیکیدار جی کہتے ہیں، سڑک جب کھلے گی، چائے اور پکوڑوں کی دکان تب کھولنا۔ ابھی اتنے مزدور کام کر رہے ہیں، ابھی چاول دال کی دکان کھول دو۔ مزدوروں کو ادھار کھلاؤ اور ہفتے کے بعد ایک کا ڈیڑھ وصولو۔ یہی موقع ہے۔''

''سچ؟ اور اگر ادھار کھا کر بھاگ جائیں سبھی، تب؟''

''بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ ان کی چٹیا تو ٹھیکیدار جی کے ہاتھ میں ہے۔''

''سچ؟ تم ٹھیک کہتی ہو برولی والی۔ ٹھیکیدار صاحب سچ مچ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

''اے! تم مجھے برولی والی کیوں کہتے ہو؟ مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''تب کیا کہوں؟'' اجاگر کھلکھلا کر ہنستا۔ ''اوہ، اب میں بھی ٹھیکیدار صاحب کا دیا ہوا نام ہی لوں گا، ریشم بہو۔ ٹھیکیدار صاحب سچ مچ بہت اچھے آدمی ہیں۔''

گاؤں کے آوارہ نوجوانوں نے اجاگر کو چڑانے کے لیے ایک بولی نکالی: ''ٹھیکیدار صاحب سچ مچ اچھے آدمی ہیں۔''

اچھے آدمی کو اچھا آدمی نہیں کہیں تو کیا کہیں؟ گاؤں کے لوگ جلتے ہیں۔ اجاگر کی بیوی روپ وتی ہے، اچھے لچھنوں والی ہے۔ ہے کسی کی بیوی ایسی گاؤں میں جس کے آتے ہی گاؤں اور علاقے میں نئی سڑک کھل گئی؟

چاول دال کی چھوٹی سی دکان کھول کر پانچ ہی مہینے میں دس بیگھے زمین کس نے خریدی ہے؟ لوگ تو جلیں گے ہی! ٹھیکیدار صاحب انگریزی میں چٹھی لکھتے ہیں۔ ہے کوئی انگریزیا اس گاؤں میں؟ ریشم بہو ٹھیک ہی کہتی ہے — کام ایسا کرو کہ 'دیکھ پڑوسی جل مرے'۔

بوا کا جنم ہوا تو ٹھیکیدار صاحب نے چمڑے کی تھیلی سے پچیس روپے نکال کر منھ دکھائی دی تھی۔ چھٹی کی رات میں خوشی کے مارے رات بھر بیٹھ کر رامائن پڑھتے رہے۔ اور یہ پردیپ کمار نام بھی انھی کا رکھا ہوا ہے۔ گاؤں کے ڈکھموچن پنڈت نے تو بس 'پتاسو' نام رکھ دیا تھا۔ بھلا پتاسو بھی کوئی نام ہے!

پتا نہیں ٹھیکیدار صاحب آج کل کس علاقے میں ہیں۔ کہیں بھی رہیں، آدمی اچھے ہیں۔ پردیپ کمار کی مائے آج بھی ہر مہینے یاد کرتی ہے۔ بولے تھے کہ بیچ بیچ میں آ کر پردیپ کمار کو دیکھ

Scanned with CamScanner

جائیں گے۔

اُس دن چھنتو کا رم ڈولوا بیٹا کہہ رہا تھا کہ پردیپ کمار کا منہ ٹھیکیدار صاحب جیسا ہے۔ پگلا ہے سالا!

لال گاڑی کے ڈرائیور جی بھی بہت بھلے آدمی ہیں۔ روز کہتے، ''دیکھو اجاگر بھائی، چولھے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے پردیپ کمار کی مائے کا رنگ بادامی ہو گیا ہے۔ بدن میں خوشبودار پوڈر لگانے سے رنگ ٹھیک رہے گا۔'' اور دوسرے ہی دن ایک ڈبہ پوڈر خریدتے آئے پورنیا کی ساہا کمپنی سے۔ ایسا بھلا آدمی اس گاؤں میں کیا، اس علاقے میں بھی کھوجنے پر ملے گا؟

یہ نئے داروغہ صاحب بھی ہیرا آدمی ہیں۔ کہہ رہے تھے، ''اس پی صاحب تمھارے پکوڑوں کی خوب تعریف کرتے ہیں۔''

اور جوگ بنی کے لالہ کے بیٹے کی زبان تو پکوڑے کے نام سے ہی 'پنیا' جاتی ہے۔ بارہ بجے رات میں گاڑی پر داروغہ صاحب کے ساتھ آتا ہے اور چوری چوری پکوڑے کھاتا ہے۔ ویشنو لالہ، جس کے چوکے میں پیاز نہیں چڑھتا ہے کبھی، وہ اجاگر کی دکان میں بیٹھ کر کیسے کھا سکتا ہے پیاز والے پکوڑے؟ پردیپ کمار کی مائے کہتی ہے، ''لالہ کا بیٹا ایک دم گائے جیسا سیدھا ہے۔ ذرا دبلا پتلا ہے، اس لیے پکوڑوں کے ساتھ چائے نہیں، انگریزی دارو پیتا ہے۔'' اُس رات کو پردیپ کمار کی مائے کے بدن میں درد تھا شام سے ہی۔ داروغہ صاحب نے کہا، ''ایک گلاس لے آؤ! ایک گھونٹ پیتے ہی سب درد چھومنتر ہو جائے گا۔ سچ مچ!'' ہوا بھی وہی۔ شام سے ہی کراہتی ہوئی پردیپ کمار کی مائے مُنھنا کر اٹھ بیٹھی اور لالہ کے بیٹے سے منھا منھی گپ کرنے لگی۔ لکشمی ہے پردیپ کمار کی مائے!

تین بجے والی گاڑی آرہی ہے۔

''کہاں ہو بوا! مائے سے کہو کہ تین بجی گاڑی آرہی ہے۔ میرے ڈپاٹ کا سب کام ریٹ ہے۔''

''بوا! پردیپ کمار! مائے کہاں؟''

پردیپ کمار صبح کی میٹھی نیند میں سویا ہوا تھا۔ اجاگر چپ چاپ بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ آج اتنا

Scanned with CamScanner

سویرے ہی پردیپ کمار کی مائے اٹھ کر کہاں گئی ہے؟ طبیعت خراب ہے کیا؟ نہیں، لال گاڑی کے ڈرائیور جی ٹھیک ہی کہتے ہیں — جان ہے تو جہان ہے۔ پردیپ کمار کی مائے دن بھر چولھے کے پاس بیٹھی رہتی ہے، یہ ٹھیک نہیں۔ پکوڑے بنانے کے لیے سگنی کی مائے کو مزدوری دے کر رکھنا ہوگا۔

اجاگر بیٹھا رہا۔ جب صبح کا تارا ڈوب گیا اور اجالا ہوا اور پردیپ کمار کی مائے کوٹھری میں نہیں آئی تو وہ باہر نکلا۔ باہر برتن باسن سب بکھرے پڑے ہیں۔ دونوں لوٹے بھی ہیں۔ تب کہاں گئی؟

اجاگر نے کوٹھری میں آکر دیکھا — پیٹی کھلی پڑی ہوئی ہے — ریشمی ساڑھی اور ریشمی بلاؤز کیا ہوا؟ لگا، دھرتی اچانک گھومنے لگی۔ اس نے چلّا کر اپنے بیٹے کو جگایا، ''بیٹا! بوا! پردیپ کمار — مائے کہاں؟''

پردیپ کمار اٹھ کر زور زور سے رونے لگا، ''میّا کہاں! آں، آں!''

پردیپ کمار کو چپ کرانے کے لیے اجاگر نے اپنے کو سنبھالا۔ پھر بولا، ''بیٹا، مائے گنگا تیر کا میلہ گئی ہے۔ دوپہر کی بارہ بجی گاڑی سے آوے گی۔''

اس نے اپنے من کو بھی سمجھایا: کہاں جائے گی؟ کہیں کام سے ہی گئی ہوگی۔

صبح کی گاڑیوں کے آنے کا وقت ہوا۔ سنتوکھی سنگھ ٹھیک وقت پر ہی آیا۔ اس نے آتے ہی ٹوکا، ''آج پکوڑوں کا چولھا نہیں سلگا ہے؟''

اجاگر نے جواب دیا، ''پردیپ کمار کی مائے کی موسی کا پیغام آیا کہ وہ لب جان ہے۔ اس لیے رات کی گاڑی سے ہی چلی گئی۔''

پردیپ کمار نے کہا، ''میّا گنگا تیر کا میلہ گئی ہے۔''

سنتوکھی سنگھ نے پرانے دفعدار کی طرح جرح کرتے ہوئے پوچھا، ''رات میں تو سادہ گاڑی لوٹی نہیں۔ پھر کس گاڑی سے گئی؟''

اجاگر نے آج بنا بوہنی ہوئے ہی سنتوکھی سنگھ کو چائے کا بڑا گلاس دیا۔ سنتوکھی سنگھ نے چائے پیتے ہوئے کہا، ''زمانہ بہت خراب ہے۔ زنانہ ذات اکیلی باہر جائے...''

دونوں طرف سے گاڑیاں آئیں۔ اجاگر نے لال گاڑی کی طرف دیکھا... نیا ڈرائیور؟ لال گاڑی کے ڈرائیور جی کہاں گئے؟ چھٹی پر؟ کتنے دن کی چھٹی؟ آج پکوڑے نہیں، صرف چائے ملے

Scanned with CamScanner

گی بھیا!

دوپہر کے بعد اجاگر نے دکان بند کردی۔

اس کا دل اندر ہی اندر ٹوٹنے لگتا۔ تب وہ زور زور سے رونا چاہتا۔ لیکن پردیپ کمار کا منھ دیکھ کر وہ اپنے آپ کو سنبھال لیتا۔ وہی رونے لگے گا تو بچے کی کیا حالت ہوگی۔

''بپا! بارہ بجی گاڑی آرہی ہے۔''

پردیپ کمار کی مائے نہیں آئی۔ ''بیٹا، ابھی نہیں آئی تو تین بجی گاڑی سے آوے گی۔''

''بپا! تین بجی گاڑی آرہی ہے۔''

''نہیں آئی!''

اس بار باپ بیٹا مل کر آنگن میں رونے لگے۔ جب پردیپ کمار ہچکیاں لیتے ہوئے دانت پر دانت بٹھا کر گھگھیانے لگا، تب اجاگر کو ہوش ہوا۔ اس نے آنسو پونچھ کر کہا، ''رات کی گاڑی سے ضرور آوے گی۔ تمھارے لیے بسکٹ لاوے گی... کھلونے!''

پردیپ کمار کی مائے رات کی گاڑی سے ہی آئی۔

''آ گئی میا! میا آ گئی!''

پردیپ کمار زور زور سے رونے لگا۔ اجاگر بھی رونے لگا۔ ''کہاں چلی گئی تھیں تم پردیپ کمار کی مائے؟''

''لو، لو، کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو؟''

''کہاں گئی تھیں؟ کس گاڑی سے گئیں؟''

''کام سے گئی تھی، پورنیا۔ گاڑی سے نہیں، ٹرک سے گئی تھی۔''

''کہہ کر جاتیں۔''

''کام کے پہلے بات کہی نہیں جاتی۔''

پردیپ کمار کھلونا پا کر خوش ہو گیا۔ اس کی ماں نے گٹھری سے بسکٹ کا ڈبہ نکالا۔ اجاگر چپ چاپ، بنا پلک جھپکے دیکھتا رہا— کتنے دنوں کے بعد پردیپ کمار کی مائے نے ریشمی ساڑھی پہنی ہے۔

... روپ ذرا بھی کم نہیں ہوا ہے۔ کون کہتا ہے کہ گاؤں کا روپ سال لوٹتے ہی ڈھل جاتا ہے!

Scanned with CamScanner

اب پردیپ کمار کی مائے نے آنچل کی کھونٹ سے کاغذ کا ٹکڑا نکال کر دکھلاتے ہوئے کہا، ''بولو تو، کیا ہے؟'' اجاگر نے لالٹین کی روشنی میں کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھا'' بھگوان جانے کیا ہے! بولو نا، کیا ہے؟ دیکھنے میں تو سرکاری کاغذ جیسا لگتا ہے۔''

پردیپ کمار کی مائے ہنسی۔'' ٹھیک ہی پہچانا ہے تم نے! سرکاری کاغذ ہی ہے... پرمٹ!''

''پرمٹ؟ کس چیز کی پرمٹ؟''

''سیمنٹ، کوئلہ اور لوہے کے سریوں کی۔''

''کیا کرو گی پرمٹ؟''

پردیپ کمار کی مائے بول اٹھی؛'' گاؤں کے دشمنوں کو ذرا اور بھی اچھی طرح جلاؤں گی۔''

''جلائے گی! معنی؟ او ہو، سمجھا۔ پکا گھر، ایں؟ سچ کہتا ہوں، پردیپ کمار کی مائے، تم دھنیہ ہو! اچھا کیا تم نے جو مجھ سے پہلے ہی نہیں کہا، اتنی بڑی بات میرے پیٹ میں ہرگز نہیں پچتی۔ سچ کہتا ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ سچ، تم لکشمی ہو!''

''میں نے کیا کیا؟ سب لال گاڑی کے ڈرائیور جی کی مہربانی ہے۔ حاکم کے کلرک سے ان کی دوستی ہے... اور جانتے ہو — اسی پرمٹ سے گھر بنانے کا آدھا روپیہ بھی نکلے گا۔''

''سو کیسے؟''

''دیکھنا، آنے دو لالہ جی کے بیٹے کو۔''

''سچ؟ حد ہے! حد ہے! کل سالے سنتو کھی سنگھ کو پانچ گلاس چائے بوہنی کے پہلے ہی پلاؤں گا... اب تم کو کیا کہیں پردیپ کمار کی مائے؟''

''ریشم بہو!''

''ہی ہی ہی ہی!''

اجاگر کے گھر کی نیو پڑ گئی۔ ایک بانس میں پرانا جھاڑ باندھ کر گاڑ دیا گیا — بری نظر کو کاٹنے کے لیے۔ گاؤں کے لوگ اندر ہی اندر جل بھن کر خاک ہونے لگے۔

لیکن ادھر کئی دنوں سے اجاگر کا من بھی اندر ہی اندر سلگ رہا ہے۔ نہ جانے کیوں۔ پرمٹ کا

Scanned with CamScanner

کاغذ لالہ جی کے بیٹے کو دے کر اینٹ، سیمنٹ، لوہا لیا گیا۔ ٹھیک ہے۔ لالہ جی کے بیٹے نے پرمٹ لیتے وقت پردیپ کمار کی ماں کی انگلیاں دبا دی تھیں۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ داروغہ جی نے اُس دن دارو کی جھونک میں کبوتری کہہ دیا۔ سرکاری آدمی کا سات خون معاف ہے۔ لال گاڑی کے ڈرائیور جی نے ہولی کے دن گال پر عبیر لگا دیا۔ ہولی کی بات! پھر ڈرائیور جی بھلے آدمی ہیں۔ لیکن...

کیتلی کا کھولتا پانی ٹونٹی سے گرنے لگا۔ پردیپ کمار کی مائے نے کہا، ''لو، لو، تمھارا دھیان کہاں ہے؟ ہوش میں ہو یا...؟''

اجاگر بولا، ''خوب ہوش میں ہوں۔''

اس نے کیتلی اتار دی۔ مکان بنانے والا یہ چھچھوندر جیسے منھ والا راج مستری بنا کہے سنے آنگن کے اندر کیوں گیا؟ جانے کے پہلے پردیپ کمار کی مائے کو اس طرح آنکھ کی ملکی کیوں مار گیا؟ پردیپ کمار کی مائے اس طرح ہنسی کیوں؟ اٹھ کر آنگن میں گئی کیوں؟

اجاگر کا من دھویں سے بھر گیا مانو۔

اس نے پکارا، ''بوا! بیٹا پردیپ کمار!''

پردیپ کمار آیا۔ اس کا منھ بھی تمتمایا ہوا ہے۔ اجاگر نے دھیرے سے پوچھا، ''بوا، مائے کہاں ہے؟ کیا کر رہی ہے؟'' پردیپ کمار بولا، ''بپا، مستری بڑا بدمعاش ہے۔ ہم کو پتا سو کہتا ہے۔''

اجاگر غصے سے دہک اٹھا۔ اس چھچھوندر مونہے کی اتنی ہمت! میرے بیٹے کو، پردیپ کمار کو پتاسو کہے گا؟

وہ اٹھ کر دہلیز کے پاس گیا۔ آنگن میں گھُس گھُس کر کے کیا پرائیویٹ بات ہو رہی ہے؟ آمنے سامنے بیٹھ کر؟ مستری سالا اس طرح جانگھ کے کپڑے ہٹا کر کیوں بیٹھا ہے؟

اجاگر کے سر پر جیسے انگیٹھی جلنے لگی۔ وہ آنگن میں جا کر گرجا، ''مستری، دیوار کی گھائی یہاں ہو رہی ہے کیا؟''

مستری شرمندہ سا ہو کر اٹھا۔ ہنستی ہوئی پردیپ کمار کی مائے بھی چونک پڑی۔ اجاگر نے دھڑام سے دہلیز کا دروازہ بند کر دیا۔

Scanned with CamScanner

پردیپ کمار کی مائے اجاگر کی آنکھیں دیکھ کر ڈر گئی۔ اجاگر ہونٹ کو دانتوں سے بھینچتا ہوا اس کے پاس گیا۔ پھر دھیرے سے بولا، ''تو کتی ہے! کتی! کتیا!''

پردیپ کمار کی مائے نے آواز اونچی کر کے کہا، ''کیا ہو گیا ہے تم کو؟''

اجاگر چپ چاپ اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ اندر سے ہی اس نے پکارا، ''بیٹا! پردیپ کمار! یہاں آؤ۔''

پردیپ کمار اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ باہر دکان میں چولھے سلگتے رہے۔

گاڑیاں آئیں۔ ڈرائیوروں نے ہارن بجا بجا کر پکارا۔ سنتو کھی سنگھ نے آواز دی۔ آنگن سے کوئی جواب نہیں ملا۔ کسی نے کہا، ''بھائی، اب پکا مکان بنوا رہا ہے۔ دکان پر کیوں بیٹھے گا؟''

گاڑیاں آتیں، رکتیں، ہارن دیتیں، پھر چلی جاتیں۔

دن بھر اجاگر گھر سے نہیں نکلا۔ پردیپ کمار بھی دم سادھ کر باپ کی بغل میں پڑا رہا۔ پردیپ کمار کی مائے اوسارے (برآمدے) پر بیٹھی دھیرے دھیرے روتی رہی۔

سانجھ ہوئی۔ اجاگر اٹھا اور پردیپ کمار کی مائے کے پاس جا کر بولا، ''اس چھچھوندر مونہے مستری کے ساتھ جاتی کیوں نہیں حرامزادی؟ نکل جا میرے آنگن سے۔''

پردیپ کمار کی مائے بولی، ''اتنی تیزی ہے تو کل سے تم ہی دیکھا کرو مزدوروں کو! پکا گھر بنوانا کھیل...''

''جہنم میں جائے سالی تیرا پکا گھر!''

''اور دکان پر ہزاروں لوگوں کے سامنے...''

''آگ لگے تیری دکان میں!''

اجاگر باہر گیا اور لات مار مار کر دونوں چولھوں کو توڑ پھوڑ آیا۔ دہلیز کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا، ''نکل جا پچھواڑے کی راہ چپ چاپ! نہیں تو آج خون کر ڈالوں گا۔''

اب پردیپ کمار رونے لگا۔ اجاگر اس کو گود میں لے کر اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ پردیپ کمار کی مائے اوسارے پر ہی بیٹھی رہی۔ پردیپ کمار روتے روتے سو گیا۔

سانجھ بیتی۔ رات آئی۔ سڑک پر ایک ٹریکٹر بھڑ بھڑاتا ہوا چلا گیا۔ اجاگر نے باہر نکل کر

Scanned with CamScanner

دیکھا، پردیپ کمار کی مائے اوسارے پر ہی لیٹ گئی ہے۔

اجاگر دبے پاؤں اس کے پاس چلا گیا۔ ''جا کر مستری کی کھٹیا پر کیوں نہیں سوتی؟ نخرہ پسار کر یہاں زمین پر کیوں سوئی ہے؟''

اجاگر نے دھکا دیا۔ ''اٹھ سالی! تریاچر تر کہیں اور جا کر دکھلا!''

پردیپ کمار کی مائے اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اجاگر کا پاؤں پکڑ کر بولی، ''پردیپ کے بابو! تمھارے پیر پڑتی ہوں۔ میرا گلا گھونٹ کر مار ڈالو!... مار ڈالو مجھے!''

اجاگر نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو جھپٹ کر پکڑا۔ لمبے بال چھترا گئے کھل کر۔ ''ہاں، مار ڈالوں گا۔''

''مار ڈالو۔ میں جینا نہیں چاہتی۔''

''مار ڈالوں گا گلا دبا کر، حرامزادی!''

''مارو۔ پردیپ کے با...!''

''بول، کل سے تو آنگن کے باہر پیر رکھے گی؟''

''نہیں رکھوں گی۔''

''کسی سے ہنسے گی بولے گی نہیں۔ بول!''

''نہیں۔''

''مستری سے؟''

''... نہیں۔''

''داروغہ سے؟''

''... نہیں۔''

''اُس لالہ کے بیٹے سے؟''

''... نہیں۔''

''لال گاڑی کے ڈرائیور سے؟''

''نہیں نہیں! نہیں!... پردیپ کے بابو!''

Scanned with CamScanner

پردیپ کمار کی مائے اجاگر کی چھاتی سے منھ سٹا کر بلکنے لگی۔ اسے لگا، بیاہ کے بعد آج پہلی بار وہ اپنے گھر والے کے ساتھ، اپنے مرد کے ساتھ سہاگ رات منا رہی ہے... انگ انگ میں کپکپی... لہریں... طوفان... پردیپ کے بابو، مجھے مار... ڈا... لو... مار... ڈالو!

سڑک سے ایک ٹرک کھڑبڑاتا گزر گیا۔

❁❁

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

تھیٹر والا

حالانکہ اسے پچاسوں بار پہلے بھی دیکھ چکا ہوں، لیکن اُس دن اسے دیکھ کر چونک سا اٹھا۔ لگا جیسے بنا موسم کا کوئی پھول یا پھل دیکھ رہا ہوں۔ ساون بھادوں کی کچ کچ میں لگاتار بارش کہاں سے آ گئی؟ کیوں؟

میں ہی نہیں، اسے دیکھ کر بھی جاننے والے، انجان حیران ہو کر رک جاتے ہیں۔ کوئی کوئی اس کے ٹیبل کے نزدیک جا کر کچھ پوچھ بھی لیتا ہے اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ وہ بہت ہی غیر ڈرامائی انداز میں چھوٹا سا جواب بھی دے دیتا ہے۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی کہ لوگ اسے فاربس گنج کی اس چھوٹی سی چائے کی دکان کی ایک بانہہ والی کرسی پر بیٹھا دیکھ کر کیوں کچھ دیر کے لیے ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے اندازہ لگایا — تیس اکتیس سال پہلے اس شخص کو پہلی بار دیکھا تھا، سنہ انیس سو انتیس میں۔ اسی سال پہلے پہل گلاب باغ میلے میں اتنا سٹ کر ہوائی جہاز دیکھا تھا کہ وہ سال ابھی تک یاد ہے۔ 1929 میں میں آٹھ نو سال کا تھا۔ اسی سال گلاب باغ میلے میں کلکتہ کی مشہور تھیٹر کمپنی آئی تھی اور لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوا تھا۔ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ اسٹیج پر ہی گاڑی آتی جاتی تھی — انجن سمیت چیختی چنگھاڑتی، دھواں اگلتی ہوئی — اور لال پیلی روشنی میں ان گنت پریاں ناچتی ہوئیں۔

زندگی میں پہلی بار تھیٹر دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی تھی۔ آج تک وہ دن یاد ہے! کتنی خوشی بھری

Scanned with CamScanner

حیرت! لیکن جب اسکول کھلا تو ہم جماعت بنگل بنرجی نے میرے جی کو چھوٹا کر دیا تھا۔ گو کہ وہ بھی ان دنوں آٹھ نو سال کا ہی تھا، لیکن بہت ہی تیز — پیدائشی آرٹ کریٹک! اس کے کہنے کے مطابق اس نقلی کمپنی میں پچھلے سال ناگیسر باغ میلے میں آئی اصلی کمپنی کے نکالے ہوئے سب لوگ تھے۔ بنگل نے کہا تھا کہ ناگیسر باغ میلے میں آئی کمپنی کی باتیں ہر کوئی جانتا ہے... چوبیس گھنٹے کے اندر کمپنی کو میلہ چھوڑ کر چلے جانے کا حکم کلکٹر صاحب نے دیا تھا۔ کلکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ اگر دو دن بھی یہ کمپنی میلے میں رہ گئی تو سارا ضلع کنگال ہو جائے گا۔ لیکن بنگل مجھے اداس دیکھ کر بولا تھا۔ ''تب بھی ایک بات ہے اس کمپنی میں۔ جس آدمی نے ریلوے پورٹر کا پارٹ کیا ہے، وہ ناگیسر باغ میلے میں آئی ہوئی کمپنی میں بھی یہی پارٹ کرتا تھا، یعنی ویٹنگ روم میں سوئے ہوئے لڑکے کو مارتا تھا، چھرے سے... اس کو تو نقلی نہیں کہہ سکتے۔''

آج بھی مجھے اس وقت کی سبھی باتیں یاد ہیں... گلاب باغ میلہ... پنجاب میل کا ریلوے پورٹر... لڑکے کا خون... بنگل کی باتیں...

قریب چار یا پانچ سال بعد اپرانت سنبھیشور میلے میں آئی ہوئی اُما کانت جھا کمپنی میں اس آدمی کو پھر دیکھا تھا — ایک ناٹک میں چنّا بائی کی محفل میں بھوتھیا کے بابا جی کے بھیس میں۔ ''کایا کا پنجرہ ڈولے رے، سانس کا پنچھی بولے'' گاتا ہوا، بڑی ہی سریلی آواز میں۔ گلاب باغ والی کمپنی میں لڑکے کا قتل کرنے والا، یعنی قاتل کا کردار ادا کرنے والا، بابا جی کے گیروا لباس میں۔ اپنی بولی وہ زیادہ دیر نہیں چھپا سکا۔ میں جھٹ پہچان گیا۔ جب وہ پارسی نوٹنکی کے ایک سین میں کویتا پڑھ رہا تھا: مردنگ کہے دھک ہے، دھک ہے... منجیر کہے کن کو، کن کو!... تب ہاتھ نچا کر گائیکا کہتی: ان کو، ان کو!... تب مجھے ذرا بھی شک نہیں رہ گیا۔ میں پہچان گیا تھا بابا جی کو۔ وہی تھا، جو گلاب باغ میلہ کمپنی میں ویٹنگ روم میں دبلے پتلے لڑکے کو چھرا بھونکنے کے پہلے کانپتے ہاتھ اور تھرتھراتے چھرے کو دیکھ کر پاگلوں جیسا بڑبڑا اٹھا تھا۔ ''کیوں میرے ہاتھ، تو کیوں تھرتھرا رہا ہے؟ تو تو صرف اپنے مالک کے حکم پر عمل کر رہا ہے۔ مت کانپ میرے خنجر۔ وقت برباد مت کر! شکار سویا ہے چادر تان کر! لے تو بھی اپنا کام کر!''

بس کی ڈگی پر بڑی زور سے چوٹ پڑی تھی، سبھی ہڑبڑا گئے تھے۔ یہ سب مجھے یاد ہے۔

اس کے بعد پھر تیسری بار۔ آگھیا پرساد کی ناٹک کمپنی کے شریمتی منجری کھیل میں انگریز جج کا بھیس بنا کر ٹیبل پر ہتھوڑا ٹھونک کر لوگوں کو خاموش رہنے کی تنبیہ کرتا ہوا یہ شخص بولا تھا: ''ویل مونجری بائی! ہام ٹم کو سڑی مٹی مونجری (شریمتی منجری) کا خطاب ڈیتا ہائے۔ آج سے تم کو سڑی مٹی منجری بولے گا۔ ہم بولے گا، سب بولے گا، سمجھا؟'' اور اس منظر کے کچھ لمحوں بعد وہ وہی گیت گاتا ہوا اسٹیج پر آیا تھا: ''کایا کا پنجرہ ڈولے رے''—— اپنی اسی پرانی طرز میں۔

مجھے اسے پہچاننے میں کہیں غلطی نہیں ہوئی۔ سب جگہ اسے پہچان گیا۔

کتنی بار اسے دیکھا ہے، لیکن ایسے بے موسم میں نہیں۔ بے وقت نہیں۔ اور جھرتے ہوئے ساون بھادوں میں نہیں۔ عام طور سے اسے میلے کے موسم میں دیکھا تھا، یعنی کارتک سے چڑھتے بیساکھ تک، اس لیے آج اچانک اسے اس چائے کی دکان پر بیٹھا دیکھ کر میں چونک گیا۔

ایک اندازہ لگایا—— دس گیارہ سال بعد اسے اس علاقے میں دیکھ رہا ہوں، اسی وجہ سے تجسس بھی ہوا اور حیرانی بھی۔

وہ دکان کی کرسی پر بیٹھا تھا ضرور، لیکن تھا اداس، اکھڑا ہوا، اپنے میں کھویا ہوا۔ بارش کی جھڑی وہ بہت دیر سے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

وہ... وہ... قاتل پورٹر، باباجی... انگریز جج... اُپدیشک... سپاہی... ڈاکو... اندھا... فقیر... وغیرہ وغیرہ—— سب ایک ہی شخص... ایک ہی آدمی۔

بہت زور سے بجلی چمکی، بارش اور تیز ہو گئی اور بہت دیر کے بعد اس نے وہی انداز اپنایا جس انداز میں وہ ''کایا کا پنجرہ'' والا گیت گاتا تھا، اسٹیج پر!

اتنی دیر کے بعد میری نظر اس کی پھٹی بش شرٹ پر پڑی۔ کارٹون کی چھاپ مٹ رہی تھی، میل جم رہا تھا۔ نئی ڈیزائن کی ٹوٹی چپل۔ وہ اچک کر گمبھیر نظر سے چائے والے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، ''ایک ادھر بھی...''

اس کی بولی سن کر یہ سمجھنے میں ذرا بھی شک نہیں رہا کہ جو قاتل پورٹر یا دہلا دینے والا بھینکر ڈاکو

تھا، یا رعب دار انگریز جج، یا شانت اُپدیشک وغیرہ کا رول کرتا تھا، اب بوڑھا ہو گیا ہے۔

چائے اسے بھی ملی اور مجھے بھی۔

ایک گھونٹ چائے پیتے پیتے مجھے ایک بات یاد آئی کہ اُن دنوں رات کے اسٹیج کے اداکاروں کو دن کے اجالے میں سڑک پر یا میلے میں چلتا دیکھ کر کتنا عجیب سا لگتا تھا۔ کس طرح ان لوگوں کا بولنا، بات کرنا انوکھا اور عجیب لگتا تھا، لیکن اچھا۔

یاد آیا — فاربس گنج میلے کی ایک تھیٹر کمپنی کے کچھ اداکاروں کے پیچھے بہت دیر سے گھوم رہا تھا۔ ایک پان کی دکان پر سب کھڑے ہوئے۔ پیچھے میں بھی کھڑا ہوا۔ اس پارٹی میں کافی لوگ تھے — لیلیٰ، مجنوں اور فرہاد، راجہ، ڈکیت کے ہاتھ سے راجکماری کو چھڑانے والا راجکمار، جلاد بننے والا، اور سب کے ساتھ ''کایا کا پنجرہ'' گانے والا۔ مجھے پیچھے کھڑا دیکھ کر وہ بولا تھا: ''کیوں بے چھوکرے، اس طرح کیوں گھوم رہا ہے پیچھے پیچھے؟ پاکٹ مارے گا کیا؟''

اس چھوٹی عمر میں بھی میں سمجھ گیا تھا کہ عزت نفس پر چوٹ پڑی ہے۔ انا جاگ پڑی۔ کڑا کے کا جواب دیا، ''آپ کی پاکٹ میں ہے ہی کیا جو کوئی مارے گا!''

''کیوں؟'' وہ حیران ہو کر بولا تھا، ''تو یہ کیسے جانتا ہے کہ میری پاکٹ خالی ہے؟''

گو کہ ان دنوں میں اپنے اسکول کی سب سے اوپر کی کلاس میں پڑھتا تھا اور ماسٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق اجنبی لوگوں سے انگریزی میں بات کرنے کی مشق ہو چکی تھی، پھر بھی میں نے کھڑی بولی میں ہی جواب دیا، ''کیوں! رات جو بھیک مانگ رہے تھے: داتا تیرا بھلا ہو۔''

سب زوروں سے ہنس پڑے تھے اور بولے تھے، ''چھوکرا تیز ہے۔''

اب مجھے انگریزی جھاڑنی پڑی تھی، ''یو سی مسٹر ریلوے پورٹر، ایکٹر، ڈونٹ کال می چھوکرا! آئی ایم میٹرک اسٹوڈنٹ، یو نو؟''

اتنی پرانی بات یاد آنے سے میرے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔ ذہن میں سوال اٹھا کہ اب یہ کس کمپنی میں کام کرتا ہے؟ کیا آج بھی یہ اسی طرح رعب دار ڈائیلاگ بولتا ہے؟ ویسے ہی ویٹنگ روم کے لڑکے پر خنجر چلاتا ہے؟ ویسے ہی... ویسے ہی...

Scanned with CamScanner

میرا دھیان ٹوٹ گیا۔ اس کی چائے ختم ہو گئی تھی۔ وہ میری ٹیبل سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پوچھا، ''آپ مجھے پہچانتے ہو سیٹھ؟''

اس کی بانہہ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے میں بولا، ''میں سیٹھ نہیں ہوں۔ خالص آدمی ہوں۔ کہیے، آج کل کس کمپنی میں ہیں؟ اس بے موسم میں آپ کو اس علاقے میں دیکھ کر مجھے کافی تعجب ہو رہا ہے۔''

''صاحب، اب کہاں کی کمپنی اور کیسا تھیٹر! سب کو فلم کھا گیا۔'' اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔

''آپ نے کتنی کمپنیوں میں کام کیا ہے؟''

''صاحب، پندرہ۔''

لگا جیسے اس کے ذہن میں سب کچھ سب سنجو کر رکھا ہوا ہو۔ چند لمحوں بعد میری طرف خالی نظروں سے تاکتا ہوا بولا، ''نو سال کی عمر میں پہلی بار اسٹیج پر آیا تھا۔ کشن کے رول میں۔''

مجھے محسوس ہوا کہ میرے سامنے گزرے وقتوں کی ایک باقیات بیٹھی ہوئی ہے — 'پارسی تھیٹر' کا ایک ٹوٹا ہوا اداکار۔

سگریٹ بڑھاتے ہوئے پوچھا، ''تو آج کل کیا کرتے ہیں آپ؟''

وہ لمحہ بھر چپ چاپ میری طرف دیکھتا رہا، پھر سگریٹ سلگاتا ہوا بولا، ''کیا کروں گا صاحب! وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ عشق نکما کر دیا... '' اس نے ہنسنے کی ناکام اداکاری کی۔ ''دس سال بعد اس علاقے میں آیا ہوں۔ کیا نام بتایا لوگوں نے — میتھلا دیش۔ صاحب، اس علاقے میں ناٹک کے کافی شوقین لوگ ہیں... جانے کو تو فلم میں بھی گیا، پر جی نہیں لگا۔''

اتنا کہہ کر کنکھیوں سے ایک بار اِدھر اُدھر نظر ڈالتے ہوئے پھر میری طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا، آہستہ سے کچھ جھجکتا ہوا بولا، ''صاحب، ایکسکیوزمی... فار دی لاسٹ ٹو ڈیز آئی ایم ہنگری، ویری ہنگری... مانگنے کی ہمت نہیں ہوتی کسی سے...''

اس نے یہ انگریزی ڈائیلاگ بہت ہی ڈرامائی انداز میں بولا تھا۔ میں کچھ کہنے کو ہی تھا کہ وہ

Scanned with CamScanner

چہرے پر حکم ماننے کا تاثر پیدا کرتے ہوئے گڑگڑاتے لہجے میں بول اٹھا، ''حکم ہو تو کچھ پیش کروں... اب تو یہی ایک سہارا بچا ہے۔ ڈرامے کے پرانے شوقین ملتے ہیں، سنا دیتا ہوں۔ جی ہلکا ہو جاتا ہے اور کچھ...''

وہ اپنے جملے کو ادھورا چھوڑ کر کونے میں رکھی اٹیچی کو دکر لے آیا۔ ایک کالی لنگی باہر نکال کر منھ ڈھانپ لیا۔ پھر لنگی کا پردہ اٹھایا، تلوار کٹ مونچھ والا ایک عجیب چہرہ باہر آیا۔ مدھم آواز میں وہ بولا، ''یہ ایک اداس نراش نوجوان پریمی کا ڈائیلاگ ہے۔'' ایک بار وہ کھانسا، پھر بولنا شروع کیا، ''ظالم چپلا! یہ کیا کیا؟ تم نے میرے دل کے ہزار ٹکڑے کر دیے! ظالم، تو نے یہ کیا کر ڈالا! کیا کر ڈالا چپلا... چپلا... چلی گئی تو چپلا! چلی گئی تو مجھے تڑپتا چھوڑ کر...'

اس کے بعد ہچکیوں کے بیچ اس نے جو مکالمے ادا کیے، وہ میں نہیں کہہ سکوں گا۔

دکان میں لوگوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ چاروں طرف سے لوگ جھک جھک کر دیکھ رہے تھے۔ سب کے چہرے پر ایک عجیب چپ اور حیرت کا تاثر تھا۔ باہر بادل رہ رہ کر گرج اٹھتا تھا۔

اس نے پھر اپنے چہرے پر لنگی کا پردہ گرا لیا، جیسے خود کو گرین روم میں لے گیا ہو۔ اس بار بڑی بڑی مونچھوں والا سردار بن کر باہر آیا۔ پردہ اٹھا۔ وہ گرجا، ''کیوں بے بدکار! بتا کہاں ہے راجکمار؟ کہاں ہے، مکار کی اولاد...''

اس جوشیلے ڈائیلاگ کی اٹھا پٹک میں نقلی دانتوں کا سیٹ چھٹک کر منھ سے باہر آ گیا۔

اسی طرح اس نے درجنوں مکھڑے بنائے، کتنی ہی طرح کی کیفیتوں کے مکالمے سنائے اور آخر میں ٹوپی کو بھیک کا پیالہ بنا کر لوگوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا، ''داتا تیرا لاکھ لاکھ بھلا ہو! آنہ دو آنہ... دو پیسے ہی سہی...''

میرا پیر زمین سے مس ہو گیا۔ جیسے کہیں تھوڑی چوٹ لگی ہو، ایک جھٹکا لگا ہو۔ اس شخص نے اپنی کلا کے جادو سے کتنے برس پیچھے دھکیل دیا تھا۔ میں دوبارہ حال میں لوٹ آیا۔ دیکھا، بنگل بنرجی ایک ٹک تاک رہا ہے — تھوڑا تھوڑا ہونٹوں کے کناروں سے مسکراتا ہوا۔

بنگل اس سے تیز لہجے میں پوچھ بیٹھا، ''کیوں ایکٹر موشائے، کل اتنی محنت سے چندہ کر دیا، سو

سب ایک ہی رات میں بھٹی میں پھونک دیا؟ واہ رے موشائے!''

پیدائشی آرٹ کریٹک میرا ہم جماعت بکل بنرجی آج بھی کلا اور کلاکار کو پہچاننے کا دھندا اسی طرح کرتا ہے۔ سب دن ایک جیسا ہی رہا وہ۔ میری طرف دیکھتا ہوا بکل بولا، ''تم بھی اس کی بات میں پھنس گئے۔ مجھ سے کل یہ کہہ رہا تھا: فارٹو ڈیز آئی ایم ہنگری...''

نہیں جانتا کیوں، مجھے اس وقت بکل کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں پوچھا، ''بکل، اس کے ڈولتے ہوئے جسم کے پنجرے میں جو پنچھی بول رہا ہے، اس کی بولی کو سن کر تم کو کچھ نہیں لگا؟ ٹھیک بتانا!''

بکل ایک دم خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر ساکت رہا، پھر دھیرے سے بولا، ''کچھ نہیں لگتا تو کل سارا دن کیوں اس کے ساتھ بھیک مانگتا! چندہ تو بھیک ہی ہوئی۔'' اس نے ایک لمبی سانس لی، پھر کہنے لگا، ''کیا بتائیں کیسا لگا؟... تمھارے اور دوسرے دوستوں کے ساتھ بھاگ کر رات بھر تھیٹر دیکھنے گیا ہوں، ہاسٹل سے۔''

میں نے کہا، ''ہاں بکل، مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگا۔''

اسی بیچ بوڑھے ایکٹر نے اپنے دوسرے، پرانے مشہور گیت کا مکھڑا گانا شروع کر دیا تھا:

صبح ہوئی، نکل گئے تارے
مجھے چھوڑو، چلو میرے پیارے

اچانک پھر ہم لوگوں کی نظروں کے سامنے میلے کا موسم جگمگ کرنے لگا۔

❁❁

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

رسول مستری

بہت کم عرصے میں ہی اس چھوٹے سے گنوارو شہر میں کافی تبدیلیاں آ گئی ہیں — امید سے زیادہ، اور شاید ضرورت سے بھی زیادہ۔

اسکول اور ہاسٹل کی عالیشان عمارت کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آج سے محض آٹھ سال پہلے زیادہ تر کلاسیں پیپل کے نیچے لگتی تھیں۔ برسات کی رات میں ہاسٹل میں رہنے والے شاگرد 'ٹوٹ ٹاٹ گھر ٹپکت کھٹیو ٹوٹ' کی یاد تازہ کرتے تھے۔

شہر بھر کا کوڑا جس جگہ پھینکا جاتا تھا، وہیں آج بڑا سا ٹاؤن ہال ہے، کلب ہے اور لائبریری ہے۔

غفور میاں کا چمڑے کا گودام 'تصویر محل' ہو گیا ہے۔ کبھی اس گلی سے گزرتے وقت بھنگیا مہترانی بھی ہونٹ سکوڑ کر ناک پر آنچل ڈال لیتی تھی۔ اور آج تو صفائی ستھرائی کی پتلی مس چھایا بھی اس گلی میں جی ہی جی میں گنگنانے کی کوشش کرتی ہے: 'ہم کو ہے پیاری ہماری گلیا'۔

خلیفہ فرید کی پھٹپھٹانے والی پھٹیچر سنگر مشین اور ان کی قینچی کی کاٹ چھانٹ کے دن لد گئے ہیں۔ 'ماڈرن کٹ فِٹ' کے 'للّو ماسٹر' کا زمانہ ہے۔

ریستورانوں اور ٹی اسٹالوں کی تعداد تو ساگ بھاجی کی دکانوں سے بھی بڑھ گئی ہے۔ جنگ اور مہنگائی کے باوجود نئی نئی اسکیمیں بن رہی ہیں، بگڑ رہی ہیں۔ شہر کی پوری کایا پلٹ ہو گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

لیکن صدر روڈ میں، اس پرانے برگد کے بغل میں، رسول مستری کی مرمت کی دکان کو تو جیسے زمانے کی ہوا لگی ہی نہیں۔ کوئی تبدیلی نہیں، کچھ نیا پن نہیں۔ پھٹی ہوئی دری پر بیٹھ کر مرمت کے کام میں مگن غلام رسول اور اس کا بیٹا رحیم، دونوں کی بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں بدلی۔ آس پاس مرمت کے لیے آئی ہوئی چیزیں — سائیکل کے پرانے پہیے، ٹیوب، سیٹ، پیڈل، چین، ہینڈل، بریک، پیٹرومیکس، اسٹوو، ہارمونیم، گراموفون وغیرہ؛ اردگرد بکھرے ہوئے اوزار، چھوٹے بڑے پیچ؛ ایک کاٹھ کے پرانے بکس میں تقریباً سبھی چیزوں کے پرانے پرزے، رینچ، ریتی، چھینی، ہتھوڑی، پیچ کش، ٹوٹے اسپرنگ وغیرہ۔ پاس میں ہی ایک چھوٹی سی پرانی الماری میں پرانے اور نئے ڈیزائنوں کے چھوٹے بڑے بگڑے ہوئے ٹائم پیس، ڈنلپ ٹیوب کے دو تین خالی ڈبے، چھوٹی بڑی کتنی ہی چیزیں — پر سب پرانی اور بگڑی ہوئی۔ الماری کے اوپر پرانے گراموفون کا ایک چونگا اوندھایا ہوا، دیوار پر ڈنلپ اور گڈ ایئر اور واچ کمپنیوں کے سنہ 1934، 36 اور 38 کے پرانے کیلنڈر، مس کجن کی ایک پھٹی ہوئی رنگین تصویر، دو دیوار گھڑیاں — ایک بنا ڈائل کی، دوسری بنا پنڈولم کی۔ بنا پنڈولم والی گھڑی پتا نہیں کتنے دنوں سے تین بجا رہی ہے۔ دوسری اپنے اندرونی کل پرزوں کی نمائش کر رہی ہے۔ اس کی اسپرنگ کے پاس ہی مکڑی نے اپنا جالا تان دیا ہے۔

دوسری طرف رحیم بیٹھا چپ چاپ کام کر رہا ہے۔ ٹین کی کرسی پر بیٹھ کر گاہک اپنی بگڑی ہوئی چیز کو بنتے دیکھ رہا ہے۔

سامنے کے برگد کے تنے پر، جہاں روز نئی دکانوں کے اعلان، دوائیوں کے پرچے، نیشنل وار فرنٹ کے نعرے، سنیما کے اشتہار چپکائے ہوئے رہتے ہیں، ایک پرانی ٹین کی تختی نہ جانے کتنے برسوں سے لٹک رہی ہے، جس پر ٹیڑھے میڑھے حروف میں لکھا ہوا ہے: 'رسول مستری۔ یہاں مرمت ہوتا ہے۔'

اس سائن بورڈ پر بہت دنوں سے پڑھے لکھے لوگوں کی منڈلی تبصرے کرتی رہی ہے، طنز کیے ہیں اور رسول مستری کے سامنے تبدیلی کی تجاویز رکھی گئی ہیں، لیکن آج بھی وہ تختی اسی طرح لٹک رہی ہے۔ ہاں، کسی شیطان لڑکے نے کھلّی سے اس پر لکھ دیا تھا: 'یہاں آدمی کی بھی مرمت ہوتی ہے۔' سو اسے بھی مٹانے کی کوئی ضرورت شاید نہیں سمجھی گئی۔

Scanned with CamScanner

رسول مستری!

مجھولا قد، کاریگروں کی سی کایا اور نکیلے چہرے پر مٹھی بھر گنگا جمنی ڈاڑھی۔ ساٹھ برس کی لمبی عمر کی کوئی بھی خاص علامت جسم پر نظر نہیں آتی۔ پھرتی چستی جوانوں سے بھی بڑھ کر۔ سادگی کا پتلا۔ موٹیا کپڑے کی ایک لنگی اور قمیض۔ پان، چائے اور بیڑی کا رسیا۔ کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر چپ چاپ بیٹھنا وہ جانتا ہی نہیں۔ گپی بھی نمبر ایک کا، لیکن اپنی ذمے داری کو کبھی نہ بھولنے والا۔ کام کے ساتھ ساتھ وہ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رکھ سکتا ہے۔

'ٹھک ٹھک، ٹھک، ٹھک ٹھک، ٹھک۔'

''تو سمجھے ناجی، دوزخ بہشت، سورگ نرک سب یہیں ہیں، یہیں۔ اچھے اور برے کا نتیجہ تو یہیں مل جاتا ہے۔ رام چندر بابو کو دیکھو نا!... ارے رحیم! ذرا پیچ کش پھینکنا تو... رام چندر بابو... ارے بھئی چھوٹا والا، چھوٹا والا! رہ گئے پورے 'بھوکو' تم! اس سے بھلا... ہاں، یہیں...''

رحیم!

رسول مستری کا اکلوتا بیٹا۔ سانولا سا ہٹا کٹا جوان، باپ کی انتہائی عزت کرنے والا اور ضرورت سے زیادہ طبیعت کا نرم۔ باپ کی موجودگی میں کبھی اسے منہ کھول کر بولتے نہیں دیکھا گیا۔ جہاں دو چار آدمی کام لے کر آئے کہ اس کی برداشت کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ چھوٹی سی غلطی پر بھی رسول میاں پنک اٹھتے ہیں۔ دن بھر کام میں جٹے رہنے پر بھی کاہل، کام چور، لاپروا اور کبھی کبھی آوارہ کا خطاب بھی اسے مل جاتا۔ رسول میاں بولتے رہتے اور وہ شانت رہ کر چیز والے کو سمجھاتا رہتا: ''اس کا اسپرنگ ٹوٹ گیا ہے اور ہولڈنگ نٹ...'' بس، رسول میاں اس میں بھی اپنی ٹانگ اڑا دیتے۔ ''دیکھیں، کہاں کیا ہوا ہے... ہوں، واہ رے لڑکے! صرف اسپرنگ ٹوٹا ہے؟ اچھا، لے ہم نیا اسپرنگ فٹ کر دیتے ہیں، ہولڈنگ نٹ بھی بدل دیتے ہیں، مشین چلا کر ریکاٹ (ریکارڈ) بجا دے تو سمجھیں کہ ہو گیا ہے پکا مستری۔ ارے اُلو، بیلنس کیسے ٹھیک ہوگا بیلنس؟''

رحیم اپنے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکان لا کر نگاہیں نیچی کر لیتا۔

شہر سے دو میل پورب کی طرف ایک چھوٹی سی بستی میں مستری کا گھر ہے۔ مستری کے پرکھے

Scanned with CamScanner

کبھی خوشحال کسان تھے، پر آج تو جائیداد کے نام پر تین جھونپڑیاں اور مویشیوں میں کچھ بکریاں اور مرغے مرغیاں رہ گئی ہیں۔ آمد کا یہ حال ہے کہ جس دن دکان بند اس دن کھانا بند۔ اور خرچ نوابی — تیسوں دن کباب اور قلیہ، حلوے اور سویاں ہی پکتی ہیں۔ بیٹا اور بہو تو کچھ کہنے سے رہے۔ رہ گئی بڑھیا، سو وہ بیچاری اپنی جوانی کے دنوں سے ہی کاٹ کپٹ، کم خرچ اور بچت کے بھی طریقوں کو آزما کر ہار گئی ہے۔ میاں غلام رسول کی عمر خیامی فلاسفی کے آگے اس کی کوئی بھی دلیل نہ کبھی ٹکی اور نہ کبھی اس کی کچھ سنی ہی گئی۔ پر وہ ہے کہ بولنے سے اب بھی باز نہیں آتی۔ جوں ہی رحیم کے ہاتھ میں کسی چیز کی پوٹلی دیکھتی، پوچھ ہی تو بیٹھتی۔

''پوٹلی میں کا ہے رحیم؟''

''کلیجی ہے،'' رحیم منمنا کر جواب دیتا۔

''کتنا ہے؟ سیر بھر؟... کا بھاؤ دیا؟ یا اللہ! دو روپے سیر؟ آگ لگے ایسی جیبھ میں! دو روپے سیر کلیجی؟ ہم پوچھیں ہیں توسے رحیم، کہ اللہ تورے کب عقل دیہیں؟ اُو کے (میاں کے) سر پر تو کھاؤ بھوت سوار ہے کھاؤ بھوت! تورے منھ میں اللہ تعالیٰ نے بولی نا دیا ہے؟'' بڑھیا بیٹھ کر کلیجی کے شوق کو کوستی رہتی، رحیم چپ چاپ وہاں سے کھسک جاتا۔ بڑھیا کی گود میں بیٹھا ہوا پوتا کلیجی کی پوٹلی کی طرف بار بار جھپٹتا اور بڑھیا اس کو بار بار روکتی۔ ''ہائے ہائے! ہمرے تو کچھ نہ سوجھے ہے۔'' گھنٹوں وہ بڑبڑاتی رہتی۔ ''باپ بیٹے دونوں کی مت ماری گئی ہے! زمانہ دیکھ کر نہیں چلتے، کھانے پینے کے پیچھے لوگوں کا جو برا حال ہوا ہے...'' آنکھوں دیکھے واقعات کی مثال دے دے کر یہ ثابت کرتی کہ ایسے چٹورے مرتے وقت کفن کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑ جاتے، وغیرہ۔

وہ اپنی قسمت کو کوستی رہتی کہ ٹھیک اسی موقعے پر میاں رسول آ پہنچتے۔ سب سے پہلے جواب طلب کرتے کہ کلیجی اب تک اس طرح کیوں پڑی ہوئی ہے۔ بڑھیا منھ لٹکائے چپ رہتی۔ رسول میاں اندر جا کر مرزئی کھول آتے، برآمدے پر جم کر بیٹھ جاتے۔ بہو گڑگڑی دے جاتی۔ دو برس کا نٹ کھٹ پوتا کریم دادی کی گود کو چھوڑ کر دادا کی گود میں آ کر بیٹھ جاتا اور ڈاڑھی کی طرف انگلی دکھا کر توتلی بولی میں دادی کی شکایت کرنے لگ جاتا۔ ''اُو کھِت کھِت بُہیا...'' (کھٹ کھٹ بڑھیا)۔ انعام میں لیمن جوس اور بسکٹ پا کر، زور زور سے پکار پکار کر دادی کو چڑانے لگتا۔ ''کھِت کھِت بُہیا

ہے... کھت کھت بہیا..."

رسول میاں گڑگڑی کا کش لگاتے ہوئے گمبھیر ہو جاتے، پھر پوچھتے: "ہم تورے سے پوچھے ہیں رحیم کی اماں، کہ آخر تیری یہ روز روز کی کھٹ کھٹ کی عادت کب چھوٹے گی؟ جب دیکھو تب وہی حال، جب سنو تب وہی بات۔ آخر ہم پوچھے ہیں کہ تورے لاج شرم..."

"چپ رہو! لاج شرم کی بات مت بولو!" بڑھیا بھڑک اٹھتی۔

"چپ کرانے والی کی ایسی کی تیسی!" رسول میاں بھی گرم پڑ جاتے۔ "ہم تو سو بار نہیں، ہزار بار کہیں گے کہ تورے لاج شرم ذرا بھی نہیں، سب دھو کر پی گئی ہے۔ تیرا بس چلے تو سب کو فاقہ کرا کے چھوڑے۔ شوق سے کوئی چیز لاؤ تو بنا کھٹ کھٹ کیے چین نہیں۔"

"کھت کھت بہیا!" کریم بسکٹ کھاتے کھاتے کلکاری مار کر بول اٹھتا۔ بیچاری بڑھیا رو دیتی۔ اللہ تعالیٰ اسے اٹھا لے، اب کون سا دن دیکھنے کے لیے وہ جی رہی ہے؟ وہ اس گھر کی کون ہے، وہ کیوں بولے؟ نیکی کی بات کہنے سے وہ بے حیا کہلائی، بے شرم کہی گئی... بہو کلیجی کی پوٹلی لے کر کاٹنے لگ جاتی۔ رحیم اپنی کوٹھری سے نکل کر باہر چل دیتا۔ بڑھیا بیٹھی سسکتی رہتی۔

"رسول کاکا ہیں گھر میں؟" باہر سے کوئی آواز دیتا۔

"کون ہے؟ فخرالدین! اندر آؤ، کیا بات ہے؟" رسول میاں گڑگڑی کی نلکی منہ سے ہٹاتے ہوئے جواب دیتے۔

"کاکا، رشیدہ کو کئی دن سے ہی پیٹ منہ دونوں چلے ہیں۔ دوا تو کوئی فائدہ نہیں کرے ہے۔ بدن بھی ٹھنڈا..."

"تو کئی دن سے کان میں تیل ڈالا کر سویا کاہے تھا؟" رسول میاں بیچ میں ہی بات کاٹ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ "چلو دیکھیں۔ کچھ نہیں ہوگا۔ کھٹا میٹھا کھائی ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔" کہہ کر وہ اندر چلے جاتے۔

"اسماعیلا کیسا ہے رے فخرو؟" بڑھیا پوچھتی۔

"توری دعا سے سب اچھا ہے کاکی۔ تو تو اب کبھی آتی بھی نہیں۔ اسماعیلا کی ماں کہے ہے کہ کاکی ناراض ہے۔"

''در پاگل! ناراض کا ہے ہووے۔ کریتا کے مارے فرصت ملے تب تو۔''

رسول میاں جیب میں چھوٹی بڑی شیشیاں ٹھونس کر نکل پڑتے۔ ''چل۔''

بڑھیا آپ ہی آپ بولتی، ''ذرا ٹھکانے سے دیکھیے گا، جو دوا نہیں ہو وہ شہر سے منگا لیجیے گا۔''

دادا کے چلے جانے کے بعد کریم میاں دھیرے دھیرے دادی کے پاس آ کر بیٹھ جاتے اور بے مطلب کی ہنسی ہنس کر سمجھوتے کی تجویز پیش کرنے لگ جاتے۔ اگر دادی ادھ کھایا بسکٹ لے کر بھی سمجھوتہ کر لے تو کوئی حرج نہیں۔

''چل ہٹ شیطان! جا اپنے دادا کے پاس۔ بڑا آیا ہے وہاں سے بسکٹ دے کر پھسلانے! ہم تو کھٹ کھٹ بڑھیا ہیں!'' یہ کہہ کر وہ روٹھی سی رہتی۔ لیکن میاں کریم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان موقعوں پر کیا کرنا چاہیے۔ زبردستی گودی میں بیٹھ کر غیر حاضر دادا کی شکایت کرنے لگ جاتے۔

''دادا پھکٹ! دادا چتو!'' (دادا پھکڑ! دادا چٹور!) دادی کے ہونٹوں میں چھپی مسکان کو وہ دیکھ لیتا اور عجیب وغریب زبان میں ہنس بول کر دادی کو رجھانے لگ جاتا، جس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ دادا کے ساتھ مختصر سمجھوتہ تو صرف بسکٹ کے لیے ہوا تھا۔ دیکھا، کیسے دادا سے ٹھگ کر بسکٹ لے لیا۔ اسی کو کہتے ہیں سیاسی داؤں پیچ۔

کلیجی کاٹتے کاٹتے امی آنکھ دکھا کر کہتی، ''اچھا، آویں ہیں تورے دادا۔ سب ٹھگی پن تورے آج باہر کراویں ہیں۔''

کریم میاں بھلا امی کی بات کو کیسے برداشت کریں! امی تو گھر بھر میں سب سے کمزور اور غیر اہم ہستی ہے۔ کریم میاں نے اس کی خوشامد نہ کبھی کی ہے اور نہ کرے گا۔ اور اس کی یہ حماقت کہ دھمکی دے؟ تھوڑی دیر گمبھیر ہو کر چپ رہنے کے بعد مسکراتی ہوئی امی کو ڈانٹ دیتے۔ ''چپ پھوہ!'' (چپ پھوہڑ!)

''آنے دے دادا کو!'' امی پھر دھمکی دیتی۔ اس بار کریم میاں پاجامے سے باہر ہو جاتے۔ دادی کی گود سے اٹھ کھڑے ہوتے اور آس پاس کھینچ مارنے والی کسی چیز کی تلاش کرنے لگتے۔ موٹی لاٹھی کو اٹھانے میں ناکام ہو کر، خالی ہاتھ ہی امی پر دھاوا بول دیتے۔ بال پکڑ کر گھسیٹنے لگ جاتے۔ امی چلا اٹھتی، ''چھوڑ شیطان، چھوڑ۔ نہیں کہوں گی دادا سے، چھوڑ۔''

Scanned with CamScanner

دادی ہنستی ہوئی جا کر اسے پکڑ لاتی۔ کریم میاں اپنی زبان میں دھمکی دیتے: ''پکڑ دادا کو، ابا کو اور تم کو مار کر گھر سے نکال دوں گا۔''

اگر امی منھ چڑا دیتی تو پھر میدان جنگ میں اترنے کی تیاری کرنے لگ جاتے، لیکن دادی روک دیتی۔ صرف دانت کٹکٹا کر، بلبلا کر بیٹھ جاتے۔ دادی اور امی اس اشارے کو سمجھتی ہیں۔ بڑھیا کہتی: ''آج دودھ پیتے بکھت تورے رُلا کے چھوڑے گا۔ یاد رکھیو۔''

کریم نے اِدھر کچھ دنوں سے یہ نیا طریقہ نکالا ہے۔ دودھ پیتے وقت وہ رہ رہ کر اس کا استعمال کرتا ہے۔ امی چیخ اٹھتی ہے۔ ''اماں رے!'' اور اپنی کامیابی پر، امی کی چیخ پر کریم کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔

رسوئی گھر میں بہو کلیجی پکاتی رہتی۔ بڑھیا پکار کر کہتی، ''دیکھنا، زیادہ کڑامت کر دینا، نہیں تو کھاتے بکھت طوفان کھڑا کر دے گا۔'' دو تین بار باہر سے نمک مرچ مسالے کے بارے میں چیتاؤنی دینے کے بعد وہ خود رسوئی میں پہنچ جاتی۔ بہو کی گود میں کریم کو دیتے ہوئے بولتی: ''جا بچہ جا، میں دیکھوں سالن۔'' بہو مسکراتی ہوئی رسوئی سے باہر ہو جاتی۔ گاؤں میں چکر لگا کر رحیم اپنی کوٹھری میں واپس آ جاتا۔ میاں بیوی اور بیٹا، تینوں جنے مل کر پرانے جاپانی گرام فون پر کملا جھریا کا گیت سننے میں مشغول ہو جاتے: ''ادا سے آیا کرو پنگھٹ پر، جب تک رہے جگر میں دم۔''

رسول میاں جب لوٹتے تو ہاتھ میں 'بسنتی تاڑی' کی لبنی رہتی۔ آنگن میں دستر خوان بچھ جاتا۔ اونگھتے ہوئے کریم میاں بھی اٹھ بیٹھتے۔ رکابی، بدھنا اور گلاس گھسیٹ گھسیٹ کر دادا کے پاس لے جاتے۔ تینوں جنے مل کر لذیذ کلیجی روٹی کھاتے رہتے، بیچ بیچ میں تاڑی کا دور چلتا رہتا۔ بڑھیا پاس ہی بیٹھ کر پروستی رہتی۔ ''واہ، سالن تو خوب بنا ہے۔'' سنتے ہی بڑھیا نہال ہو جاتی۔

کریم بھی ایک آدھ گھونٹ پی کر جھومنے لگتے۔ لبنی میں بچی ہوئی تاڑی بڑھیا کے سپرد کرتے ہوئے رسول میاں فرماتے، ''ایک گلاس ہو گا، بہو کو دے دے۔ آج کل تو ایک دم 'چمگدڑی' ہو گئی ہے۔ ایک گلاس روز پی لے تو بدن لوٹ آوے۔ تاڑی ہے، ٹھٹھا نہیں ہے۔ ارے ہاں ہاں، تو نے کبھی پی ہی نہیں تو جانے گی کیا؟''

کچھ دیر بعد ہی جھونپڑیوں میں نیند کا سامراج چھا جاتا۔ کبھی کبھی رسول میاں کو رات میں بھی

Scanned with CamScanner

اٹھ کر 'کال' پر جانا پڑتا تھا اور ساری رات مریض کے پاس بیٹھ کر بتانی پڑتی تھی۔

صبح چپ چاپ ناشتے کے بعد ہی رسول میاں شہر کو چل پڑتے۔ دوپہر کا کھانا رحیم لے کر آئے گا۔ گھر سے چلنے کو تو وہ چل دیتے ٹھیک وقت پر، لیکن کھانا لے کر رحیم ان سے اکثر پہلے ہی پہنچتا۔ گھر سے نکلتے ہی گاؤں بھر کے شادی بیاہ، جھگڑے پنچایت، بیماری دکھی، دوا دارو وغیرہ کے بارے میں صلاح مشورہ لیتے دیتے بارہ بج جاتے۔ گاؤں سے باہر آکر، کھیتوں میں کام کرتے ہوئے لوگوں سے کھیتی باڑی کے بارے میں دو دو باتیں نہ کریں، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے!

''ارے مہنگو، تیرا امیلہ والا باچھا کہاں ہے؟''

''کا کہیں ماما! آج دو دن سے نہ گھاس کھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے۔ بھگوان جانے کیا ہو گیا ہے۔''

بس رسول میاں لوٹ پڑتے۔ باچھا کو دیکھ کر روگ کی تشخیص کر کے جڑی بوٹی بتلا دیتے۔ صرف اتنا ہی نہیں، کس کے بغیچے میں، کس پیڑ کے آس پاس وہ جڑی ملے گی، یہ بھی بتا دیتے، یا خود جا کر لا دیتے۔

دکان پر پہنچ کر اپنی جگہ بیٹھتے بیٹھتے آپ ہی آپ بول اٹھتے، ''اوہ! بڑی دیر ہو گئی۔'' پھر رحیم کے کام کو کچھ منٹ غور سے دیکھ کر کہتے، ''لا، ادھر دے، دیکھیں۔ تب تک تم بھولا کی گھڑی کو دیکھو تو۔''

ٹوٹی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہیں پوچھ دیا کہ ''کون بھولا؟'' تو کام کے ساتھ ہی ساتھ بھولا کی سوانح حیات شروع ہو جاتی، ''اجی وہی بھولا۔ کانگریسی بھولا۔ معلوم ہے؟ جیل میں ہی بی اے پاس کر لیا۔ خوب لڑکا ہے بھولا بھی... یہ دیکھیے، آپ کی گھڑی کا ہیئر اسپرنگ اتنا کمزور ہے کہ کیا کہا جائے! اسی لیے کہتے ہیں کہ ستا روئے بار بار... مگر بھولا ہے اپنی دھن کا پکا۔ ویسے تو بہت لڑکوں کو دیکھا ہے...''

سننے والا انجانے بھولا کی لمبی چوڑی داستان کی تمہید ہی سن کر آگے سننے کی ہمت ہار بیٹھتا۔
''بھئی کس بھولا کی اتنی تعریف کیے جا رہے ہو؟ وہی لمبے لمبے بال والا؟''

''ارے صاحب، نہیں!'' بات کاٹ کر رسول میاں کہتے۔ ''لمبے بالوں والا تو ابندر ہے ابندر۔ وہ بھی بھولا کا ہی ساتھی ہے۔ وہ بھی ایک عجیب لڑکا ہے۔ معلوم ہے؟ شاعر ہے شاعر! شاعری

کا استاد ہے۔ گائے جیسا سیدھا لڑکا ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے آوارہ ہے مگر...''

''ایہو رسول کاکا! چلو دیکھو تو...'' جوان گوالن سبکتی ہوئی آ کر کھڑی ہو جاتی۔ ''دیکھو تو بھلا رسول کاکا، دودھ کے برتن پھوڑ دیلن، ہاتھ پکڑ کے لگو جھگو...!''

''ارے کون؟ کون؟''

''چھتیش بابو کے بیٹا۔''

''ستیش بابو سے نہیں کہا؟''

''چھتیش بابوا لٹے ہمرے مارے دوڑلن۔ بھاگ حرام جادی!''

رسول میاں کی تیوریاں چڑھ جاتیں۔ کام چھوڑ کر بڑبڑانے لگتے۔ ''جتنا امیر ہے سب ایک نمبر کا چوٹٹا ہے۔ جا، تو ذرا سوداگر سنگھ کو بلا لا تو رے سُدمیا۔'' سُدمیا گوالن آنسو پونچھتی چلی جاتی لیکن رسول میاں کی کلبلاہٹ جاری رہتی۔ ''بڑا روپیہ کا گرمی ہو گیا ہے۔ عورت کی عزت پر ہاتھ اٹھاوے گا؟ شیطان کہیں کا...''

''ارے مستری، ان چھوکریوں کو کم مت سمجھو۔ ایک ہی کھیلی کھلائی ہوتی ہیں۔ بھلا ایسی جوان لڑکی کو شہر میں دودھ بیچنے کے لیے آنے کی کیا ضرورت ہے؟...''

''چپ رہیے صاحب! یہ لڑکی میری بیٹی کی طرح ہے۔ گاؤں کی لڑکیاں بڑی سیدھی ہوتی ہیں، سمجھے؟ آپ کے شہر کی طرح نہیں ہوتیں۔ میں پوچھتا ہوں، دودھ کی آمدنی سے ہی جہاں پیٹ چلتا ہو، گھر میں اس لڑکی کو چھوڑ کر سب بیمار ہوں، تو ڈاکٹر کو بلانے، دودھ بیچنے جوان لڑکی نہیں آوے تو کون آئے گا؟ بتائیے! اور بھلے آدمی کا کیا یہی دھرم ہے کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں کو مصیبت میں دیکھ کر اس پر ظلم کرے؟''

سُدمیا آ کر کہتی، ''سوداگر کاکا گھر پر نہیں ہیں۔'' رسول میاں سدمیا کے ساتھ اکیلے ہی چل پڑتے۔ دن ڈھلنے کے بعد کہیں وہ واپس آتے اور بڑبڑاتے ہوئے دکان میں داخل ہوتے، ''بچو چلیں ایک دن دیہات! سرِ عام سڑک پر نہیں پٹوا دیا تو غلام رسول نام نہیں۔'' پھر دکان کے ایک کونے میں بیٹھی کنجڑنوں سے پوچھتے، ''کیوں عبدل کی ماں، آج بڑے سویرے کام ختم ہو گیا؟'' بس کنجڑنوں کی ٹولی ٹوٹ پڑتی۔ ''کب سے بیٹھے ہیں، ذرا حساب کر دو بڑھو۔''

Scanned with CamScanner

''ٹھہرو، ٹھہرو، ایک ایک کر کے۔ ہاں تو رے رِکتا کر یلا رہا حمیدن؟ تیرہ سیر؟ کیا بھاؤ بیچی؟... چار آنے؟... ہاں تو تیرہ چوکا باون۔ باون آنے کے سوا تین روپے۔ دیکھیں پیسہ؟ اچھا تمھارا پَرَول؟... اے صاحب، اُدھر رحیم کو دکھلایئے، ہم کو ابھی فرصت نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں؟''

حساب کتاب کرتے، کھوٹے کھرے پیسوں کی جانچ کرتے شام ہو جاتی۔ رحیم کام بند کر، چلنے کی تیاری کرتا۔ ''ارے ان لوگوں کو ساتھ لیتا جا رحیم۔ شام ہو گئی نا! میں ذرا اُدھر سے ہوتا آؤں گا۔'' کنجڑنوں کی ٹولی کے ساتھ رحیم چل پڑتا۔ دھنو ساہ کی دکان پر پہنچ کر کنجڑنیں دو پیسے کی جلیبی اور شکر پارا لینے میں ہی گھنٹوں کی دیر لگا دیتیں اور رحیم سڑک پر کھڑا چپ چاپ سبھوں کا انتظار کرتا رہتا۔

رسول مستری کے یہاں مرمت کی ہوئی چیز پکّی ہوتی ہے۔ سب چاہتے ہیں کہ رسول میاں کے یہاں ہی اپنی بگڑی چیزوں کو بنوائیں۔ ''لیکن وہ دکان پر جم کر بیٹھتا کہاں ہے! اور جب بیٹھتا بھی ہے تو ادھورا کام بیٹے کے سر پر پٹک کر کہیں چل دیتا ہے۔'' یہی لوگوں کی شکایت ہے۔ وہ ذرا کھرا آدمی ہے، صاف صاف بات کرنا جانتا ہے۔ اسی لیے گاہک کم آتے ہیں۔ وہ چھوکرا رگھو پہلے رسول میاں کے یہاں ہی نوکر تھا، آج کل مرمت کی دکان کھول کر مالا مال ہو گیا ہے۔ پر رسول میاں کی دنیا جیسی تھی، آج بھی ویسی ہی ہے۔

آج سے دس گیارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں اسٹوو مرمت کرانے رسول مستری کے یہاں گیا۔ اِسٹوو کھول کر وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر دیہاتی نے آ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ''گہنا تو نہیں چھوڑتا ہے... کہتا ہے، اور سود لاؤ...''

سنتے ہی رسول میاں کام چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ٹوکا، ''پھر اسٹوو؟''

''کل ہو گا۔''

''تو میں اسٹوو لے جاتا ہوں،'' میں نے ذرا چڑ کر کہا۔

''لے جاؤ جی!'' غلام رسول نے کڑک کر جواب دیا۔ ''یہاں کسی کی عزت پر پڑی ہے اور کسی کو کام کی سوجھی ہے۔ بیچارے کی بیٹی کا آج رات گونا ہے۔ گہنا گروی پڑا ہے۔ مہاجن چھوڑتا

نہیں...''

میں اپنا اسٹوو لے کر جی ہی جی میں یہ فیصلہ کر کے واپس ہوا کہ پھر کبھی اس کی دکان میں نہیں آؤں گا، اور نہ ہی اپنے دوستوں کو آنے دوں گا۔

پر آج رسول میاں کو اچھی طرح پہچان چکا ہوں۔ بچپن کی اس قسم پر آج بھی مجھے دکھ ہے۔ سائیکل مرمت کے لیے دی ہے۔ پندرہ دنوں سے لوٹ رہا ہوں، رسول میاں سے ملاقات نہیں ہوتی۔ رحیم کہتا ہے کہ ابھی سے ٹھیک ہوگی۔ کسی دن اتفاق سے ملاقات بھی ہوتی ہے تو دیکھتا ہوں کہ ان کے ذمے سائیکل مرمت کے علاوہ بھی بہت کام ہیں۔ ''پھٹے حال عورتوں کو کپڑا دلانا ہے۔ سات دن سے لوٹ رہی ہیں۔ بھیڑ میں دم گھٹوا کر، قطار میں کھڑی ہو کر بھی خالی ہاتھ لوٹ آتی ہیں۔''

کسی دن سنتا ہوں: گاؤں میں ملیریا زور سے پھیلا ہوا ہے۔ کونین ملتا نہیں، اسی لیے مستری کئی جڑی بوٹیوں کا کاڑھا بنا کر آج گاؤں بھر میں بانٹ رہے ہیں۔

روز چپ چاپ لوٹ آتا ہوں اور روز برگد کے تنے پر لٹکتی تختی کو پڑھ لیتا ہوں: 'رسول مستری۔ یہاں مرمت ہوتا ہے۔' کھلی سے کسی شیطان لڑکے نے جو لکھ دیا ہے: 'یہاں آدمی کی بھی مرمت ہوتی ہے'، جی ہی جی میں اس کی تائید کرتے ہوئے بھول جاتا ہوں کہ سائیکل کے بنا مجھے بڑی تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔

❁❁

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

رومانس سے خالی پریم کہانی کی تمہید

آج وہ 'ہلدی چڑیا' پھر آئی؟ برسات بھر یہ روز اسی طرح وقت بے وقت آئے گی اور کسی پیڑ کی ڈالی پر بھیگتی ہوئی یا پنکھ سکھاتی ہوئی سریلی آواز میں ایک لمبی تان دہرائے گی۔ سنسکرت اشلوک کی کڑی۔ صاف، ہو بہو!... پتا نہیں کیا بولتی ہے۔ پوترا کو تعجب ہوتا ہے، یہاں کے لوگ اس پنچھی کا نام نہیں جانتے۔ پوچھنے پر منھ بدکا کر کہیں گے: ''پتا نہیں کیا نام ہے!'' 'ہلدی چڑیا' نام پوترا نے ہی گڑھ لیا ہے۔

یہی ایک پکھیرو ہے جو اس کے دیش میں نہیں ہوتا۔ یا ہوتا بھی ہو تو پوترا نے کبھی نہیں دیکھا۔ سچ مچ اس 'دیش' میں کچھ بھی ایسا نہیں جو پوترا کے 'دیش' میں نہیں تھا۔ پیڑ، پھل پھول، فصل، جانور، پنچھی... صرف اس 'ہلدے پنچھی' کو چھوڑ کر... ماچھ راگا کو یہاں کے لوگ مچھ لوکنی کہتے ہیں۔ پوترا کے گاؤں کا یعنی 'پوربی بنگال' کا 'پیچا' ہی یہاں کا 'الو' ہے، یہ اس نے یہاں آ کر جانا۔ الو کو وہ بھالو کے جیسا کوئی جانور سمجھتی تھی۔ لوگوں کے ناموں میں 'لال'، 'پرساد'، 'جھا' اور 'نارائن' لگا دینے سے کیا ہوتا ہے، چہرے تو نہیں بدلتے! لیکن اس 'کالونی' (نئی نگر گاؤں) کے سو میں سے ننانوے لوگ ایسے ہیں جو پوترا کی اس رائے سے متفق نہیں۔ وہ کہیں گے، ''کی (کیا) مشکل دیدی ٹھاکرن... پرچھاد (پرساد) ٹائٹل اپنے گاؤں کے کسی آدمی کے نام میں لگا دو، دیکھو گی، فِٹ ہی نہیں ہوگا۔ نام کے ماقف چہرہ بھی ہونا ہوگا دیدی ٹھاک... کی مشکل!''

Scanned with CamScanner

گاؤں بسنے کے بعد ایک دن پوترا گاؤں کے لوگوں کو سمجھا رہی تھی، ''ہم لوگوں کے بھاگ اچھے ہیں کہ ہمیں اس ضلعے میں بسایا گیا۔ یہاں دھان اور پاٹ (پٹ سن) کی کھیتی ہوتی ہے۔ ہم بھی اپنے 'دیش' میں دھان اور پاٹ کی کھیتی کرتے تھے۔ یہاں کے لوگ بھی مچھلی بھات کھاتے ہیں۔ گاؤں گھر، باغ بغیچے، پوکھرے اور ندی، سب کچھ اپنے ہی دیش جیسا۔۔۔''

سوکھی ہوئی کایا والے ہرلال ساہا نے تیکھی آواز میں مخالفت کی، ''سے ہوتی پارے نا! ایسا ہونا ناممکن ہے! کہاں اپنا دیش اور اپنے دیش کی مٹی اور اپنے دیش کا چاول اور کہاں اس عجوبہ دیش کی عجوبہ چیزیں۔۔۔ پتا نہیں تم نے کیا دیکھا ہے دیدی ٹھاکرن! یہاں کی مچھی میں کیا وہی ذائقہ ہے جو پدما ندی کی ہلسا مچھلی میں۔۔۔؟''

ہرلال ساہا کی بات پر سبھی اس طرح مسکرائے مانو وہ سب کے دل کی بات کر رہا ہو۔

گاؤں میں ٹیوب ویل گاڑنے کے لیے سرکاری آدمی آیا ہے۔ وہ بنگال سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے لیے کئی گاؤں بسا چکا ہے، یعنی گاؤوں میں ٹیوب ویل لگوا چکا ہے۔ اس لیے 'پوربی بنگال' کی بولی' کچھ کچھ' سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہرلال ساہا نے آنکھ دبا کر اپنی بات بند کر دی۔ سبھی چپ ہو گئے۔

لیکن وہ سرکاری آدمی چپ نہیں رہا۔ اس نے مسکرا کر سیدھے پوترا سے پوچھا تھا، ''یہ آپ لوگ 'اپنا دیش' 'اپنا دیش' کیا بولتے ہیں؟ دیش کا کیا مطلب؟ کیا معنی؟''

''۔۔۔دیش کے معنی اور کیا ہوں گے۔۔۔ دیش کے معنی دیش۔۔۔'' ہری دھن موڈل کو اس ٹیوب ویل گاڑنے والے نچلے سرکاری اہلکار سے نہ جانے کیوں چڑ ہے۔۔۔ لڑکیاں دیکھتے ہی بات کرنے کے لیے اس کی جیبھ 'سڑ سڑاتی' رہتی ہے۔ مانو ہر بات کے معنی ڈھونڈتا ہے بیٹا!

''دیش کے معنی دیش۔۔۔ تو کیا ہندوستان اپنا دیش نہیں ہے؟ آپ لوگوں کا دیش نہیں ہے؟''

''۔۔۔ہندوستان کیسے 'اپنا دیش' ہوگا؟''

کالا چاند گھوش ہوشیار نوجوان ہے۔ اس نے اپنی بھاری اور موٹی ہنسی سے بات کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ ''ہی ہی ہی! ارے بابو، آپ دیش کا جو معنی بوجھتا ہے، اصل میں ہم لوگوں کا دیش کا معنی وہ نہیں ہے۔ دیش کا معنی؟ جیسے بنگلہ دیش، بہار دیش، اڑیسہ دیش! ویسے مافق۔ ہی ہی۔''

''تو پردیش بولیے، صوبہ کہیے۔''

چھدام داس سرکاری اہلکاروں سے باتیں کرنے کا موقع ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اس نے دانت نپور کر کہا،''اوورسیئر بابو، دیش بولیے، پردیش بولیے یا صوبہ کہیے، اب تو جو ہے سو بس یہی نوبی نگر گرام (گاؤں)!''

سرکاری آدمی نہ جانے کیوں ٹھٹھا مار کر ہنس پڑا تھا۔ چھدام داس کی عقلمندی دیکھ کر پوترا مسکرائی تھی اور اس ٹیوب ویل فٹر صاحب کی نظر شروع سے آخر تک پوترا پر ہی گڑی ہوئی تھی۔ جیب سے بیڑی نکال کر بانٹنے کے بعد بھی کے منھ کے سامنے باری باری سے لائٹر جلا کر بیڑی سلگا دی فٹر صاحب نے۔

وہ اپنے کام پر چلا گیا۔ چھدام داس نے کہا،'' دیکھا؟ فٹر صاحب کو اوورسیئر بابو کہہ دینے سے کتنا خوش ہوا!''

سبھی اپنے دیش کی ہنسی ہنسے تھے، جی کھول کر ایک ساتھ! لیکن پوترا بولی تھی،'' جو بھی کہو، وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ دیش معنی ہندوستان، مطلب بھارت۔''

''دیدی ٹھاکرن، دیش... کیسے دیش مانیں ہندوستان کو؟ ہم لوگوں کے اس گاؤں کا نام ہے نوبی نگر، اور یہاں کے لوگ کہتے ہیں پاکستانی ٹولہ...!'' کالا چاند گھوش کی ماں واجب بات کہتی ہے!

ادھیڑ گوپال دا بہت کم بولنے والا آدمی ہے۔ میٹرک تک پڑھا ہوا ہے اور گاؤں میں قائم ہونے والے اسکول کا امیدوار ماسٹر ہے۔ اس نے ٹوکا تھا،'' کالا کی ماں! سائن بورڈ لگنے دو گاؤں کے باہر۔ اسکول چالو ہونے دو ایک بار۔ تب دیکھنا، پھر کیسے لوگ پاکستانی ٹولہ کہتے ہیں ہمارے اس نوبی نگر کو!''

چھدام داس اپنے پیٹ سے بنیان کو تھوڑا اوپر سرکا کر پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا تھا، ''اصل چیز ہے یہ سالا پیٹ! اِی بیٹا پیٹ کا واسطے جو کچھ سننا پڑے، کہنا پڑے، سب قبول!''

ہلدی چریا پھر بولی...

Scanned with CamScanner

نو بی نگر نہیں، نبین نگر!

نہ نو بین نگر، نہ نبین نگر۔ اس گاؤں کا صحیح نام ہے نبی نگر۔ آبادکاری کے صوبائی نائب وزیر محمد اسمٰعیل نبی نے اس گاؤں کی بنیاد رکھے جانے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: "یہ سب اس باپو کی عظمت ہے کہ میرے جیسے ادنیٰ خدمتگار، جنتا کے اس چھوٹے سے خادم کے نام پر آج نگر بسایا جا رہا ہے..."

اس کے بعد ڈپٹی منسٹر نبی صاحب نے ویرانے کو بسانے اور بسے کو اجاڑنے کی بات پر ایک شعر پڑھا تھا۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگوں نے جس کا کوئی مطلب نہیں سمجھا۔ لیکن تالیاں خوب زور سے بجائی تھیں...

بسے کو اجاڑنا؟

پوترا اس نئے بسے ہوئے گاؤں نبی نگر کی ایک جھونپڑی میں لیٹی ہوئی اپنے اجڑے گاؤں میں پہنچ جاتی ہے — ضلع میمن سنگھ کے جمعہ پور گاؤں میں۔

پوترا کے پتا، جمعہ پور گاؤں کے واحد ہندو زمیندار۔ اکیلا برہمن خاندان، واحد اونچی ذات کا ہندو خاندان۔ گاؤں میں تین اور زمیندار تھے۔ تینوں مسلمان۔ مسلمانوں کی تیرہ ٹولی اور ہندوؤں کے سب ملا کر ڈھائی محلے۔ گاؤں کے بھی لوگ — ہندو مسلمان — پوترا کے باپ کو 'پتا ٹھاکر' کہتے تھے۔ اور پوترا کی حویلی کا نام مشہور تھا: 'ٹھاکر باڑی'۔

کاشی ناتھ چٹرجی — پوترا کے پتا — بنگلہ اور سنسکرت کے ہی پنڈت نہیں، اردو اور فارسی کے بھی اچھے جانکار تھے۔ جمعہ پور کی 'مجلس' میں دور دور کے مولوی اور ملّے آتے تھے اور 'پتا ٹھاکر' ان لوگوں سے گھنٹوں اسلام کی باریک باتوں پر بحث کرتے تھے۔ گھر میں جب کسی بات پر انھیں ترس آتا تو وہ عام طور سے فارسی کا ہی کوئی شعر پڑھتے تھے۔ اس وقت سارے گھر میں ایک دبی ہوئی ہنسی کھیل جاتی۔ لیکن جب شعر کے معنی ٹھیٹھ بنگلہ میں سنایا جاتا تو طنز کے تیر سے گھائل شکار چھٹپٹا کر رہ جاتا۔ ماں چڑ کر کہتی: "تم ہر بات میں 'کلمہ' پڑھ کر جیتنا چاہتے ہو!"

... کلمہ... قادر... قاسم... قاسم نہیں، قاسم دادا... قاسم دادا نہیں، قصائی!

... قادر ابا کے گھر، ہر سال، ٹھاکر باڑی سے دو بار سوغات بھیجے جاتے — عید اور درگا پوجا

میں ۔اپنے پتا کے ساتھ پوترا بچپن سے ہی عید کے موقعے پر 'قادر ابا' کی حویلی میں جاتی ۔قاسم، شمیم، شبنم—قادر ابا کے سبھی بچے—درگا پوجا میں 'ٹھاکر باڑی' آتے تھے۔

... لیکن اُس بار عید کے دن پوترا نہیں گئی ۔قاسم دادا خود آئے ۔پوترا نے ہنس کر کہا تھا،''عید مبارک قاسم دادا!''

قاسم دادا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا تھا،''چاند تو میں نے ابھی دیکھا ہے۔''

''قاسم دادا! کیا بک رہے ہو؟''

''تمی اَمار چاند!...''

''لیکن قاسم دادا، چاند تو آکاش میں رہتا ہے۔''

اسی بار پوترا نے اپنے پتا سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا،''بابا، یہ قاسم دادا بڑا افاضل... معنی بدمعاش ہو گیا ہے۔''

بابا ان دنوں گاندھی جی کی طرح ہفتے میں ایک دن مَون برت رکھتے تھے ۔انھوں نے لکھ کر جواب دیا تھا، کاغذ کے ایک ٹکڑے پر:''بدمعاش ہو یا شیطان، پریم سے سب کو جیتا جا سکتا ہے۔ محبت کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے! گاندھی جی نے کہا ہے...''

... اس کے بعد، ایک رات کو اچانک تباہی کا مہا کھیل شروع ہوا... آگ... مار... کاٹ... بندوقوں کی آوازیں... عید کا جشن... پھلجھڑی... بندے ماترم... گاندھی جی کی جے—پوترا کے بابا کی آواز ٹھاکر باڑی میں منڈلا رہی ہے... آگ کی لپلپاتی ہوئی لپٹوں میں پوترا نے دیکھا تھا، قاسم ڈھونڈ رہا ہے۔''کوتھائے؟ کہاں ہے وہ؟''

... پھر، پوترا ٹھاکر باڑی سے نکل کر کیسے باگدی پاڑا میں پہنچ گئی، وہ نہیں جانتی ۔اس کی آنکھیں کھلی تھیں ہندوستان کے ایک شرنارتھی کیمپ میں، کٹیہار اسٹیشن پر۔ ہوش میں آتے ہی پوترا نے پوچھا تھا،''بابا کہاں ہیں؟ ماں کہاں؟ اور لوگ کہاں ہیں؟...'' کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا ۔ایک لمبی سانس لے کر وہ چپ ہو گئی ۔تبھی سے وہ چپ ہے ۔کبھی اپنے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں کی، بچھڑے ہوئے اپنوں کی چرچا کرتے ہیں ۔وہ منھ بدکا کر مسکراتی رہتی ہے، یعنی — کیا بیوقوفی کی باتیں کرتے رہتے ہیں لوگ!

Scanned with CamScanner

... ضلع میمن سنگھ، گاؤں جمعہ پور!

نبی نگر کالونی کے سو میں پچھتر باشندے ایک ہی ضلعے اور گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ پوترا کو چھوڑ کر بھی پسماندہ ذات کے لوگ ہیں — ست گوپ، کاندو، نم شودر، کیورت اور باگوی۔

یوگیش داس باریسال سے آیا ہے۔ شاردا برمن اور ماکھن تر پورہ ضلعے کے باشندے تھے۔ بیتیا شرنارتھی کیمپ میں جمعہ پور والوں کے ساتھ آملے ان کے خاندان۔

... تین چار شرنارتھی کیمپوں میں، کئی برسوں تک، جمعہ پور والے پوترا کے سہارے ہی ٹکے رہے۔ جمعہ پور کا ایک بچہ بھی جماعت سے بچھڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتا۔ اور پوترا کی وجہ سے ہی انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی — کہیں بھی۔ جمعہ پور والوں کی سبھی کمی بیشی کی شکایت کی شنوائی سب سے پہلے ہوتی... دیدی ٹھاکرن کی اجازت کے بنا نہ تو کوئی راشن کا ایک دانہ چھو سکتا تھا اور نہ سرکاری امداد کا ایک پیسہ۔ وہ کہتے، ''جانے دیدی ٹھاکرن!''

... اور ہر جگہ پوترا کو ایک جوڑی آنکھیں گھورتی رہتیں۔ ان آنکھوں سے قاسم جھانک کر کہتا، ''یہ ہے میرا چاند!'' پوترا اشتی، قاسم کہہ رہا ہے: ''تم جو کہوگی، کرنے کو تیار ہوں۔ آگ میں کودنے کہو، پانی میں ڈوبنے کہو!''

پوترا حکم دیتی: ''چاول، دودھ، دوا، بسکٹ، کپڑے جلدی بھیجو!... کیمپ سپروائزر کا تبادلہ کرو!... ریلیف کلرک کو برخاست کرو!...'' قاسم کہتا، ''جو حکم! جیسی مرضی! لیکن، لیکن... میری عرضی؟... یعنی کم سے کم ایک بوسہ بھی نہیں؟''

ایسے سوالوں پر پوترا منھ بنا کر مسکرا دیتی — یعنی، ''نان سنس!''... لیکن بیتیا کیمپ کے انسپکٹر کی آنکھوں سے جھانکتا ہوا قاسم بے قابو ہو کر ٹوٹ پڑا تھا — چاند کو پکڑنے۔

پوترا منھ بدکا کر ہنستی رہی اور ایک درجن جمعہ پوری شرنارتھیوں نے مل کر انسپکٹر کا سر مونڈ دیا، منھ پر کالک اور چونا پوت کر کیمپ سے باہر نکال دیا تھا — ڈھول باجے کے ساتھ۔

اس کے بعد سب سے بڑے افسر کی آنکھوں میں قاسم کی جھلک پاتے ہی پوترا نے حکم دیا تھا، ''جمعہ پوری شرنارتھیوں کو ایسی جگہ بھیجو جہاں وہ مچھلی بھات پیٹ بھر کر کھا سکیں، دھان اُپجا سکیں، پاٹ (پٹ سن) کی کھیتی کر سکیں۔''

سب سے بڑے افسر نے کہا، ''جو حکم! ابھی جمعہ پوری پورنیا جائیں گے۔'' آنکھوں کی کھڑکی سے قاسم نے جھانک کر کہا، ''لیکن تم کو میرے ساتھ جانا ہوگا۔ میرے دل میں ایک ویران جگہ ہے، تم اپنا گھر وہیں باندھو۔۔۔'' پوترا منھ بنا کر ہنستی رہی، گاڑی پورنیا کی طرف چلی، ابھی جمعہ پوری شرنارتھیوں کو لے کر۔

اور پورنیا پہنچ کر آر او صاحب کے پی اے، یعنی ری ہیبلی ٹیشن افسر کے پرسنل اسسٹنٹ کی آنکھوں میں دیکھا — قاسم براجمان ہے، پہلے سے ہی!

اس لیے سب سے اچھی جگہ اور اچھے علاقے میں جمعہ پور والوں کی 'کالونی' بسائی گئی — جہاں کی دھرتی زرخیز ہے، جہاں کی ندیوں میں ہر قسم کی مچھلیاں ہیں۔ گوڈیر گاؤں کے دکھنی علاقے کی غیر مزروعہ زمین پر کالونی کی نیو خود آر او صاحب نے ڈالی۔ اس دن قاسم آر او کی آنکھوں میں تھا— پی اے نے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کی۔

ایک سرکاری لفافہ ہاتھ میں لے کر گوپال دا چلا رہے ہیں، ''سبھی بھائی بہن سن لیجیے۔ منظور ہو گیا! ہو گیا منظور! اسکول ہو گیا!''

پوترا کو تعجب ہوتا ہے، بہت کم بولنے والا، کم سننے والا اور کم سونے والا گوپال دا ادھر اتنا بک بک کیوں کرنے لگا ہے؟ اسکول تو ہونا ہی تھا۔ اس طرح چلانے کی کیا ضرورت؟

اس نے گوپال دا کے سارے جوش کو اچانک بجھا دیا مانو۔ ''گوپال دا! اسکول تو ہوا، مگر آپ کے پختہ سائن بورڈ کا کیا ہوا؟ اسکول کا نام پاکستانی اسکول تو نہیں رکھ دیں گے حاکم لوگ؟''

گوپال دا نے اس بار دھیان سے، ایک ایک لفظ پر زور دے کر چٹھی پڑھنا شروع کیا:

''گوڈیر گاؤں کے پاکستانی ٹولہ میں اسکول کھولنے کی تجویز پر۔۔۔''

اس سے آگے وہ نہیں پڑھ سکا۔ اس کا گلا بھر آیا۔ ''سچ سچ، یہ پاکستانی ٹولہ نام اب کبھی نہیں مٹے گا؟۔۔۔ گوڈیر۔۔۔ گوڈیر۔۔۔ چولھے میں جائے یہ گوڈیر گاؤں!''

''نہیں گوپال دا! ایسا نہیں کہتے۔ سبھی گاؤں پھولیں پھلیں،'' پوترا نے سمجھایا۔ ''گوڈیر گاؤں کے ساتھ آپ کا نوبین نگر بھی چولھے میں چلا جائے گا۔''

کالا چاند گھوش اب تک چپ تھا۔ اس کو اپنی کیرتن پارٹی میں دلچسپی ہے، اسکول کھلے یا گاؤں کا نام بدلے۔ اس نے گوپال دا کی طرف دیکھ کر گانا شروع کیا:

''تو بین نگرنبی بابا

تو بی نگر بولو

پاکستانی ٹولا رنا ے اسکول

کارجسٹر کھولو

بولو ہری بولو!''

سبھی ہنس پڑے اور گوپال دا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ پوترا نے آنکھوں سے ہی کالا چاند کو ڈانٹا۔

گوڈیر گاؤں۔

پندرہ گھر میتھلی برہمن، چار خاندان راجپوتوں کے — یہ ہوا گوڈیر گاؤں کا بابو ٹولہ۔ بیس گھر گوالے، آٹھ کیورت، تیرہ گھر گوڑھی (مچھلی پکڑنے والی ذات)۔ گوڈیر گاؤں کا اصل نام اسی گوڑھی ٹولہ سے ہوا۔ جہاں گوڑھی لوگ رہتے ہوں — گوڑھی ہار، گوڑھی ہار سے ہوا گوڈیر۔ گوڈیر گاؤں کا سب سے سکھی اور خوشحال گھرانہ گوڑھی کا ہی ہے... تالیور گوڑھی کے یہاں روپیہ گندھ کرتا ہے، یعنی سوکھی مچھلیوں کی طرح جمے ہوئے پیسے سے بو نکلتی ہے۔

برہمن ٹولی میں چودھری خاندان اور راجپوتوں میں گن گنھ کر بس ایک ہی ایسا گھر ہے جن کے پاس تھوڑی زمین ہے۔ باقی لوگ جمانی، پہلوانی، گاڑی بانی، گھوڑا لدائی، دکان، نوکری، کھیت مزدوری اور چوری کر کے گزارہ کرتے ہیں۔

'کالونی' میں اسکول کھلنے کی خبر گوڈیر گاؤں کے سبھی ٹولوں میں تُرنت پہنچ گئی۔ تالیور گوڑھی کے دربار میں منھ لگوں اور چاپلوسوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ دھانک ٹولے کا موہنا دفعدار چونکہ سرکاری آدمی ہے، اس لیے وہ غیر قانونی باتیں نہیں کرتا کبھی۔ اس نے کہا، ''گاؤں کے لوگ دس سال سے چلا رہے ہیں: اسکول، اسکول، لیکن اسکول کے نام پر کچھ نہیں ہوا اب تک۔ اُدھر دیکھیے، پاکستھنیاں سب کو آئے چھ مہینے بھی نہیں ہوئے ہیں، مڈل اسکول کھولنے کا آرڈر پاس ہو گیا!''

Scanned with CamScanner

سبھی نے ایک ساتھ حیرت سے کہا، ''کیا... ؟اسکول؟ پاکستھنیاں ٹولہ میں؟''

اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ سبھی کی آنکھیں بزرگ تالیور گوڑھی پر جا ٹکیں۔ تالیور گوڑھی نے ہاتھ کی سمرنی (تسبیح) کو جھولے میں رکھ دیا اور صاف دلی سے کہا، ''جو سچ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہتے ہیں، ان کے لیے سرکار ضرور اسکول کھولے گی۔ اس میں تعجب کرنے کی کیا بات ہے؟''

''واجب بات! واجب بات!''

تالیور گوڑھی کی واجب بات سن کر سبھی کے چہرے مرجھا گئے... آج بڈھا کھکھوایا ہوا ہے شاید۔ آج کوئی کام بننے کی امید نہیں۔

تالیور گوڑھی نے لوگوں کے مرجھائے ہوئے چہروں کو پھر کھلا دیا۔ بولا، ''بھیا، تم لوگ کہاں ہو؟ پاکستھنیاں سب بھلا بسے گا؟ بسنے کا ہوتا تو یہ جہاں بسے ہوئے تھے، وہاں سے بھاگتے ہی کیوں؟''

''واجب بات! واجب بات!''

دو سوتیلے بھائی، جے رام سنگھ اور رام جے سنگھ، آج کل تالیور گوڑھی کے بنا پیسوں کے لٹھیت ہیں۔ جے رام سنگھ بولا، ''سالا جہاں جہاں کالونی بسایا وہاں جا کر دیکھیے۔ ای بنگلیا دیکھنے میں 'ربولیا' (بے زبان) لگتے ہیں، لیکن بھیتر ے بھیتر بڑے استاد ہوتے ہیں!''

''راتوں رات سیمنٹ، لوہا، لکڑ بیچ کر گاؤں کے گاؤں بھاگ گئے۔ بیسوا میں، مہی چندا میں۔ سب جگہ یہی حال ہوا کالونی کا۔''

''کام چور ہیں سب۔''

''فیشن دیکھا ہے؟''

''سالا، زنانہ بھی کھڑاؤں پہن کر چلے گی۔ دھرتی پر پیر نہیں دے گی کبھی۔''

''دھرتی پر پیر کیسے دے؟ سرکار بہادر کا روپیہ ہے، گھر کی مرغی ہے، چاہے دال بناؤ...''

پنڈت رام چندر چودھری اب تک چپ تھے۔ کھینی (تمباکو) تھوکتے ہوئے بولے، ''اگر اسکول کا روپیہ ہضم کر کے پاکستھنیاں لوگ نہیں بھاگے تو میرا نام رام چندر چودھری نہیں، کگر چندر

چودھری کہنا۔ جتنے نٹھلّے اور کام چور لوگ تھے، سبھی ریفوجی (ریفیوجی) ہو گئے ہیں۔ مگر پنجابی ریفوجی ایسے نہیں۔ پٹنہ میں جمیشن (ایگزیبیشن) روڈ کے بغل میں، لالی سین کے سامنے ایک پنجابی ریفوجی کی پکوڑوں کی دکان تھی۔ جب ہم لوگ اپیل کرنے کے لیے ہائی کوٹھ (ہائی کورٹ) گئے تھے تو بوڑھا بوڑھی دن رات پکوڑے اور گھگھنی بیچتے تھے۔ اور جب کیس کا ججمنٹ سننے گئے تو دیکھا کہ نہ پکوڑے ہیں نہ پکوڑوں کی دکان، اور نہ بوڑھا ہے، نہ بوڑھی ہے...!''

''کہاں چلے گئے؟ سرکاری قرضہ کھا کر بھاگ گئے؟''

''نہیں بھائی، وہ کیوں بھاگیں گے؟ بھاگیں یہ بنگالی ریفوجی۔ اب کیا بتلاویں؟ کہاں تو ٹین کی ٹوٹی ہوئی چھتی اور کہاں تین منزلہ بلڈنگ...!''

''بلڈنگ کیا؟''

موہنا دفعدار نے پوچھنے والے کو بلڈنگ کے معنی سمجھا دیے اور بات کے سرے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''چودھری جی ٹھیک کہتے ہیں۔ محنت کے نام سے ان کا بھوت بھاگتا ہے۔ دن بھر ایک جگہ غول بنا کر بیٹھیں گے اور بیڑی دھکیں گے اور ہمیشہ کچر پچر کر کے آپس میں بحث کریں گے۔ سبھی کو 'سالا ربیٹا سالا' کہیں گے...''

چودھری رام چندر کو موہنا دفعدار کی یہ عادت اچھی نہیں لگتی — بات کے بیچ میں بولنے کی ہمت! وہ جھنجھلا کر بولے، ''سالا ربیٹا سالا کہتا ہے تو کون سی بڑی بات کہتا ہے؟ سالا تو جیسے بہار میں، ویسے بنگال میں۔ اجی کالونی کا چھوٹا چھوٹا بچہ بھی ہم لوگوں کے لڑکوں کو کہتا ہے، اسبو، جونگلی، کھوٹا...''

''اسبو معنی؟''

موہنا دفعدار خود 'اسبو' کے معنی نہیں جانتا، کیسے سمجھائے مطلب پوچھنے والے کو؟

رام جے سنگھ بولا، ''مگر سارے کالونی میں ایک ہی زنانہ ایسی ہے کہ دیکھیے تو بس دیکھتے ہی رہ جایئے ایک ٹک!''

اس بار موہنا دفعدار ایک سرکاری بات بولا، ''ارے ہاں! وہ عورت نہیں، چابی ہے چابی! سبھی حاکم سے منھا منھی بولتی ہے اور سبھی حاکم لوگ گم ہو جاتے ہیں... داروغہ صاحب کہہ رہے تھے، اس

Scanned with CamScanner

پر نظر رکھنا۔شاید کومنس (کمیونسٹ) ہے...''

''کومنس کیا؟''

تالیور گوڑھی نے کہا،''کومنس' کے معنی بھی نہیں جانتے؟ اجی، جس کو ہندی میں کمسین کہتے ہیں، اسی کو اردو میں کومنس کہتے ہیں۔''

موہنا نے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔''نہیں نہیں...''

اس بار پنڈت رام چندر چودھری چڑ گئے۔''موہنا، تم ایک سال کی دفعداری میں ہی تالیور بھائی کی بات کو نہیں کاٹ سکتے۔ایک تم ہی ہو معنی سمجھنے والے اس گاؤں میں؟''

موہنا بولا،''کومنس کا معنی کمسین ہے۔مگر ایسا کمسین...''

موہنا کو کسی نے بولنے نہیں دیا۔

سامنے کی سڑک سے نبی نگر کالونی کے پھیری کرنے والے لڑکوں کا ایک جھنڈ گزرا۔ گلے اور پیٹھ پر ٹین کے کنستر لٹکائے۔ بسکٹ، لیم جوس، گھا کی پھیری کرنے کے لیے ٹرین اور بس سے دور دور تک جاتے ہیں۔ پھر رات کو دس گیارہ بجے لوٹیں گے۔

پوترا 'آفس گھر' کے دکھن میں کٹھل کے چھوٹے پیڑ کے پاس کھڑی ہے... نہ جانے کہاں دیکھ رہی ہے! نہ جانے کیا دیکھ رہی ہے!

گوپال دا نے پوترا کا دھیان بٹایا۔'' کی دیکھ سین؟ اسکول کی جگہ دیکھ رہی ہیں؟ اور دیکھنا نہیں ہوگا۔ ہم لوگوں کے نوبین نگر کے اسکول کا سائٹ۔ ایکدم پھسٹ کلاس...''

''نہیں گوپال ماسٹر! میں کچھ اور ہی دیکھ رہی ہوں۔ آپ کو بھی دکھلاتی ہوں ابھی۔ سبھی جمعہ پور والوں کو بلا کر دکھلانا ہوگا۔''

''کیا؟''

پوترا ہنسی۔ بولی،''ادھر آیئے! یہاں کھڑے ہویئے... اب، دیکھیے۔ وہاں، اُس... اُدھر نہیں سیدھے، دور اس ٹیڑھے پیڑ کو۔ دیکھ رہے ہیں نا؟ اب اس سے بھی دور جو کالا جنگل دکھائی پڑ رہا ہے... اور ٹائل کھپریل کے وہ گھر... کھجور کے دونوں پیڑوں کے اس پار۔ دیکھا؟... اچھا،

Scanned with CamScanner

بولیے تو گوپال ماسٹر۔ ہم لوگوں کے جمعہ پور گاؤں سے اچھی مدین پور ہاٹ جیسا دکھائی پڑتا تھا۔۔۔ مان لیجیے آپ جمعہ پور کے ٹھاکر پوکھرے پر پورب منہ کھڑے ہیں اور دور دکھائی پڑ رہا ہے اچھی مدین پور ہاٹ کا کالا جنگل۔ وہ پیڑ، ٹھیک ایسا ہی ٹیڑھا پیڑ اس راستے میں بھی تھا۔ اور کھجور کے جڑواں پیڑ۔۔۔ آپ کو یاد ہے؟۔۔۔ دیکھیے تو؟ بولیے تو؟''

گوپال دا نے آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھ کر دور تک نظر دوڑائی اور پھر اپنی آنکھوں کو رگڑا۔ پھر دیکھتا ہی رہا۔''اے کی لیلا؟'' (یہ کیا معجزہ ہے؟)

''میں کل سے ہی دیکھ کر حیران ہوں۔''

گوپال دا ایک ڈیڑھ منٹ چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا، پھر نہ جانے کیسے سب کچھ بھول گیا۔ اسے لگا، وہ جمعہ پور گاؤں کے ٹھاکر پوکھرے پر کھڑا ہو کر اچھی مدین پور ہاٹ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پیٹھ کی طرف ہے ٹھاکر باڑی — کاشی ناتھ چٹرجی کی ڈیوڑھی۔۔۔ گوپال دا ابھی فوراً پاٹھ شالا سے لوٹا ہے۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں سیکرٹری (پتا ٹھاکر) سے۔ باگدی پاڑا میں پاٹھ شالا کھولنے کی بات ہو رہی ہے اور قادر زمیندار کا بیٹا قاسم مخالفت کر رہا ہے، لوگوں کو بھڑکا رہا ہے۔ پتا ٹھاکر اچھی مدین پور گئے ہیں، بیل گاڑی پر۔۔۔ ٹیڑھے پیڑ کے پاس بیل گاڑی دیکھ کر گوپال دا کا کلیجہ دھڑک اٹھا تھا — پتا نہیں کمیٹی میں کس کی جیت ہوئی؟ پتا ٹھاکر کی کوئی تجویز کبھی رد نہیں ہوئی۔ اس بار دیکھا جائے۔ ٹھاکر باڑی کے چبوترے پر کھڑی پوترا پکار رہی ہے:''گوپال ماسٹر، بابا اب آ ہی رہے ہیں۔ یہاں آ کر بیٹھیے نا۔۔۔''

''گوپال ماسٹر، کی ہولو؟'' (کیا ہوا؟)

''پاٹھ شالا نہیں کھولنے دیا تو۔۔۔ آمی ہانگار اسٹرائیک کور بو۔۔۔'' (میں بھوک ہڑتال کروں گا)!''

''۔۔۔لیکن اسکول کی منظوری تو مل گئی ہے۔ کل مکان بنانے والا ٹھیکیدار بھی آ رہا ہے۔''

'کوتھائے (کہاں)؟۔۔۔ سالا ربیٹا سالا قادر کا بیٹا، وہ سالا ظالم، ظالم۔۔۔ آمی ہانگار۔۔۔!''

''کیا بک رہے ہو ماسٹر؟''

''میں بک رہا ہوں؟''

Scanned with CamScanner

اچانک گوپال ماسٹر کو کسی نے نبین نگر کالونی کے آفس گھر کے سامنے لاکر پٹک دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ''اے کی دیکھالے دیدی ٹھاکرن؟ ... یہ کیا دکھلایا تم نے؟ یہ کیسے ہوا؟''

''سوچتی ہوں، گاؤں کا رخ اس طرف کردیا جائے۔ جیسا جمعہ پور میں تھا۔''

''البت (ضرور) بدل دیجیے!''

گوپال ماسٹر کو اتنی بڑی بات مل گئی اور وہ چپ چاپ کھڑا رہے گا؟ اس نے جمعہ پور کے ایک ایک باسی کو نام لے لے کر پکارنا شروع کیا، ''آ کر یہاں دیکھو... اپنی جننی جنم بھومی کی ایک جھلک۔ دیکھو!''

چھدام داس، کالا چاند گھوش، ہرے رام، ہری دھن، راکھال بشواس، ہرلال ساہا، لکھی کانت سرکار، بھی دوڑے آئے۔ ''بھوت اوت تو نہیں؟''

کھیت کھلیان سے لوٹتے ہوئے اور ہاٹ بازار سے آئے ہوئے لوگوں کو گوپال دا چورستے پر، کالونی کے باہر ہی، چیتاونی دے دیتا ہے: ''ایک عجوبہ چیز! دیدی ٹھاکرن ایک 'مجا' کی چیز دکھلاوے گی... چل! چل!''

پوترا نے کالا چاند سے بھی اسی طرح کھڑا ہونے کو کہا۔ ''ہاں، تم ایک بار آنکھ موند کر سوچو کہ تم جمعہ پور کے ٹھاکر پوکھرے پر کھڑے ہو کر اچھی مدین پور ہاٹ کی طرف دیکھ رہے ہو — سامنے، پورب کی طرف۔ پھر آنکھیں کھولو... لو، آنکھیں بند کرو۔''

کالا چاند ہنسا۔ ''آنکھ موندنے سے کیا ہوگا؟ پیر جو اس 'پرائے دیش' پر ہے!''

''تم موندو بھی! اور جیسا کہا ہے...''

آنکھیں کھول کر کالا چاند نے کچھ دیر تک پورب کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا... اسی جڑواں کھجور کے پیڑ پر چڑھ کر اس نے طوطے کے دو بچوں کو اتارا تھا — رام لکھن کا جوڑا... اچھی مدین پور ہاٹ کا آلو چوپ کھانے کے لیے وہ گھر سے پیسے چرا کر ہاٹ بازار کو بھاگ جاتا تھا... وہ، وہاں جو بگلے اڑ رہے ہیں، وہیں ہے، بی بی دیگھی — مچھلیوں سے بھری ہوئی چھوٹی ندی۔ اسی کے کنارے محرم کا میلہ لگتا ہے۔ جنگل کے اس پار اچھی مدین پور گاؤں ہے۔ جنگل کے پاس وہ... درگاہ

Scanned with CamScanner

ہے۔ اسی جنگل سے ایک دن ہزاروں لوگ جلوس بنا کر نکلے تھے۔۔۔بندے ماترم! بندے ماترم! مہاتما گاندھی کی جے!

پوترا نے ہنس کر پوچھا، ''نعرہ کیوں لگا رہے ہو؟''

کالا چاند نے بھرے گلے سے کہا، ''دیدی ٹھاکرن، اس پرائے دیش میں۔۔۔''

پوترا نے ڈانٹ بتائی، ''پھر 'پرایا دیش' کہتے ہو؟''

''نہیں دیدی ٹھاکرن! یہ تو۔۔۔ سچ سچ جمعہ پور میں ہی ہیں ہم لوگ۔۔۔ جگی دا، آپ نہیں سمجھیے گا۔ بار یسال کی نہیں، جمعہ پور گاؤں کی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں جو— دیکھے جاؤ، دیکھے جاؤ!''

پچیس سال اور اس سے زیادہ عمر والوں نے اس دن بار بار جمعہ پور گاؤں کی تصویر دیکھی— اپنے 'دیش' کی جھلک!

لکھی کانت سرکار منصور صاحب کی دکان میں نوکری کرتا تھا۔ روز صبح اٹھ کر ہاٹ کی طرف جانے سے پہلے پورب کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ ٹھاکر سانڈ تو نہیں ہیں اُدھر؟ ٹھاکر سانڈ لکھی کانت کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتا تھا۔ لال رنگ کا کوئی کپڑا نہیں۔۔۔ لیگ کے جھنڈے کے لیے منصور صاحب کی دکان میں گانٹھ کے گانٹھ کپڑے آئے تھے۔ اسی کپڑے کے کرتے منصور صاحب نے اپنی دکان کے سبھی نوکروں کو بنوا دیے تھے۔ جس دن لکھی کانت اس کپڑے کا کرتا پہن کر نکلا، سدا شانت رہنے والا ٹھاکر سانڈ اسے دیکھ کر ایسا بگڑا کہ لکھی کانت کی جان پر بن آئی۔۔۔ کسی طرح اس داہنے والے کھجور پر چڑھ کر دو گھنٹے تک لٹکا رہا۔۔۔

پندرہ سال کے لڑکے لڑکیوں کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی!

ان میں سے زیادہ تر کا جنم بھاگتے وقت، خانہ بدوشی کی حالت میں، مختلف کیمپوں میں ہوا تھا — مالدا، کٹیہار، پٹنہ، بیتیا کے کیمپوں میں۔ اس کے باوجود وہ ان کھلے کھیتوں کی طرف کھجور کے پیڑوں کو، کالے جنگل کو، لال کھپریل والے گھروں کو ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہے ہیں۔۔۔ وہ اچھی مدین پور کیوں ہونے لگا! وہ پرواہا گاؤں ہے۔ کل ہی اس گاؤں میں بسکٹ بیچ آیا ہے اندو!

جمعہ پور والے شرنارتھیوں کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ یہ کیا دکھلا دیا دیدی ٹھاکرن نے؟ رات کے اندھیرے میں بھی وہی جھلک! ہو بہو اچھی مدین پور ہاٹ کی روشنی! ویسی ہی جھلملاتی ہوئی روشنی!

Scanned with CamScanner

رات بھر، جب تک وہ جگے رہے، جمعہ پور میں ہی رہے — وہیں کی یاد، وہیں کی چرچا۔ کسی نے کھایا، کوئی یوں ہی لیٹا رہ گیا۔

رات کے تیسرے پہر میں نیند کے ساتھ سپنے آئے — سبھی کو۔

صبح میں ایک دوسرے کے سپنے کی بات سنتے اور ایک لمبی سانس چھوڑ کر چپ ہو جاتے۔ راکھال نے کہا، آج وہ کھیت پر نہیں جا سکے گا۔ رات بھر اس کی چاچی پکارتی رہی ہے: ''او رے راکھال، کوتھائے گیلے رے!''

تیس جمعہ پور والوں میں بیس مرد عورتوں نے اس دن کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن پھیری والے نوجوانوں لڑکوں نے وقت پر اپنا کام کیا۔ ایک دوسرے کو پکار کر بلایا، نہائے دھوئے اور اپنی اپنی جھولی، ٹوکری، کنستر اور بکسے لے کر نکلے۔ ''چل رے! ساڑھے آٹھا با جلو... گاڑی چھوٹ جانے پر آج بس نہیں ہے پھر۔''

پھیری کرنے والوں کا لیڈر ہے بشٹو۔ ٹرین میں چیکر اور گارڈ سے مل کر، اپنے ساتھیوں کے دکھ درد کی کہانی سنا کر، ٹرین میں پھیری کرنے کا زبانی 'آڈر' لینا، بس کے ڈرائیور اور کنڈکٹر کو خوش رکھنا اور گروپ کے خرچ کا حساب رکھنا بشٹو کا کام ہے۔ مہاجن بھی اس کی ضمانت مانگتے ہیں۔

کالونی سے باہر نکل کر اُسے یاد آیا — ویدی ٹھاکرن نے بلایا تھا۔ کوئی چٹھی بھیجنی ہے کہیں۔

پوترا آفس گھر میں جمع لوگوں کو سمجھا رہی تھی، ''کام پر نہیں جانے کی کیا وجہ؟ کیا مطلب؟ ... دیکھو، 'دیش' کی یاد، اپنی جنم بھومی کی یاد کرتے کرتے ہمارے دل مَن ہو گئے ہیں۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ ہمیں کسی چیز سے پیار نہیں، نہ یہاں کی دھرتی سے، نہ یہاں کے لوگوں سے اور نہ یہاں کے جانور پنچھی سے۔ کسی چیز پر وشواس جمتا ہی نہیں۔ اس لیے بھگوان نے سوچا کہ چلو، انھیں اپنی لیلا دکھلا دو، تاکہ یہ یہاں کی مٹی کو پیار کر سکیں، یہاں کے لوگوں سے پریت جوڑ سکیں۔ جمعہ پور اور نبی نگر ایک ہی ہے...''

بشٹو آ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ پوترا بولی، ''نہیں بشٹو، تم جاؤ۔ میرا کام ہو گیا۔''

سبھی چلے گئے۔ پوترا اپنے کام کا لیکھا جوکھا لینے لگی: ''چار ٹیبل کلاتھ، دو آسنی، دو درجن گلاس ڈھکنے کے نیٹ کور، پانچ بٹوے۔ دو مہینے کی پیداوار — بس اتنا ہی؟''

Scanned with CamScanner

پوترا کالونی ممبر ہے۔ ضلع کالونی کمیٹی کے کئی اہم شعبوں سے اس کا تعلق ہے۔ ہر مہینے میں ایک بار اسے 'صدر' جانا پڑتا ہے۔ پرسوں ایک لازمی میٹنگ ہے۔ وہ چاہتی تھی، بشٹو کے ہاتھ ایک چٹھی بھیج کر...

کالا چاند کی ماں پھر کہاں آ رہی ہے؟

''کیا ہے کالا کی ماں؟''

''کچھ نہیں۔ ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔''

وہ بیٹھ گئی، چٹائی پر۔ پوترا نے پوچھا، ''کیا بات ہے؟''

اُدھر یوگیش داس کی بیٹی سندھیا دیدی ٹھاکرن کے سکھائے نئے گیت کا ریاض کر رہی ہے:

''دیشے دیشے مور گھر آچھے...''

کالا چاند کی ماں کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر پوترا سمجھ گئی، آج یہ بوڑھی سچ مچ کوئی گمبھیر بات پوچھنے آئی ہے... کالا چاند کی ماں 'ٹھاکر باڑی' کی نوکری کرتی تھی۔ پوترا کے گھر کی بہت سی باتیں جانتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ جمعہ پور میں ہوئے فساد کے پیچھے دھرم اور ذات نہیں کیونکہ علاقے بھر کے لوگوں نے پتا ٹھاکر کو ایک دن پہلے تک یقین دلایا تھا، ''آپ مطمئن رہیں۔ یہاں کچھ نہیں ہو گا۔'' کالا کی ماں نے ہی بیتیا کیمپ میں چپ چاپ بتلایا تھا: ''قاسم بھالے کی نوک پر ونود کا کٹا ہوا سر لے کر سب سے آگے تھا۔ ونود مکھرجی — لکھم پور کے رائے صاحب وِکاس مکھرجی کا بیٹا — جو 'پتا ٹھاکر' کے نام اپنے باپ کا خفیہ پیغام لے کر آ رہا تھا... یا اس کے من میں جو بیٹھی ہوئی تھی، اُسی کی ٹن گن لینے آ رہا تھا۔ اچھی مذین پور ہاٹ پر قاسم نے اسے دیکھا اور بہلا وا دے کر اپنے گھر لے گیا۔

کالا چاند کی ماں بولی، ''دیدی ٹھاکرن! ایک بات پوچھوں؟ برا نہ مانیے گا۔ آپ 'پڑھوا پنڈت' ہیں۔ بھول چوک ہو تو معاف کر دیجیے گا۔ سب کچھ تو ملا — اپنے دیش کا اناج، مچھلی، چاول، تری ترکاری — سب کچھ اپنے جمعہ پور گاؤں میں جیسا ملتا تھا، یہاں بھی ملتا ہے۔ ہوا پانی بھی وہی ہے... لیکن 'من کے مانس' جیسا کوئی یہاں نہیں؟ مجھے معاف کرنا دیدی ٹھاکرن!... تم نے ایک بار کہا تھا: یہاں بھی سینکڑوں قاسم ہیں...''

پوترا سمجھ گئی، کالا چاند کی ماں کیا کہنا چاہتی ہے۔ پوترا کو لگا، کالا چاند کی ماں نے اس کے دل

Scanned with CamScanner

کے سب سے زخمی تار کو چھو دیا۔

نبی نگر کے آکاش پر، کوؤں کا ایک جھنڈ بے طرح شور مچاتا ہوا چکر لگانے لگا۔

پوترا نے اپنے کو سنبھال لیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''کالا کی ماں، تعجب کی بات! 'من کے مانُس' جیسا بھی 'مانس' ہے یہاں۔ اپنے من کی بات آنکھوں میں لکھ کر وہ بھی لے آتا ہے۔ آنکھوں سے ہی جواب اسے ملتا ہے۔''

کالا کی ماں بولی، ''دیکھنے میں ہو بہو وِنود بابو جیسا ہے نا؟ میں بتلاؤں؟ وہ... وہ 'خبر کے کاغذ' کا بابو؟''

پوترا اس بار ہنس پڑی۔ کالا چاند کی ماں نے کہا، ''میں نے ٹھیک ہی پکڑا ہے؟... لیکن وِنود بابو کی طرح... یعنی... اس نے کچھ کہا نہیں ہے؟ آپ نے... دیدی ٹھاکرن، سب بھگوان کی لیلا ہے۔ لیکن بات آنکھوں میں...''

''کالا کی ماں! سب سے زیادہ تعجب کی بات سنو گی؟ ونود کی طرح ہنستا بولتا ہے، تتلاتا ہے۔ مٹھائیوں میں اس کو بھی چندر پُلی سب سے زیادہ پسند ہے۔''

''دیدی ٹھاکرن! میں تمھارے پاؤں پڑتی ہوں۔ بھگوان نے شاید انھیں ہی پھر بھیجا ہے، من کی بات کہنے کے لیے...''

''من کی بات تو وہ کہہ چکا۔''

''تم نے کیا جواب دیا، دیدی ٹھاکرن؟''

''تم پاگل ہوگئی ہو کالا کی ماں؟ تم کیا چاہتی ہو؟ کھوئے ہوئے دھن کو پا کر میں پھر کھو دوں؟... میں صرف پوترا نہیں... میں آگ ہوں، میں تلوار ہوں، میں برچھی ہوں، میں، میں... زہر ہوں... ناگن ہوں۔ وہ مجھے پا کر، یا میرے من کو پا کر کتنی دیر جی سکے گا؟... اور تم لوگوں کو چھوڑ کر میں کہیں جاؤں گی تو کتنے دنوں تک... تم لوگ مجھے اپنے دروازے سے اس طرح ٹھیل کر باہر نہیں پھینک دینا! اور... تم... تم، کالا کی ماں، میری ماں ہو! بھگوان کے لیے پھر کبھی ایسی بات منھ سے نہ نکالنا... وہ... اُسے یہ بات... اس بات کی بھنک بھی نہیں لگے... دہائی...! اسے جینے دو! نہیں تو تم لوگوں کی دیدی ٹھاکرن...''

پوترادہاڑ مار کر رو پڑی۔

کالا چاند کی ماں اس کے امنڈتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوے خود رو پڑی۔ ''نہیں ماں! میں تجھے اپنے کلیجے سے سٹا کر رکھوں گی۔ اپنی بٹیا کو آنکھوں میں بٹھا کر رکھوں گی... تمی جے آمار پران...'' (تم تو میری جان ہو...)

❁❁

Scanned with CamScanner

پھنیشور ناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

ٹیبل

مس ڈُر باداس!

اب صرف مس ڈُر باداس نہیں — مس ڈُر باداس، اسسٹنٹ برانچ منیجر، کانٹی نینٹل کاسمیٹکس اینڈ ڈرگز لمیٹڈ، کلکتہ، بمبئی، دلّی، پٹنہ، برانچ پٹنہ۔

برانچ آفس کے ہر سیکشن میں پچھلے سات دنوں سے بس ایک ہی چرچا، چرچا کا ایک ہی موضوع — ڈُر باداس، ڈُر باداس کی قسمت۔ ڈسپیچ کلرک ہو کر کمپنی میں آئی، پھر ہیڈ کلرک، اور آٹھ سال بعد اسسٹنٹ برانچ منیجر کا یہ نیا عہدہ۔

کینٹین کی سیڑھی کے پاس بیٹھا جمعدار ابھیلاکھ رام سنا رہا ہے نئے بیرے سیرام داس کو: ''مس صاحب کو ہم دیکھا ہے جب مس صاحب فراک پہنتی تھی۔ بہت بڑے حسابی بنگالی بابو کی بیٹی ہے مس صاحب۔ ایک دن جھاڑو دینے نہیں جاؤ، بس ایک دن کی مجوری تمھاری ضرور کٹے گی۔ کہتے، حرام کا پیسہ کھا کر ہڈی کیوں گلانا چاہتے ہو؟''

مالی بولا، ''تو خاندانی کنجوس کہو مس صاحب کو۔ کل میجر باغ سے گلاب خرید کر، دوہرا گلاستہ بنایا بڑے جتن سے۔ گھر پر دے آیا — خوشی خوشی۔ سو، گلدستہ ہاتھ میں لے کر چٹکی بھر ہنس کے چھٹی... سب کے سب بلیک پرنس گلاب تھے۔''

سنکیسر رام، جنرل سیکشن کا پیون، دور سے ہی مسکراتا ہوا آ رہا ہے۔ اس نے سمجھ لیا ہے، گپ

Scanned with CamScanner

مس صاحب کے بارے میں ہی ہو رہی ہے۔آتے ہی بھوجپوری میں بولا،''آج آ پھیسو کمپلیٹ ہو گئے۔آج تکھتیو لنک جائی—نیم پلیٹ۔''

''تب تو آج سے تمھارے ڈپاٹ میں نہیں بیٹھے گی؟''

''یہاں بیٹھنے والا بھی آ گھیلن ... بمبئی سے، بڑا بابو۔''

سنکیسر کینٹین کی طرف بڑھا تو یونین کا چندہ اُگاہنے والے پیون جگوتی پرساد نے روک کر کہا،''اے نیم پلیٹ کمپلیٹ! کدھر؟... ڈپارٹمنٹ میں چاہ جو بھی دے گی مس صاحب یا جے جے سیارام؟''

سنکیسر ہنس کر بولا،''او گڑ نہیں جو مکھی کھائے۔نہ کیکر و کھات دیکھ لیں— نہ کیکر و کو کھلاوت دیکھ لیں—آج لے۔'' سچ مچ مس ڈربا کو کسی نے کھاتے کھلاتے نہیں دیکھا کبھی۔جنرل سیکشن— جہاں ڈربا داس بیٹھتی تھی— سونا سونا لگتا ہے۔کونے میں بیٹھتی تھی مس ڈربا، ہیڈ کلرک۔لگتا تھا، ایک بڑا سجا سجایا ٹیبل لیمپ جل رہا ہو... آٹھ سال تک وہ ٹیبل لیمپ —ڈربا داس کے خوبصورت چہرے کی طرح—ایک جیسی روشنی کے ساتھ ہال کے کونے میں جلتا رہا—دس سے پانچ تک۔کبھی کبھی سات بجے شام تک۔

دن بھر میں صرف دو تین بار اس کی کال بیل بجتی، دو بار پانی پیتی۔لنچ کے وقت پاؤڈر کی ڈبیا جیسے ٹفن بکس سے ایک لبی بسکٹ نکال کر کتر لیتی۔بولتی بہت کم۔مسکراتی رہتی، ہر گھڑی۔کہتے ہیں، اسی سندر مسکراہٹ کے پیچھے ڈربا کی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔سیکشن میں ملک کے کونے کونے سے ایک سے ایک گھاگھ بابو آئے۔جس نے ڈربا کی اس مسکراہٹ کے غلط معنی نکالے، وہ گیا۔ترپاٹھی، سنہا، لنگڑا اکھر جی— سبھی نے ایک ہی غلطی کی، ترتیب وار۔

نگینہ پرساد کو بلا وجہ بات کرتے وقت صفحے پلٹنے کی عادت ہے اور بغیر زبان سے انگلیاں گیلی کیے دو ورق سے زیادہ نہیں الٹ سکتا۔مس ڈربا نے لکھ کر اس گندی عادت کو چھوڑنے کی چیتاؤنی دی تھی۔

آج نگینہ پرساد زیادہ جوش کے ساتھ باتیں کر رہا ہے اور اس کی انگلیاں— مشین کی طرح— ہر دو ورق کے بعد زبان سے چپک جاتی ہیں۔''چپاک! چٹ چٹ! چپاک... کیوں بھائی، بڑے

بابو بڑے صاحب کے کمرے میں ہیں، کیوں؟''

ٹرانسپورٹ کلرک سین بولا، ''اچھا بھائی، ہم تو ہندی کا مذکر مونث نہیں جانتا کچھ... بتاؤ تو اس مس داس کو... آئی مین... چھوٹا صاحب کو کیا بولے گا؟ بڑا صاحب... چھوٹا میم تو نہیں بولنے سکتا!'' سبھی ہنسے!

مس ڈرباداس ہیڈ کلرک نے ٹرانسپورٹ کے سین کا حساب چیک کر کے کہا، ''حساب غلط ہے۔'' سین نے سارا دن بیٹھ کر حساب کیا — کروایا۔ پٹرول کے کوپنوں سے لے کر آٹو موبائل گیراج کے بلوں کو دہرا کر دیکھا۔ ساڑھے چار بجے جو حساب پیش کیا سین نے، اس پر سرسری نگاہ ڈال کر ہی مس ڈرباداس نے — خالص بنکم چندر چٹرجی کے انداز کی بنگلہ میں کہا تھا، ''مہربانی کر کے آپ اپنی کھوپڑی میں روز بکری کے گھی کی مالش کریں۔''

پرچیز سیکشن کے جھا نے ادھ جلی سگریٹ کو سلگا کر کہا، ''یہ تو ظلم ہے۔''

''کیا ظلم ہے؟''

''یہی کہ زنانہ ذات راج کرے اور مرد ذات... ہمارے یہاں ایک کہاوت ہے...'' اور جھا نے موقعے کی مناسبت سے میتھلی کی ایک عورت دشمن کہاوت بیان کی۔ سین بولا، ''جھا بیٹا، بھانو سنگھ کے شعر پڑھتا ہے، ایں؟''

سبھی بابو جی دل کھول کر ہنسے۔ آج نئے بڑے بابو کے جوائن کرنے کا دن ہے۔ استقبال کے موڈ میں ہیں۔

''بڑے بابو ابھی تک بڑے صاحب کے چیمبر میں ہیں یا چھوٹے کے؟'' چاپلوس گلشن مہتہ کی چیچک کے داغوں والی سانولی صورت پر لالی دوڑی۔ موقعے پر بولنے کے لیے وہ کوئی بہت کم استعمال ہونے والا انگریزی کا کوئی لفظ ڈھونڈ رہا تھا شاید۔ لیکن کچھ بول نہیں سکا۔ بڑے بابو — نئے بڑے بابو، انورنجن گپتا — دفتر میں آ گئے — بڑے صاحب کے چیمبر سے۔

مہتہ نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ ساتھ کام کرنے والوں کا ان کی سینیارٹی کے مطابق تعارف کروایا۔

سدا دیر سے دفتر آنے والے لیکن سدا سب کے کام آنے والے پنڈا مہاراج آج بھی دیر

سے آئے۔ مس داس نے بھی کبھی جواب طلب نہیں کیا بندا مہاراج سے۔ برہمن بوڑھا۔۔۔! بندا مہاراج کے گھر آج بھی خوش قسمتی سے پوجا تھی—تِل کُٹ لے آئے ہیں۔ بڑے بابو نے عقیدت کے ساتھ پرسادلیا۔ بندا مہاراج خوش ہو گئے۔

بندا مہاراج اب اپنی پرانی ماچھلی دیدی، نئی اسسٹنٹ برانچ منیجر — مس دُرباداس— کے نئے کمرے میں گئے۔ دُربا کو تل کٹ بہت پسند ہے۔ گیا کے علاقے کے نمائندے مانس کمار جی ہر سال تین بار ٹوکری بھر لے آتے ہیں۔ گلشن مہتہ مس دُرباداس کے چیمبر میں آ گیا۔ سب سے پہلے ہندی میں نیم پلیٹ بنوانے پر مبارکباد دی، جیسے کہ ہندی کا واحد محافظ اس پوری کمپنی میں اکیلا وہی ہے۔ دُربا نے جھکی نظروں سے مہتہ کو دیکھا۔

مہتہ نے اب نیم پلیٹ کی تعریف کی، ''بہت بڑھیا بنا ہے۔''

''کیا بڑھیا ہے؟ نام ہی غلط لکھا ہے۔''

''ایں؟'' مہتہ نے چیمبر سے باہر نکل کر نیم پلیٹ کو پھر پڑھا۔'' کہاں، کیا غلطی ہے؟— غلطی تو کوئی نہیں دکھائی دیتی۔''

''دُروا نہیں، میرا نام ہے—دُربا۔''

مہتہ نے اس غلطی پر اپنا منھ سکوڑ کر کوٹ کے بٹن ہول جیسا بنالیا۔'' اوہ اوہ؟۔۔۔ خیر، 'و' کا پیٹ کاٹ دینے سے کام چل جائے گا۔''

مہتہ نے اب مس دُربا کے نئے اور بڑے ٹیبل کی تعریف کی، ''گرینڈ ہے۔''

اسی وقت دُربا کو کچھ یاد آیا۔۔۔ ٹیبل؟'' نیا ہیڈ کلرک آ گیا دفتر؟ کہاں بیٹھا ہے؟''

مہتہ بولا'' اور کہاں بیٹھیں گے؟ جہاں آپ بیٹھتی تھیں۔''

دُربا اچانک اس طرح گمبھیر ہوگئی تو مہتہ کان کھجانے لگا۔ پھر آہستگی سے چیمبر سے باہر نکل گیا۔۔۔ پتا نہیں کیا بات ہوئی۔

ٹرنگ۔۔۔ ٹرنگ۔۔۔ ٹرنگ۔۔۔

''ہوں! جی جی، ہاں، یس سر، ابھی آ رہی ہوں۔''

ٹرنگ!۔۔۔ ''بسنو سنگھ؟۔۔۔ تم ہی کو میرے متھے مڑھا گیا ہے؟ سنو— پرچیز سیکشن کے جھاسے

بولو — بڑا صاحب بلاتا...''

دُربا داس بھی بڑے صاحب کے چیمبر میں گئی۔ پھر فوراً واپس آئی۔ عادت کے تحت اس کے پیر جنرل سیکشن کی طرف بڑھے۔ لیکن بسنو سنگھ کی کھلی ہوئی بتیسی کو دیکھ کر مڑی — اپنے چیمبر کی طرف۔

دُربا داس کی ترقی سے بسنو سنگھ بہت زیادہ خوش ہے۔ روپ کہتے ہیں اس کو، کہ دیکھیے تو دیکھتے رہ جائیے۔ نظر ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس کو کہتے ہیں زنانہ کی خوبصورتی۔ بھگوان نے بسنو سنگھ کی پرارتھنا سن لی ہے — دلی آرزو! اب خدمت کرنے کا موقع ملا ہے — اتنے دنوں کے بعد۔

دُربا اپنے چیمبر میں آئی۔

... اونہوں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ نئے فرنیچر کی بو، وارنش کی بو دُربا کو اچھی لگتی ہے۔ لیکن آج کیوں نہیں اچھی لگ رہی؟ اُبکائی کیوں آ رہی ہے؟ اس کے دونوں ہاتھ رہ رہ کر بھٹک جاتے ہیں۔ دراز نئے ڈھنگ کی ہے اس میز کی؟ نیا ٹیبل؟ ٹھیک ہے۔ یہی... یہ ٹیبل نہیں پسند ہے دُربا کو۔

اپنے دونوں ہاتھوں کو دونوں طرف ٹیبل پر پھیلاتی ہے دُربا۔ جیسے لپٹا رہی ہو ٹیبل کو۔ اس نے دھیرے سے ٹیبل کے ٹاپ گلاس پر اپنا دایاں گال رکھا۔ تڑپ اٹھی، جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ نہیں نہیں۔ نہیں چلے گا۔ لیکن؟

آٹھ سال سے جس ٹیبل پر کام کرتی آئی ہے، اس کے سوا اور کسی ٹیبل کے پاس بیٹھنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ لگتا ہے، پرائے کے سامنے بیٹھی ہوں... ناممکن!

ٹرنگ!

''حضور؟''

''بسنو سنگھ، مہتہ بابو کو...''

مہتہ کان کھجاتا ہوا پھرتی سے آیا۔ ''جی؟''

''مسٹر مہتہ! بڑا بابو... نئے بابو... ہیڈ کلرک آ گیا دفتر؟... کام کر رہے ہیں ٹیبل پر؟''

''ٹیبل پر کام؟ جی ہاں... جی نہیں۔ ابھی تو سنگیسر کو بلا کر ہتھوڑے سے ٹیبل کی کوئی کیل ٹھکوا...''

Scanned with CamScanner

''کیا...؟ کیل؟''

مہتہ تعجب سے بولا، ''جی ہاں، کیل۔''

ڈربا لرز اٹھی دانت پر دانت رکھ کر — سی ی ی! لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ ''ٹھیک ہے، آپ جائیے!''

جائیے؟ مہتہ جیسے کسی اور ڈربا اس کو دیکھ رہا ہے۔ ایسی اُتاؤلی تو آج تک کبھی نہیں نظر آئی ڈربا داس۔ کیل! کانٹا!... گلشن مہتہ کے من میں رہ رہ کر کیل چبھنے لگی — ایسا کیوں؟

مہتہ چلا گیا۔

... کیا کیا جائے؟ وہ ٹیبل ڈربا کو چاہیے، آج چاہیے، ابھی چاہیے۔ اس کے سوا وہ ایک پل چین سے نہیں بیٹھ سکتی!... نہیں، نہیں، نہیں! کچھ نہیں ہو سکے گا اس سے۔ میمو پر دستخط تک نہیں۔ اور اُدھر وہ گپتا — آتے ہی کیل کیوں ٹھوکنا شروع کیا ٹیبل میں؟ پتا نہیں کدھر کیل ٹھونک رہا تھا؟ سی ی ی! شاید جس کیل کو اس نے جان بوجھ کر آدھا ہی ٹھکوایا تھا — چُوں کی ننھی ٹانگنے کے لیے — اسے تو نہیں؟ بھگوان جانے! لیکن یہ ناانصافی ہی نہیں، جرم ہے... کرائم! اس نے کیوں ایسا کیا؟

ٹرنگ!

''مجبور؟''

بسنو سنگھ نے نئے بڑے بابو کو مس داس صاحب کا سلام دیا۔

لگا، اسی لمحے کے انتظار میں — اسی طرح کی راہ دیکھ رہے تھے سبھی۔ بڑا بابو انورنجن گپتا بھی۔ سبھی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مہتہ دھیرے سے اٹھ کر بڑے بابو کے پاس گیا۔ دھیرے سے گنگنا کر بولا، ''ای ٹیبل بڑ اسگنیا ہے، بڑا بابو!'' (یہ ٹیبل بڑا خوبیوں والا ہے، بڑے بابو!)

مہتہ جب اپنائیت بھری بولی بولتا ہے تو پہلا جملہ ضرور مگہی میں بولے گا۔ اس نے پوچھا، ''سر! مکان تو مل گیا یا...؟ ٹھیک ہے، کسی طرح کی کوئی بھی مشکل ہو — مہتہ کو یاد کیجیے۔ ہمارا فرض ہے سر۔ ہمارا جنم اسی شہر کے قدیم علاقے میں ہوا ہے۔ جی، ہی ہی ہی!''

بڑا بابو، یعنی انورنجن گپتا، ہال سے باہر چلا گیا تو سین نے پوچھا، ''اچھا بھائی، تم بھی خوب آدمی

ہے۔ کبھی بولتا ہے یہاں جنم ہوا ہے ہمارا۔ اس دن بڑا صاب کو بولا — جنم ہوا پنجاب میں۔ چاندنی — ناچانی چوک میں جنم ہوا۔ تمھارا جنم کتنا جگہ میں ہوا بھائی؟''

ہال میں ایک قہقہہ پڑا۔ لیکن مہتہ نے ہمیشہ کی طرح سین کی چوٹ کا رخ ہی موڑ دیا، ''مائی ڈیر فرینڈز، کہیں نہ کہیں کوئی کیل ضرور ٹھونکی جا رہی ہے... معلوم تو سبھی کو ہے کہ پچھلے سال کلکتہ میں ایک ہی ساتھ ٹریننگ میں تھے، دونوں۔ مسٹر اے گپتا اینڈ مس ڈربا داس۔ ایک کامیاب ہو کر اسسٹنٹ برانچ منیجر ہو گئی — دوسرا بڑا بابو کا بڑا بابو ہی رہا۔ پیور ہائی لینڈر نوجوان، اور نیو ہیڈ کلرک!''

مہتہ کے اس لکچر کے بعد دفتر کے کام کاج میں لوگوں نے خود کو ڈبونے کی کوشش کی۔ نئے بڑے بابو کی نگاہ میں آج ہی نہ چڑھ جائے کوئی، اس لیے سبھی توجہ کے ساتھ کام کرنے لگے — لیکن اس توجہ میں اصلیت کم تھی اور دکھاوا زیادہ۔ جیسا کہ عام طور سے دفتروں میں ہوتا ہے: لگ بزی، ڈو نتھنگ۔

ٹائپ رائٹروں کی تیز رفتار، کال بیل کی پکار، درازوں کو کھولنے اور بند کرنے کی آوازیں — سارے ماحول میں ایک بناوٹ، ایک ملاوٹ، کپٹ۔

''سنگیسر!... کہاں بھائی؟ ذرا پانی پلاؤ۔''

سنگیسر سب سمجھتا ہے۔ بہت بہت بابوؤں کو اس نے پانی پلایا ہے آج تک۔ اصلی پیاس، نقلی پیاس اور نظر کی پیاس — سبھی طرح کی پیاس کو وہ پہچانتا ہے۔ جہاں ایک بابو نے پانی مانگا، سبھی بابوؤں کی روح مانو پیاس سے اینٹھنے لگتی ہے۔

''سنگیسر! کہاں چلا جاتا ہے؟ کسی نے کہیں بھیجا ہے؟''

سنگیسر بڑبڑاتا ہوا آیا، ''حجور، پانی چھو کے پھیلوا ہم نہ چھوئے بے۔ گیلے ہاتھ کسی کاغذ پر نہ دھربے۔ مس صاحب بہت بگڑے گی...!''

مہینے کے آخری ہفتے میں کئی بابوؤں کو سنگیسر سے قرض لینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے، دس پانچ، شاید اس لیے سنگیسر کی جھلاہٹ پر کوئی دھیان نہیں دیتے۔ اس کے خلاف بات انگریزی میں ہو یا کسی ہندوستانی زبان میں، وہ سمجھ لیتا ہے۔ اپنی مادری زبان ٹھیٹھ بھوجپوری کے علاوہ کوئی اور زبان سیکھنے بولنے کی اس کی خواہش ہی نہیں ہوئی! چاہے بنگال کے بنرجی بابو بولیں یا مراٹھا بھونسلے صاحب سے بات چیت کرے، سنگیسر جاتانی، کھاتانی (جا رہا ہے، کھا رہا ہے) ہی بولتا ہے۔

مہتہ کے من میں کیل کچھ کچھ چبھتی ہے — کیا بات ہے؟ وہ اور بیٹھا نہیں رہ سکتا... ایک ریلوے رسید کے بارے میں پوچھنے کے لیے مناسب سوال گڑھ رہا ہے وہ... مل گیا سوال اس کو! وہ فائل لے کر اے بی ایم کے چیمبر میں پوچھتے ہوے داخل ہوا: ''مے آئی کم ان...''

لیکن مس ڈُرباداس نے افسرانہ شان سے کہا: ''بعد میں آیئے!''

مہتہ نے دیکھا — نئے بڑے بابو کے ہونٹوں پر ایک مخصوص قسم کی مسکراہٹ ہے، اور ڈُرباداس کے چہرے پر ایک نئی قسم کی ہلچل... من میں کیل دو تین بار گڑی مہتہ کے! وہ پھر نہ چاہتے ہوے بھی چیمبر سے باہر نکل آیا۔

تب مس داس نے بات چیت کو آگے بڑھایا۔

''آپ کو مکان مل گیا؟ اچھا، گڈ لک، یہ بہت بڑا پرابلم ہے پٹنہ کا...''

''ہر جگہ یہی حالت ہے۔ میرے ایک جاننے والے یہاں ریلوے میں ہیں — انھیں کی مہربانی سے ایک اچھا مکان مل گیا ہے، چریا ٹاڑپل کے پار،'' انورنجن نے بتایا۔

مس داس کے اندر بہت دیر تک کشمکش کی کیفیت رہی۔ سامنے بیٹھے نوجوان سے یہ اس کی پہلی ملاقات نہیں۔ ایک ہی ساتھ ٹریننگ میں تھے وہ پچھلے سال... انورنجن کے نوٹس آج بھی اس کے پاس ہیں۔ پھر وہ پچیس صفحے کا ذاتی مضمون — ٹریننگ سے میں نے کیا حاصل کیا — دلچسپ ادبی طریقے سے لکھنے کی شرط تھی۔ اس نے مضمون لکھنے میں انورنجن کی مدد لی تھی، ٹی سنٹر میں بیٹھ کر چائے پی ہے آمنے سامنے بیٹھ کر، اسٹار سنیما میں شمبھومترا کی فلم دیکھ چکی ہے، بغل میں بیٹھ کر۔ نہیں، ان یادوں کو مٹا دینا ہوگا۔ سفید چاک سے لکھی پرانی یادوں کو ذہن سے صاف کر دینا ہوگا... ذہن ڈسٹر سے صاف کیا ہوا ایک کالا بورڈ۔

انورنجن گپتا نے بہت پہلے ہی اپنے کو قابو میں کر لیا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی وہ آندھی طوفان جھیل چکا ہے۔ اس نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ بورڈ نے اسے اسسٹنٹ برانچ منیجری کے قابل نہیں سمجھا، اس کی بدقسمتی! وہ کیا کرے؟ لیکن پٹنہ فوری ٹرانسفر آرڈر پا کر اسے مایوسی ضرور ہوئی تھی۔ جی جان سے کام کرنے کی اچھی سزا اسے ملی... اسے اس نے قبول کر لیا۔ طے کیا کہ وہ اپنے فرائض

کی ادائیگی تندہی سے کرتا رہے گا۔

لیکن ابھی ابھی، کچھ لمحے پہلے اس کا دل پھر ڈگمگا گیا تھا... سلام کا جھجکتا ہوا جواب، ہاتھ اٹھانے کا انداز، آنکھوں میں غیر معمولی اپنائیت کی جھلک — سب کچھ دیکھ سن کر اس نے سمجھ لیا تھا کہ مس داس کے من میں کچھ ہو رہا ہے۔

وہ کرسی سے اٹھنے کو ہوا۔

ڈربا بولی، ''سنیے، میں نے بلایا تھا...''

انورنجن پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحے چپ رہنے کے بعد انورنجن نے پوچھا، ''جی، کہیے۔''

''وہ ٹیبل... آئی مین... وہ ٹیبل جس پر فی الحال آپ بیٹھے ہیں... وہاں کل تک میں بیٹھتی تھی... وہ... وہ...''

''جی، وہ؟ کیا ہے اس ٹیبل میں؟''

''وہ میرا ٹیبل ہے...''

''آپ کا پرسنل؟''

''جی نہیں۔ میں نے اس پر آٹھ سال تک بیٹھ کر کام کیا ہے۔''

انورنجن نے کہا، ''جی معلوم ہے۔ لیکن مجھے کرسی نہیں دی گئی ہے۔''

ڈربا گمبھیر ہو گئی۔ اسے انورنجن کی بات کچھ غیر مہذب سی لگی... کرسی بدلنے کی بات کیوں بولا؟ اس نے من کی ساری ہچکچاہٹ کو اب دور کر دیا۔ بولی، ''وہ ٹیبل مجھے — یہاں میرے چیمبر میں بھیج دیجیے۔''

''یہاں بھیج دوں؟... اور یہ ٹیبل وہاں جائے گا؟ لیکن وہاں اتنی جگہ کہاں ہے؟''

نہیں یہ ٹیبل بھی یہیں رہے گا، وہ بھی۔''

''تو میں وہاں کس ٹیبل پر —؟''

ڈربا داس بے صبر ہو کر بولی، ''میں اسٹور بابو کو بلاتی ہوں۔ آپ کو نیا ٹیبل ملے گا۔''

انورنجن نے بنا کچھ سوچے سمجھے جواب دیا، ''ٹھیک ہے، نیا ٹیبل آ جائے پہلے...''

''پہلے پیچھے کیا؟ ابھی بھیج دیجیے۔''

Scanned with CamScanner

ڈرباداس پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ انورنجن نے اس کے گالوں پر رنگوں کو اتنی تیزی سے چڑھتے اترتے نہیں دیکھا تھا—نہ سینما ہال میں، نہ ٹرام میں، نہ ریسٹورنٹ میں— کہیں نہیں۔

انورنجن اٹھا۔ ڈرباداس کا دھیان ٹوٹا۔ گویا خود سے بحث کرتی ہوئی بڑبڑائی، ''اس کے بنا مجھ سے کوئی کام نہیں ہوگا...''

انورنجن اسسٹنٹ برانچ منیجر کے چیمبر سے باہر نکل آیا۔

اپنے جنرل سیکشن میں داخل ہوتے ہی اسے لگا— سیکشن کے ہر ٹیبل کے پاس انسانی جسم میں گڑی گول آنکھوں میں تجسس اور حیرت مل جل کر جھلملا رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بلبوں جیسی دس جوڑی جلتی ہوئی آنکھیں!

ٹرانسپورٹ ڈپارٹمنٹ کا ڈلال سین— جسے دفتر کے ساتھی 'ٹرانسپورٹ سین' کہتے ہیں— سگریٹ پیتا ہے۔ بڑے بابو کو سگریٹ پیش کرتا ہوا بولا، ''سر! ڈویژن آف ورک کا فیصلہ ہو گیا کیا؟''

انورنجن سگریٹ کا مزہ لینے لگا— کوئی جواب نہیں ملا سین کو!

سبھی جلتی آنکھوں نے بڑے بابو کے چہرے پر آنے جانے والے تاثرات کو پرکھنے کی کوشش کی—اپنے اپنے زاویے سے۔

بندا مہاراج نے پان کا ڈبہ بڑھایا... ''بڑے بابو پان کھاتے وقت سگریٹ نہیں پیتے۔''

گلشن مہتہ نے فوری تائید کی، ''بہت اچھا کرتے ہیں سر! پان کھاتے وقت سگریٹ پینے والے کی سگریٹ کی تھوتھنی عجیب... لال سی... عجیب...''

ٹرنگ...

''حجور!''

''کیا نام ہے تمھارا؟''

سنکیسر کے ساتھ سبھی بابوؤں نے دہرایا، ''سنکیسر رام!''

''دیکھو، سنکیسر رام، یہ ٹیبل جائے گا اے بی ایم — یعنی مس داس صاحب کے کمرے میں...''

Scanned with CamScanner

بابوؤں کی منڈلی ایک آواز ہو کر بولی، ''مس داس صاحب کے چیمبر میں؟ کیوں ں ں؟''
سب سے بعد میں سکسینہ نے پوچھا، ''سے کا ہے مجبور؟''
''وہ کہتی ہے...''
''کیا کہتی ہے سر؟'' مہتہ اب اپنی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا کیسے رہ سکتا ہے؟ ''کیوں سر، آپ وہیں بیٹھیے گا؟''
انورنجن کی بھنویں کچھ سکڑیں۔ مہتہ نے سمجھ لیا۔ وہ بولا، ''اوہ! میں سمجھ گیا سر!''
انورنجن نے سمجھایا، ''اس میں سمجھنے بوجھنے کی کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ کسی دوسرے ٹیبل پر کام نہیں کر سکتی۔''
''تو، دے دیں نا اپنا بڑا ٹیبل!''
''وہ بھی نہیں دے گی؟ دوتوں ٹیبل رکھے گی؟''
''اسٹور میں نیا ٹیبل کہاں سے ہوگا؟''
''ذرا اسٹور ڈائل کرو، جھا۔''
مہتہ اسٹور کلرک سے پوچھتا ہے، ''ہاں، بنر جی دادا! سنیے، اسٹور میں کوئی سیکریٹریٹ ٹیبل... ٹیبل نیا کوئی ہے؟ ایں؟ ہے؟... دل لگی چھوڑیے دادا۔ بڑے بابو کے لیے۔ نہیں؟'' مہتہ کے چہرے پر کھجلاہٹ ہوئی— کسی زخم کے نشان پر۔
سین نے ہنس کر پوچھا، ''کیا بولا بنر جی دادا؟''
''پگلو ہیں یہ بنر جی دادا بھی! کہہ رہے تھے کہ ابھی شیشم کا پیڑ کٹاوے گا، چرائی پھڑائی ہوگی، تب جا کر ٹیبل ہوگا۔ پیڑ میں نہیں لگتا! ہنھ!''
ٹرنگ... ٹرنگ... ٹرنگ...
''ہاں، گپتا بول رہا ہوں۔ جی؟ پھر میں کس ٹیبل پر؟ اسٹور میں نہیں ہے... عجیب بات ہے۔ کام تو مجھے بھی کرنا ہے۔ جی؟ لیکن، میں بڑے صاحب سے کیوں کہوں؟ آپ ہی کہیں... آئی ڈونٹ تھنک...'' کھٹ!
ٹیلیفون پر بات کے دوران بھی بابوؤں کے مکھڑے پر جوش اور خوشی کی لہریں دوڑتی رہیں۔

Scanned with CamScanner

اس کے بعد ہر ایک نے اپنے موڈ اور منھ کے مطابق مدرا بنائی۔

بندا مہاراج کہتے ہیں، ''مبیل میں کیا ہے ایسا؟''

مہتہ نے ایسا منھ بنایا جیسے ڈرباداس نے اسے چھڑی سے پیٹا ہوا بھی ابھی۔ سین بولا، ''سالا، کاٹھ کا چیز کا واسطے اتنا درد! اور انسان کے واسطے کچھ نہیں — دل میں؟''

انورنجن چپ رہا۔ نگینہ پرساد کی عادت پر اس کی نظر گئی۔ ورق الٹتے الٹتے زبان سے انگلیاں چپکیں۔ نگینہ پرساد صفحے الٹتے ہوئے بولا، ''بہت سے خود غرض لوگوں کو دیکھا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ... چپاک چٹ چٹ۔''

بنرجی دادا اسٹور بابو نے آکر نئے بڑے بابو سے اپنا تعارف کرایا۔ بولا، ''دیکھیے، آپ ہمارے بڑے بابو ہیں۔ لیکن عمر میں ہم آپ سے بڑا ہے! مبیل آپ ہرگز مت دیجیے صاحب۔''

''بہت چھوٹے دل کی ہے۔''

''دل میں رحم اور ہمدردی کا نام نہیں۔''

''کسی کی نوکری کھاتے وقت بھی ایسی ہی ہنسی اس کے چہرے پر رہتی ہے۔''

''آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے!''

''بھگوان نے عورت بنا کے کیوں بھیجا اسے؟''

''خیلے ہے! اتنا روپ مفتے چلا گیا!''

انورنجن سن رہا ہے ایک ایک تبصرہ۔ لیکن کوئی ڈرباداس کے کردار پر انگلی نہیں اٹھاتا۔ ظالم، پتھر دل، خود غرض — سب کچھ کہہ رہے ہیں لوگ۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ حسن اور شباب کے سہارے اس نے ترقی کی ہے — کوئی یہ نہیں کہہ سکتا۔

مہتہ بولا، ''ایسی ضد تو نہیں کرنی چاہیے۔ اچھا، لیٹ می سی...''

مہتہ دفتر سے باہر نکلا۔ جھا نے سین کے کان میں کہا، ''سالا چلا اب 'گو بٹوینی' کرنے۔''

سین نے آنکھ دبا کر کہا، ''بیٹا، دیکھنا اب کھیل۔ کھیل تو اب شروع ہوا ہے۔''

مہتہ لوٹ آیا۔ ڈرباداس کو اتنا بے چین کبھی نہیں دیکھا مہتہ نے۔ کسی نے بھی نہیں۔ روپ کے پجاری بسنو سنگھ چپراسی نے بھی نہیں۔

بسنو سنگھ پچھلے سات سال سے مس داس کی بنا پیسے کی غلامی کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ بھگوان نے اتنے دنوں کے بعد اس کی طرف دھیان دیا۔ آج ہی وہ گزارش کرنا چاہتا تھا کہ گھر پر بھی اس سے کام لیا جائے۔ بالکل کام کرے گا بسنو سنگھ، پیر میں جوتی بھی پہنا دے گا۔ لیکن آج تو ایسا من اچاٹ ہے مس صاحب کا کہ ایک پل چین سے بیٹھتی ہی نہیں۔

بندا مہاراج بڑے صاحب سے پوچھنے گئے کہ اس پورنیا کی رات میں بھی پوجا کرانے کے لیے کوئی پروہت چاہیے کیا؟ بڑے صاحب مس داس سے کہہ رہے تھے، ''نہیں۔ یہ کیسی لڑکپن بھری باتیں کرتی ہیں، آپ؟ آپ دو دو ٹیبل رکھیں اور... آخر وہ کہاں کام کرے گا؟ آخر اس ٹیبل میں کیا ہے؟''

مس ڈربا التجا بھرے لہجے میں بولی، ''سر، وہ ٹیبل تو مجھے چاہیے ہی — چاہے جیسے بھی ملے۔ میں نیا ٹیبل دے رہی ہوں اپنا۔''

تب بڑے صاحب نے بات بدل دی، ''اونہوں! وہ ٹیبل اے بی ایم کے لیے ہے، ہیڈ کلرک کو نہیں دیا جا سکتا۔ اور آپ دینے لینے والی کون ہوتی ہیں؟''

بڑے صاحب نے جان بوجھ کر رخ کڑا کر لیا۔

''سر، تب میں کوئی کام نہیں کر سکوں گی۔''

بڑے صاحب کے چہرے پر اب جھنجھلاہٹ صاف نظر آنے لگی۔

اس سے پہلے ڈربا داس نے ایسی جھڑکی نہیں سنی تھی — کسی بھی بڑے صاحب کی — اور نہ دیکھی تھی ایسی جھنجھلاہٹ۔ وہ بولی، ''سر، سینٹی مینٹل کہیے یا پاگل پن۔ میں کسی کو اس ٹیبل پر نہیں بیٹھنے دوں گی، ہرگز نہیں...''

بڑے صاحب گھر بیٹھے ماہر نفسیات بنیے رسالے کے مستقل خریدار ہیں۔ مس داس کی باتوں سے کسی نفسیاتی الجھن کا پتا چلتا ہے — ضرور؟ بولے، ''مس داس میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ مان لو، تمھارا ٹرانسفر ہو گیا کلکتہ۔ تو کیا کلکتہ لے جاؤ گی ڈھو کر؟''

''جی، ضرور ایسا ہی چاہوں گی۔''

''اور فرض کرو...''

''نوکری نہ رہے؟ تب کمپنی سے درخواست کروں گی کہ یہ ٹیبل میرے ہاتھ بیچ دے۔''

''تیرے بل!۔ ٹھیک ہے، آپ جائیے۔ میں ہیڈ کلرک کو بلاتا ہوں۔''

بڑے صاحب نے انورنجن سے پوچھا، ''آپ ہی بتلائیے، میں کیا کروں؟''

بڑے صاحب نے مس داس سے فون پر کہا، ''آپ بیکار ہی چھوٹی سی بات کو لے کر ایک مسئلہ پیدا کر رہی ہیں۔ آج نئے عہدے کا کام ہی بکھیڑوں سے شروع کر رہی ہیں آپ۔''

انورنجن گپتا کو بسوسنگھ نے پھر سلام لا کر دیا۔ مس ڈرباداس کا۔

اس بار انورنجن نے ڈرباداس کے حسین چہرے پر ابلا ناری کی بے بسی دیکھی۔ تھکی تھکی، کپڑے بے ترتیب، سرکی ہوئی ساڑھی ۔ سامنے سے۔ انورنجن کو یاد آیا۔ کلکتہ میں سیر سے لوٹتے وقت ڈربا اسی طرح تھکی تھکی سی تھی۔

''مسٹر گپتا۔''

''حکم۔''

''حکم نہیں... آپ وہ ٹیبل مجھے دے دیں۔''

جنرل سیکشن میں ایک بابو نے ہتھیلی پر انگلی گھما کر کہا، ''لگا ہے لکڑ پیچ!''

مہتہ نے اسٹور بابو بنرجی دادا سے 'فونافونی' کی، ''ہاں دادا۔ آپ وہی بات بولیے کہ شیشم کا پیڑ کٹے گا...''

سبھی بابو خوش ہیں... کرائسس، پرابلم اپنی جگہ پر جہاں کا تہاں، اور گھڑی کی سوئی آگے بڑھتی گئی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ!

دوسرے دن سبھی نے حیرت سے سنا۔ مس داس اچانک بیمار ہو گئی ہے۔ ایک ہفتے کی چھٹی کے لیے درخواست بھیجی ہے اس نے!

پانچ ہی دنوں میں انورنجن نے اپنے دفتر کے ہر جاندار کو تھوڑا بہت پہچان لیا ہے۔ ایک سے ایک کام چور پڑے ہوئے ہیں یہاں۔ پرلے درجے کا چاپلوس گلشن مہتہ، جسے مکھن مہتہ کہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

جو بھی ہو، مس داس کام کرنا جانتی ہے۔ کام سے اسے لگاؤ بھی ہے۔ جس فائل میں ہاتھ لگاتی ہے، وہ آئینے کی طرح صاف! کہیں کوئی بھول چوک نہیں، الجھن نہیں! لیکن ٹیبل کے لیے اس کی ضد؟ کیا کہا جائے اس کو؟ آخر بات تو ہو گی کوئی؟

مہتہ نے کہا، ''سر، میں جانتا ہوں وجہ۔''

انورنجن نے پوچھا، ''کیا وجہ ہے؟''

مہتہ انورنجن کے پاس گیا۔ پھر مدھم آواز میں بولا، ''مس داس کے سینے پر — ٹھیک کالر بون کے نیچے — ایک روپیہ بھر گول — ایگزیما کا چکتا ہے۔ ٹیبل کے اس کونے سے وہ وقت بے وقت کھجلاتی...''

''مہتہ صاحب! آپ اپنے اے بی ایم کے بارے میں ایسی اوٹ پٹانگ بات میرے سامنے نہ بولیں تو اچھا ہے۔''

جنت کی حور ڈربا کے جسم میں ایگزیما کا داغ؟ دھت! اس نے مہتہ کو اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ دنیا بھر کی بات کوئی اس سے پوچھے... سین نے کل کہا، ''ایک دن بڑا صاب بولا — مہتا گدھا کا مافک بولتا ہے۔ بس مہتا جھٹ ڈھیچوں ڈھیچوں بولنے لگا۔ واہ بابا مہتا! تمھاری جوڑی پورے بھارت میں نہیں۔''

ایسے موقعوں پر مہتہ سڑی مچھلی، بھوکا بنگالی اور پانتا بھات وغیرہ کہہ کر سین کو کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس دن دفتر کے بعد مہتہ دوڑا گیا مس ڈربا کے ڈیرے پر۔ ڈربا باہر لان میں اداس بیٹھی تھی۔ مہتہ پاجی کتے کے ڈر سے پھاٹک کے اندر نہیں گیا۔ باہر سے ہی اس نے ڈربا کو پکار کر کہا، ''آج ڈی ڈی ٹی پاؤڈر اور گیمکسن — دونوں ملا کر ٹیبل کو ڈس انفکٹ کیا گیا ہے۔''

ڈی ڈی ٹی...! یہ سن کر ڈربا کو ایسا لگا کہ وہ بیہوش ہو جائے گی۔ ساتویں دن معلوم ہوا، مس داس نے اور بھی چار دن کی چھٹی بڑھانے کے لیے درخواست بھیجی ہے...

انورنجن گپتا نے — بڑے صاحب کے حکم کے مطابق — اسسٹنٹ برانچ منیجر کے ذمے

قاعدے کے مطابق دیے جانے والوں کاموں کی فہرست تیار کی۔ مس داس کی غیر حاضری میں اس نے کچھ کام بھی کر دیا ہے۔

اس دن پھر ٹیبل کا ذکر چھڑا۔

سین نے پوچھا، ''ٹیبل پلِنگ ہے کیا؟... اسی واسطے! ہاہاہا!''

مس داس کی بڑھائی ہوئی چھٹی بھی کٹی ایک ایک کر کے تین دن!

اس دن دفتر سے لوٹ کر انورنجن نے کہا، ''ماں، میں جلدی سے نہالوں۔ چلو، آج تم کو آشرم دکھلا لاؤں یہاں کا — رام کرشن آشرم۔ آج وہاں کسی سوامی کا پرَوَچن (وعظ) ہے۔''

انورنجن باتھ روم سے نکلا۔ ماں نے اسے بتایا، ''ایک عورت ملنے آئی ہے۔''

''عورت؟'' انورنجن حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا — ارے یہ تو ڈربا داس ہے! ماں کہتی ہے، عورت۔ ماڈرن سلیولیس بلاؤز اور کانجی ورم ساڑھی کا یہ میچ — اخباروں میں روز چھپنے والے ایک اشتہار کی ماڈل جیسی لگ رہی تھی وہ۔ کیا ہو گیا ہے آج ڈربا داس کو؟

''نمسکار! اب کیسی ہے آپ کی طبیعت؟ کیا ہوا تھا؟''

ڈربا چپ رہی۔ انورنجن کی ماں دو پیالی چائے دے گئی۔ انورنجن نے تعارف کرایا، ''ماں، آپ ہیں ہماری اے بی ایم — مس ڈربا داس! اور... میری ماں!''

ماں رسوئی میں چلی گئی۔

''کیا آپ کی ماں ہی کھانا بناتی ہیں، اب بھی؟''

''جی، میری خوش قسمتی! ماں کے ہاتھ کا...''

''جی نہیں! اس معنی میں میں بھی خوش قسمت ہوں۔''

''آپ ہر معنی میں خوش قسمت ہیں۔''

انورنجن نے پہچانا، یہ کلکتہ والی ڈربا داس ہی ہے۔ لباس ذرا زیادہ جدید ہے، صرف یہی فرق ہے۔

''تب؟ کیسا لگ رہا ہے پٹنہ؟''

Scanned with CamScanner

''اچھی جگہ ہے۔''

''خاک اچھی ہے! کلکہ... بمبئی سے بھی اچھی؟''

کلکتہ کہتے وقت کیوں دکھائی دیا ہلکا سا خوف دُربا کی آنکھوں میں؟ پھر کچھ لمحوں کی خاموشی۔

''تو کل آپ دفتر آ رہی ہیں نا؟''

''کل؟'' درگا خواب سے جاگی جیسے۔ بولی، ''کل؟ میرا آنا آپ پر... تم پر منحصر ہے۔''

''مجھ پر؟''

''ہاں، تم پر۔ انورنجن بابو، تم پر۔ میں نے کہا نا، وہ نیبل کسی اور کے استعمال میں رہے یہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔ اس کے بنا... جانتے ہو؟ اس عرصے میں میں نے ہر رات خواب میں اس نیبل کو دیکھا۔ دیکھا، وہ نیبل مجھے مل گیا ہے۔ پھر چھین لیا گیا ہے۔ ایک بڑی جنگ ہو گئی — مار کاٹ، دنگے... نیبل میں آگ لگا دی گئی ہے۔ میرا نیبل جل رہا ہے، دھوں دھوں کر کے... کتنے ایسے ہی برے خواب۔''

''مس داس، ابھی حیرت میں ہیں...''

''وہ میں جانتی ہوں۔ میں لوگوں کی حیرت اور بے چینی دور کرنے کی پابند نہیں ہوں۔ تم سے کہوں — کوئی عورت مردوں کے پاس پاؤں پھیلا کر، ہاتھ پسار کر، جی کھول کر بیٹھ سکتی ہے بھلا؟ بولو۔''

انورنجن کا چہرہ نہ جانے کیوں بگڑ سا گیا۔

دُربا لجاجت سے بولی، ''گپتا، تم تو ایسے نہیں تھے! تم اتنے کٹھور بن گئے کہ ڈی ڈی ٹی چھڑکتے وقت بھی تمھیں رحم نہیں آیا؟ تم زور زور سے درازوں کو کھولتے، بند کرتے ہو؟ سین اس پر گھونسے مارتا ہے؟ تم نے کیل ٹھونک دی؟ کیوں؟ کیوں گپتا؟''

انورنجن نے دیکھا، بولتے وقت دُربا کی نشیلی آنکھیں اور بھی نشیلی ہو جاتی ہیں۔ انگلیاں ایک لے سے حرکت کرتی ہیں۔

دُربا اٹھی۔ کھڑکی پر گئی۔ ناک صاف کی۔ پھر کلکتے والی دُربا لوٹ آئی، جو ڈکار لے، دانت سے ناخن کترے یا ناک جھاڑ کر صاف کرے، یا چہرہ بگاڑ کر خوف کا اظہار — ہر حالت میں سندر ہی

Scanned with CamScanner

لگتی ہے۔ نئے نئے روپ میں دیکھوں تمھیں ہر لمحے!

''تم...''

انورنجن نے کچھ خبردار کرنے کے لہجے میں کہا،''معاف کیجیے مس داس۔ آپ مجھے تم کہتی ہیں، لیکن میں آپ کو تم نہیں کہہ سکتا۔''

''میں تم؟ میں تمھیں تم کہتی ہوں؟... نہیں نہیں، میں تم کو اب آپ ہی کہوں گی۔ ٹھیک ہے؟ تم بھی تم کہونا؟ کیوں نہیں کہہ سکتے؟ سلی... سنو گپتا، ٹیبل کے مسئلے پر سوچ بچار کیا ہے میں نے — سات دنوں تک۔ بڑے صاحب کا کہنا ہے، نیا ٹیبل تم کو نہیں دیا جا سکتا... دیکھو گپتا، بس ایک راستہ ہے۔ مجھے امید ہے، تم اب ضد نہیں کرو گے۔''

''ضد؟ میں نے کی ہے مس داس؟''

''کیوں! صرف ڈربا نہیں کہہ سکتے؟ اچھی بات! اب تم نے انکار کیا تو میں سمجھوں گی، تم چاہتے ہو میں نوکری چھوڑ دوں۔ اتنے بڑے کنبے کا سارا بوجھ میرے ہی سر ہے۔ معلوم ہے تم کو؟ نوکری چھوڑنے پر بھی — اس ٹیبل کے بنا کیسے جی سکوں گی میں؟''

''مس داس، آپ مجھے بتائیے، آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''نہیں، پہلے وعدہ کرو، تم مانو گے!''

ٹھیک اسی طرح پچھلے سال ڈربا نے وعدہ لیا تھا،''بولو، میری مدد کرو گے نا؟'' انورنجن نے پہلے ہی زبان دے دی۔''مانوں گا، کہیے۔''

''سچ؟ دیکھو، کام کا جو سلسلہ ہے، اس وجہ سے تم کو زیادہ تر میرے ہی چیمبر میں رہنا ہوگا۔ یاد ہے، تم ہی نے تو کہا تھا کہ یہ نئی اسکیم اے بی ایم والی کیا ہے — سینئر ہیڈ کلرک یعنی اسسٹنٹ برانچ منیجر۔ تو کیوں نہیں تم میرے چیمبر میں ہی بیٹھتے؟ بات یہ ہے کہ ٹیبل میرے چیمبر میں رہے گا، میری آنکھوں کے سامنے رہے گا، تو تم زور زور سے درازوں کو کھول بند نہیں کرو گے۔ ہتھوڑے سے کیل نہیں ٹھونکو گے۔ میری موجودگی میں کم سے کم...''

انورنجن نے پہلے ہی زبان دے دی تھی۔ لیکن ڈربا کو یقین نہیں آیا۔ اس نے بار بار پوچھا، ''بولو، تمھیں کوئی اعتراض ہے؟ سچ؟ کل پھر مکر تو نہیں جاؤ گے؟ کسی کے بہکاوے میں تو نہیں آ جاؤ

Scanned with CamScanner

گے؟ وہ گلشن مہتہ بڑا پاجی ہے۔ بولو...''

آخری جملہ کہتے وقت دُربا نے انورنجن کا ہاتھ پکڑلیا۔ ''بولو!''

انورنجن کی ماں نے پوچھا، ''اب تو آشرم نہیں جاسکو گے بھیا، پیڑھی ڈال دوں چوکے میں؟''

دُربا ان گنت شکریہ ادا کرنے والے لہجے میں بولی، ''تو میں چلی اب۔ ہیں؟ کل دس بجے سے پہلے ہی آ و نا! بڑے صاحب ساڑھے نو بجے ہی آجاتے ہیں... بعد میں بھی آجائیں گے تو پھر ٹیبل کھینچ تان...''

''نمسکار۔''

انورنجن کو لگا، دُربا اسے چابک سے پیٹ کر چلی گئی، شٹ اپ! شٹ اپ!

دوسرے دن دُربا نو بج کر پچیس منٹ پر ہی دفتر آ گئی۔

بڑے صاحب کی گاڑی ساڑھے نو بجے پورٹیکو میں آکر لگی۔ دُربا نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

''کیسے مس داس، اب کیسی ہیں؟''

''اب ٹھیک ہوں سر،'' دُربا مسرور لہجے میں بولی۔

صاحب اندر سے حیران ہوئے، اوپر اوپر سے مسکراتے رہے۔

دُربا بڑے صاحب کے ساتھ ان کے چیمبر میں گئی۔ بڑے صاحب کا پیون جب تک چیمبر میں رہا، وہ چپ رہی۔ اس کے باہر جانے کے بعد دُربا نے صاحب کے موڈ کو پرکھنے کی کوشش کی۔ پھر درخواست کرنے لگی، ''سر، وہ ٹیبل کا مسئلہ...''

بڑے صاحب ابل پڑے، ''سنو بھئی مس داس، میں اب اس مسئلے یا پرابلم کے بارے میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتا۔ آپ لوگ ٹیبل کرسی کے لیے بچوں کی طرح لڑیں گے تو مجھے مجبوراً جی ایم کو لکھنا پڑے گا... فنی!''

''نہیں سر، اب کوئی پرابلم نہیں ہے۔ سب طے ہو گیا۔''

دُربا نے مسئلے کا حل تفصیل سے بتایا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کل شام کو انورنجن کے ڈیرے پر جاکر اسے منا آئی ہے۔

Scanned with CamScanner

بڑے صاحب نے اس فارمولے پر سوچا، ٹھیک ہے۔ دیکھا جائے کہاں تک اور یہ انورنجن گپتا — ہیڈ آفس سے لے کر بورڈ کے سبھی اراکین جس کی تعریف کے پل باندھ چکے ہیں، یہی ہے وہ ذمہ داری سے کام کرنے والا شخص؟ بنا ریڑھ کی ہڈی والا جاندار؟ ... ٹھیک ہے، اُدھر جنرل سیکشن میں مہتہ کو موقع ملے گا ... ڈوسائل مہتہ۔ ہینڈی اینڈ ہیلپ فل مہتہ اور اس شریف نفس انورنجن میں کیا فرق ...؟'' ٹھیک ہے۔ لیکن اگر گپتا کو کوئی اعتراض ہو؟''

''اسے کیا اعتراض ہوگا؟ سر، وہ آ ہی رہا ہے۔''

دس بجے سے پہلے ہی ڈُربا داس اپنا چہیتا ٹیبل لے آئی اپنے چیمبر میں۔ ٹیبل لاتے وقت وہ مزدوروں کے ساتھ تھی — کہیں ٹھیس نہ لگ جائے۔ آخر کہاں تک بچائے کوئی؟ کانچ کا تو نہیں ٹیبل۔ ذرا سی ٹھیس لگی، چیخ اٹھی ڈُربا داس۔

چیمبر کے ایک حصے میں ٹیبل کو نہایت باعزت طریقے سے رکھا گیا۔ بسنو سنگھ زور زور سے جھاڑن مار کر دھول صاف کرنے لگا۔ چلا اٹھی ڈُربا داس، ''اے اے جنگلی! اس طرح زور زور سے کیوں مارتا ہے؟ لاؤ ڈسٹر۔''

ڈُربا نے اپنے ہاتھوں سے ٹیبل کی دھول کو جھاڑا — ہولے ہولے ... ''ہائے رے! صرف پندرہ دن میں تمھارا یہ برا حال؟ اب جا کر جان میں جان آئی ہے۔ میں نے سمجھا تھا اب نہیں پاؤں گی تم کو۔ لال روشنائی گری کیسے؟'' ٹیبل جھاڑ پونچھ کر اس نے گھڑی دیکھی۔ دس بج رہے ہیں۔ گپتا آتا ہی ہوگا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ہینڈلوم کے پردے پر بھرت ناٹیم کی مُدرا میں کھڑی عورتوں کی قطار۔ اس نے دونوں بانہوں کو دونوں طرف پسار کر ہمیشہ کی طرح ٹیبل کے ٹاپ گلاس پر اپنا ایک گال رکھا ... اوہو! دو ہفتے بعد لمس کا سکھ۔ سی ی ی ... پھر دوسرا گال۔ سی ی ی ... روم روم میں لذت کا احساس۔

ٹرنگ!

''حضور۔''

بسنو سنگھ اندر آیا۔ ڈُربا نے جھٹ پٹ خود کو سنبھالا۔ '' کچھ نہیں، باہر جاؤ۔ کال بیل آپ ہی بج اٹھی کیسے؟''

بڑے صاحب نے دیکھا— پردے کے اس پار دو پاؤں۔ انورنجن گپتا آرہا ہے۔ صاحب نے ایک موٹی فائل کھول لی۔ انورنجن آکر کھڑا رہا۔ بڑے صاحب کی نظر فائل پر جمی رہی۔ ''سر، کیا میں بیٹھ سکتا ہوں— تھوڑی دیر؟''

''اوں؟ ہوں۔ بیٹھو۔ کیا ہے؟''

درخواست۔ ایک نہیں، دو؟

''کیا ہے؟''

ایک میں ڈیڑھ مہینے کی چھٹی کی گزارش۔۔۔ ماں پریاگ جائیں گی تیرتھ یاترا پر۔ اکلوتا بیٹا ہے وہ، اس لیے ساتھ جانا ضروری۔۔۔ دوسری درخواست کہ۔۔۔ پٹنہ کی آب وہوا صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ اسے یا تو ہیڈ آفس کلکتہ بھیج دیا جائے یا پھر بمبئی۔ نہیں تو۔۔۔ نہیں تو، اس درخواست کو استعفیٰ سمجھا جائے۔

''دیکھو گپتا، اتنے جذباتی نہ ہو۔۔۔''

''نہیں سر، میں نے بہت سوچ سمجھ کر دیکھ لیا ہے۔ میری ماں بھی نہیں چاہتی۔''

بڑے صاحب نے درخواست کی زبان اور انورنجن کے چہرے کی کیفیت دیکھ کر سمجھ لیا، یہ سچ کہتا ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ لوگ جھوٹ نہیں کہتے تھے۔ انورنجن گپتا۔۔۔

انورنجن نے آج کی چھٹی مانگی— زبانی۔ مل گئی۔

ہر سیکشن میں یہ خبر پھیلی— پھیلتی گئی۔

ایک ساتھ بیس ٹائپ رائٹروں کھٹ کھٹ بند ہو گئی۔ سبھی بابوؤں نے ایک ہی ساتھ پانی مانگا،

''پانی!''

''آں؟''

''وہی ہوا جو مس داس چاہتی تھی۔''

''تریاچرتر۔۔۔''

''غضب۔۔۔ عجب۔۔۔ عورت!''

''گپتا صاحب چلے گئے؟''

ڈربا کو بھی خبر ملی۔

کچھ دیر تک سناٹے میں رہ گئی۔اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔استعفیٰ ؟ چھٹی؟ وہ آیا نہیں یہاں؟لیکن اس نے تو وعدہ کیا تھا؟

اس کے چہرے پر فوراً لالی لوٹ آئی۔وہ اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھی۔اپنے چہیتے ٹیبل کے پاس گئی۔کرسی پر بیٹھی۔ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی، وہ کھلتی چلی گئی... استعفیٰ دے یا چولھے میں جائے بیوقوف انورنجن گپتا۔... میرا دھرم بچ گیا... میری عزت بچ گئی... تم میرے ہی رہے... میرے ہی۔کانٹا نکل گیا! آہ!

ٹیبل کے ٹاپ گلاس پر اپنے گالوں کو باری باری رکھتی، لمس کے سکھ سے لرزتی، اس کے پورے بدن میں لذت کی سنسنی! اس کی مسکراہٹ کھلکھلاہٹ میں بدل گئی۔

مہتہ اس موقعے پر کئی غیر معروف انگریزی لفظ ڈھونڈ کر لے آیا تھا، مبارکباد دینے کے لیے۔ وہ چیمبر میں گھسا۔آہ! اس نے دیکھا، مس ڈربا داس اے بی ایم، ٹیبل پر بانہیں پسارے، شیشے پر گال رکھ کر کھلکھلا رہی ہے یا رو رہی ہے! آنکھوں میں آنسو ہیں اور ہونٹوں پر یہ کیسی ہنسی؟ یہ کیسا سکھ پا رہی ہے مس ڈربا داس؟ یہ کیسا سکھ دکھ؟ یہ کیا ہے...؟

مہتہ کو لگا، وہ کسی عریاں منظر کے سامنے کھڑا ہے، گنگ! نہیں، یہ منظر دیکھنے کے لائق نہیں ہے۔

❁❁

Scanned with CamScanner

پھنیشورناتھ رینو

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

لکیریں، دائرے

اسپتال کے سرجیکل وارڈ سے میں سدا دور ہی دور رہا کرتا تھا۔ کبھی کسی زخمی جاننے والے یا بیمار دوست کو دیکھنے کے لیے گیا تو وارڈ کے برآمدے پر ہی پسینے میں لت پت اور سر میں چکر۔ چاروں طرف مٹی کے برتنوں کی طرح ٹوٹے پھوٹے لوگ۔ سفید پٹیوں اور پلاسٹر سے بندھے ان کے انگ انگ۔ چیرے ہوئے پیٹ سے لگی ہوئی ربر کی نلکی۔ پلنگ کے پاس اسٹینڈ سے لٹکتی ہوئی خون یا پلازما یا سیلائن کی بوتل۔ ہوا میں ایتھر کی بو اور چیخ، کراہ، پکار... اس بار بیمار ہو کر جب سے سرجیکل وارڈ میں بھرتی ہوا ہوں، سب کچھ نارمل لگتا ہے۔ گھبراہٹ نہیں۔ سر میں چکر نہیں۔ کہیں کوئی بدبو نہیں۔ جب سے ہوش میں آیا ہوں، اپنی حالت پر خود ہنس کر ساری تکلیفیں سہہ لیتا ہوں۔ آج اپنی اس بے بسی پر مجھے مہابھارت کے بھیشم پتامہ کی یاد آئی۔ مہابھارت کی وہ تصویر آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ خون کی بوتل، بیڈ ریسٹ، رائس ٹیوب، سیلائن کی بوتل سے لگی ربر کی نلکی میرے پاؤں کی نس میں بندھی ہوئی... اُما سے میں نے کہا: ''میں بستر پر سوئے ہوئے بھیشم پتامہ کی طرح نہیں لگ رہا کیا؟''

اُما کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ بولی: ''کل نائی بلا لاؤں گی... ڈاڑھی کتنی بڑھ گئی ہے!''

میں نے پہلے نائی کو بلانے کی مخالفت کی، پھر کچھ سوچ کر کہا: ''آج ہی کیوں نہیں بلا لاتیں؟''

سوچا، آج اگر حجامت نہیں بنی اور آج ہی کچھ ہو گیا — کچھ ہو گیا؟ صاف صاف کیوں نہیں

کہ اگر مر گیا— تو آخری تصویر کتنی بری آئے گی: بڑھی ہوئی داڑھی، کھلا ہوا منہ، چہرے پر دہشت ... نہیں نہیں، آخری تصویر میں میرے چہرے پر مسکراہٹ رہے، مرتے مرتے کوشش کروں گا... اسمائل پلیز!

جلدھر جی کی یاد آتی ہے۔ جلدھر جی کی ارتھی کے جلوس کی تصویریں ماڈھری، فلم فیئر، چترپٹ جیسے بڑے رسالوں میں چھپی تھیں ... چہرے پر کیسا سکون تھا! ہونٹوں پر کھلی کھلی مسکراہٹ، ماتھے پر چندن، پھول مالاؤں سے ڈھکا مشہور سنیما گیت کار جلدھر جیسے آنکھیں موند کر کسی مدھر گیت کا مکھڑا سوچ رہا ہو! لیکن پشپ لال! جدید ترین باغی شاعر، کہانی کار پشپ لال کے ایک درجن سے بھی زیادہ کیمرے والے دوست تھے۔ جب وہ زندہ تھا تو اس کے دوستوں نے اس کی کئی ننگی تصویریں بھی اتاری تھیں۔ لیکن اس کی آخری تصویر کسی کے پاس نہیں۔ کسی نے اتاری نہیں یا اس نے موقع ہی نہیں دیا۔ پشپ لال کے پیٹ میں جب ایک آدھ پیگ 'مال' پہنچ جاتا، یعنی جب وہ موج میں آتا، تو ہر بات کے پہلے میتھلی کی ایک بھدی سی گالی اگلتا— دھچو وو...! سنا ہے، مرنے کے پہلے اس کے منہ سے یہی گالی نکلی تھی۔ اس کے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اس نے ایشور کو گالی دی تھی۔ وہ جسے بھی گالی دے، میں اس کے مرے ہوئے چہرے کا تصور کرتا ہوں۔ دونوں ہونٹوں کو سکوڑ کر کے گول بناتے ہوئے وہ گالی داغتا تھا— دھچو وو...! سامنے والے وارڈ میں پچھلے سال پشپ لال نے چولا چھوڑا تھا۔ میں جانتا ہوں، میری بیماری کی خبر سن کر لوگوں نے جلدھر اور پشپ لال کو یاد کیا ہوگا۔ کس نے کیا کہا ہوگا، اندازے سے ہی میں صحیح صحیح بتا سکتا ہوں۔

اُما اس طرح فکر مند ہو کر کیوں آ رہی ہے اُدھر سے؟ کہتی ہے، ''بلڈ بینک میں او گروپ کا بلڈ نہیں ہے۔ کل کوئی او گروپ کے خون کا عطیہ دینے والا نہیں آیا تو کیا ہوگا؟'' اُما فکر مندی میں پھر اُدھر چلی گئی۔

سالا! نہ جانے کیسے کیسے اور کس کس پیشے کے لوگوں کے خون! ایک دن ناغہ کر کے تین سو سی سی خون بوند بوند کر ڈیڑھ گھنٹے تک میرے جسم کے اندر پہنچایا جاتا ہے اور ڈیڑھ گھنٹے تک بے حس و حرکت چت لیٹا ہوا میں اسٹینڈ سے لٹکتی الٹی بوتل کی طرف دیکھتا رہتا ہوں۔ ربر کی نلکی کے بیچ سے لگے کانچ کے بلب میں ٹپکتے ہوئے گاڑھے خون کی بوندوں کو گنتا ہوں۔ پھر بوندوں کے ٹپکنے کی تال پر ذہن

Scanned with CamScanner

میں ابھرنے والی باتیں خود بخود نظموں میں ڈھلتی جاتی ہیں۔

دوڑایا جارہا ہے روز، میری رگوں میں تین سوسی سی رکت
کسی حملہ آور بوچڑ برہمچاری کر پالوا ایشور کا...

اور اب کوئی میرے اندر ہی مجھے گالی دیتا ہوا کہتا ہے: سالے! اب تو شاعری کرنے لگا!
اس بار اسپتال میں ہوش آنے کے بعد ہی سے ایسا ہوتا ہے۔ جی ہی جی میں کسی مصرے کی آمد، تک بندی اور فحش محاورے گھڑنے کا کھلواڑ! کیا یہ بھی میرے مرض کا شاخسانہ ہے؟ کئی بڑی بیماریوں کے بعد ایسی ہی علامات ظاہر ہوتی ہیں... دانت سے ناخن کریدنا، بار بار ناک پونچھنا، ہاتھ کی انگلیوں کو نچانا، زبان سے ہونٹ چاٹنا...

اُما بلڈ کا پرابلم حل کر آئی ہے۔ اس کے ساتھ مسکراتی آئی ہے ایک موٹی ادھیڑ عورت۔ اُما کہتی ہے، ''ان کا بھی او گروپ ہے۔ کئی سالوں سے برابر بلڈ بینک میں بلڈ ڈونیٹ کر رہی ہیں۔''
عورت اپنے بیگ سے ایک لال کارڈ نکال کر اُما کی طرف بڑھاتی ہوئی کہتی ہے، ''ایمرجنسی میں ہمیشہ میرا ہی بلڈ لگتا ہے۔''
اُما اس سے باتیں کرنے لگی۔ وہ کل صبح آٹھ بجے آکر بلڈ بینک میں اپنا خون دے جائے گی، اور بارہ بجے سے میری نسوں میں اس اسکول ٹیچر کا خون ٹپکنے لگے گا۔ وہ سلام کر کے چلی گئی تو میرا منھ کھلا۔ ''عورت کا بلڈ؟ تس پر اس عورت کا...؟ ہرگز نہیں! کبھی نہیں! میں لوں گا ہی نہیں!''
اُما چپ رہی تو میں مسلسل دہرانے لگا، ''میں لوں گا ہی نہیں۔ نہیں لینا ہے... نہیں لینا ہے... نہیں لینا ہے...''
''کیا لڑکپن کر رہے ہو!'' اُما ہنستے ہوئے مجھے ڈانٹتی ہے۔
''میں ہرگز نہیں لوں گا!''
''مت لینا! ابھی چپ تو رہو!''
''میں چپ بھی نہیں رہوں گا! میں ابھی دودھ بھی نہیں پیوں گا! دوا بھی نہیں!''
اُما فیڈنگ کپ میں دودھ ڈال کر چمچ سے دوا ملاتی رہتی ہے اور میں کٹے ہوئے ریکارڈ کی طرح

Scanned with CamScanner

بجتا رہتا ہوں: ''دوا بھی نہیں! دودھ بھی نہیں! دوا بھی نہیں! دودھ بھی نہیں . . . !''

اگر نائٹ نرس مس نیلما نہ آجاتی تو لگا تار دس پندرہ منٹ تک آنکھ موند کر اسی طرح بولتا رہتا اور اُما ہاتھ کے فیڈنگ کپ میں چیخ چلاتی مجھے ڈانٹتی پچکارتی رہتی۔ اس لڑکی کو میں دل میں رات کی رانی کی کھلی ہوئی کلی کہتا ہوں۔ رات بھر اسی طرح تر و تازہ یہ مدھم مدھم مسکراتی اور خوشبو بکھیرتی رہے گی۔

''یہ کون سا گانا چل رہا تھا؟'' نیلما اپنی کیرالائی ہندی میں پوچھتی ہے۔

میرے منھ میں فیڈنگ کپ کی ٹونٹی ڈالتی اُما مسکرا کر جواب دیتی ہے، ''دودھ بھی نہیں، دوا بھی نہیں!''

''واہ! کتنا اچھا گانا ہے! کل سے فیڈنگ کپ نہیں، فیڈنگ بوتل لے آئیے!'' نیلما تھرما میٹر جھاڑتی آگے بڑھ آتی ہے۔ مجھے سعادت مند بچے کی طرح دودھ پیتے دیکھ کر کہتی ہے، ''دودھ پی کر خوب گانا گا!'' اُما اور نیلما ایک ساتھ ہنس پڑتی ہیں۔ نیلما بخار جانچ کر چلی گئی تو اُما اس کی نقل کرتے ہوئے بولی، ''دودھ پی کے خوب گانا گا!''

لیکن میں ہنس نہیں سکتا ہوں۔ گانا، گیت، سانگ، ٹیپ ریکارڈنگ، پلے بیک وغیرہ الفاظ سنتے ہی مجھے ہچکی آنے لگتی ہے۔ ہچکی یعنی ہکپ، جسے سات دن تک، دن رات دوا بدل بدل کر ڈاکٹروں نے مشکل سے دور کیا ہے۔ ہچکی کے بعد متلی، یعنی نوزیا۔ پھر انتڑیوں میں سویا درد دھیمے دھیمے کانٹا بن کر چبھنے لگتا ہے۔ تب شروع ہوتا ہے 'اندر کا مال باہر'— سب دوا، کھانا، گولیاں، ڈراپس ایک ساتھ باہر! اس کے بعد ہی کوما، بیہوشی!

ہچکی شروع ہوئی اور اُما ڈیوٹی روم کی طرف بھاگی۔ اُما کے ساتھ کھٹ کھٹ کرتی تیزی سے نیلما آتی ہے۔ میری نبض پر انگلی رکھتی ہے اور پھر تیزی سے ڈیوٹی روم میں چلی جاتی ہے، بڑے ڈاکٹر کو کال دینے . . .

شے بوووو . . . لگا، گنگا کے اس پار سے کوئی مجھے پکار رہی ہے۔ میں جواب دینا چاہتا ہوں، آواز نہیں نکلتی۔ آنکھیں کھلتی ہیں۔ میری ناک میں لگی آئس ٹیوب میں موٹی سرنج لگا کر نیلما میری انتڑیوں میں جمے ہوئے زہریلے سیال مادے کو کھینچ کھینچ کر باہر نکالتی جا رہی ہے۔ پاس کھڑے بڑے سرجن اچے چپ چاپ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

پیٹ کی سوجن آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔ شاید ہچکی روکنے والی کوئی سوئی لگائی گئی ہے۔ اس سوئی کے بعد ایک اِسکاچ کا نشہ سا ہو جاتا ہے۔ تو آج میں کوما میں نہیں گیا؟ کوما! ان بنارسی مزاحیہ شاعر کا نام بھول رہا ہوں جن کی ایک نظم کا ٹکڑا ہے: زندگی ایک سینٹنس ہے... کوما فل اسٹاپ...

لیکن کوما کو میں سمادھی کہتا ہوں۔ بیہوشی کو سنیاس روگ بھی کہا جاتا ہے نا؟ حیرت! بیہوشی میں دیکھے ہوئے سپنے مجھے پوری طرح یاد ہیں۔

دیکھا، سبھی لوگ پیٹ پکڑ کر جھکے ہوئے ہیں، جھک گئے ہیں۔ اچانک، جو جہاں ہے، اپنے ہاتھ کمر پر رکھ کر جھکا ہوا ہے۔ کھیت کھلیان میں کام کرتے لوگ، نہر کے کنارے کھڑے لوگ، چنے کے کھیت میں ساگ کھونٹتی ہوئی عورتیں — سبھی درد سے تڑپ رہے ہیں۔ ہوا میں ایک عجیب طرح کی کھٹاس ہے۔ سب کچھ کھٹا کھٹا۔ ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور سبھی ایک ساتھ چیخ کر اور بھی جھک جاتے ہیں۔ سب لوگوں کے جسم مڑ کر، خراب صحت کی نشانیوں جیسے... میں نے سنا، کوئی ریڈیو پر کسی اسٹیشن سے اعلان کر رہا ہے: بھائیو! بھائیو! یہ کوئی ایٹمی گڑبڑی ہوئی ہے۔ زمین پر پیٹ کے بل لیٹ جائیے۔ ویکیوم آ رہا ہے۔ ویکیوم! اویاک! اویاک! ہزاروں لوگ ایک ساتھ الٹیاں کر رہے ہیں۔ سبھی کے منھ سے ایک ہی لفظ: ویکیوم! ویکیوم! — لیکن اُما صحت مند ہے۔ دوڑی آ رہی ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، غلطی سے ایسا ہو گیا ہے۔ کس نے کی ایسی غلطی؟ یہ جان لیوا غلطی کس کی ہے؟ امریکی سائنسدانوں کی، یا روسی، یا چینی، یا پاکستانی، یا بھارتی؟ عدالتی تحقیقات ہو! غلطی کرنے والے کو سزا دو! نہیں تو گدی چھوڑ دو!

سمادھی ٹوٹنے پر اپنے چاروں طرف کھڑے ڈاکٹروں کو دیکھ کر میں پوچھنا چاہتا تھا: ''آخر کس کی غلطی تھی؟'' لیکن کچھ پوچھ نہیں سکا۔ آکسیجن سلنڈر لگی ہوئی نلی سے مجھے ناتھ دیا گیا تھا۔

دوسرا منظر: اشوک راج پتھ روڈ پر ایک بڑا سا جلوس آ رہا ہے۔ کوئی نعرہ نہیں۔ شور غل نہیں۔ جلوس قریب آتا گیا۔ سڑک کے دونوں کنارے بے شمار لوگ قطار میں کھڑے اس جلوس کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن یہ جلوس آدمیوں کا نہیں، سفید بطخوں کا ہے۔ مڑی ہوئی گردنیں، دودھ کی طرح سفید ڈینے، گلابی چونچیں... ہزاروں ہزار بطخیں پیک پیک پیک پیک کرتی ہوئی اسپتال کی سمت مڑ گئیں۔ پھر گنگا کنارے سبھی بطخیں قطار باندھ کر پانی میں اتر گئیں۔ گنگا کے اِس پار سے اُس پار تک

بطخوں کا ایک پُل بن گیا۔ نیلے پانی پر سفید پل، زندہ پل۔ پیک پیک پیک پیک پیک۔ اُما مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہے۔ شیبو! تاڑاتاڑی اُس پار چلو! پیک پیک پیک پیک۔ میں ٹٹول کر اُما کا ہاتھ پکڑتا ہوں۔ بطخ کے ڈینے پھڑ پھڑا کر میرے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ پیک پیک پیک پیک۔ میں پکارتا ہوں پر اُما جواب نہیں دیتی۔ میں اُما کا نام لے کر پکارتا ہوں، مگر میرے گلے سے بھی بطخوں کی بولی نکلتی ہے۔ پیک پیک پیک۔

ہوش آنے پر دیکھا، میرے سرہانے سے کہنی ٹکا کر اسٹول پر جھکی بیٹھی اُما سو گئی ہے۔ میں نے اُما کو پکارا، لیکن میرے منھ سے نکلا، ''ماں! ماں!''

ماں ہوتی تو اسی طرح جھکی، سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی، ''شیبو رے! اپنا گاؤں چھوڑ کر تو یہاں کیوں آیا بیٹے؟ کتنا اچھا تھا تو! کیا سے کیا ہو گیا۔ یہاں آ! لوٹ چل بیٹا! ہم نمک روٹی کھا کر رہیں گے، پیڑ کے تلے سوئیں گے مگر...''

لگتا ہے، آدھی رات گزر گئی۔ بیڈ نمبر دس کے پاس اتنی بھیڑ کیوں ہے؟ وارڈ قلی میرے پلنگ کے پاس سے آکسیجن سلنڈر گھسیٹتا بیڈ نمبر دس کے پاس جا رہا ہے۔ فرش پر بھاری لوہے کے گھسیٹنے کی آواز سے سارا وارڈ دہشت زدہ ہے۔ بیڈ نمبر پانچ پر چھرے بازی سے گھائل بہار شریف کا ٹیکسی ڈرائیور اچانک چلّانا شروع کر دیتا ہے: ''کہاں رے، چھوٹنا! کہاں ہے چوٹی والے! سامنے آ! اب نکال چھرا!''

بیڈ نمبر دس کے پاس اچانک کہرام! گردے کا مریض اسّی سال کا بوڑھا چل بسا۔ بیٹی بہو، نواسیوں پوتیوں کی بھیڑ نے رونا شروع کیا۔ اور میں ان کا رونا سن کر سمجھ جاتا ہوں، وہ شمالی بہار کے کسی گاؤں کے ہیں۔

پشپ لال اکثر کہتا — پتا نہیں اپنی بات کہتا تھا یا کہیں پڑھی ہوئی — شاعری کا صرف ایک ہی بڑا اور عظیم موضوع ہے: موت!

پشپ لال کی شاعری یا کہانی کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پشپ لال سے میری پہلی ملاقات کلکتہ کے ایک کھانٹی (خالص) بنگالی بار میں ہوئی تھی جہاں اسپیشل آرڈر دینے پر تیل میں تلی کچری (پکوڑے) اور ماں کالی مارکہ دیسی مال کی بوتل مل جاتی ہے۔ قریب ایک درجن بنگالی چھوکروں کے

بیچ کیچری کیچرتا اور غٹا غٹ ٹھرا پیتا پشپ لال اپنی انگریزی نظم زور زور سے سنا رہا تھا۔ نظم میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے پلّے دو تین لفظ ہی پڑے: ''اولومبا، لومبا، لومبا!'' اور ''کراس اور شولنگ۔''

آج دوپہر میں ہمارے ایک جاننے والے نے اُما کو آرٹس اینڈ آرٹسٹس انگریزی سہ ماہی کا تازہ شمارہ بھیج دیا ہے۔ ہمارے ایک بہی خواہ کا اس میں ایک مضمون چھپا ہے، جس میں ہمارا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ میں نے اُما کو کئی بار پڑھنے کو کہا، لیکن وہ ٹال گئی۔ بولی، ''کیا ہوگا سن کر؟ کیا فائدہ؟ کوئی غلط تھوڑی ہی لکھا ہے! تم لوگوں کے کرتوت... صحیح، صحیح...!''

اُما کی یہی عادت مجھے اچھی نہیں لگتی۔ کچھ دیر کے لیے باہر گئی تو میں نے اپنے پڑوسی کے نوجوان اٹینڈنٹ کو بلا کر مضمون پڑھنے کو کہا۔ کچھ تو اس نوجوان کے گنوارو لہجے اور تلفظ کی وجہ سے، کچھ اپنی کم علمی کی وجہ سے، میں مضمون کا پورا لطف نہیں لے سکا۔ ہاں، مرکزی خیال کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ لکھنے کا انداز یقیناً قابلِ تعریف تھا— تین سال پہلے بمبئی میں فلم کے مشہور گیت کار جلدھر کے گھر پر سال بھر تک روزانہ شام چار نامی گرامی فنکار اکٹھا ہوتے۔ وہ بھی ایک تجرباتی فلم بنانے کے سلسلے میں، اسکرین پلے، مکالمے اور گیتوں کے بول پر بحث کرنے کے لیے وہاں جمع ہوتے۔ لیکن بات کھلنے کے پہلے بوتل کھل جاتی اور بات جہاں کی تہاں رہ جاتی۔ بات کبھی شروع ہوتی بھی تو وہ آپس میں جھگڑ بیٹھتے۔ وہ یعنی جلدھر، لوک گیتوں کے گلوکار وشوناتھ، بنگال کا مجسمہ ساز اور سنگتراش رام رنجن اور برما کو اپنی جنم بھومی ماننے والا ہندی میتھلی شاعر پشپ لال، اس تحریر کے مصنف کے علاوہ۔ 'آرٹ فلم' اور 'نیو سنیما مومنٹ' کے بھی چاہنے والوں کو ان چار درویشوں سے بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ رہی ہے کہ یہ صرف خودکشی کے شوقینوں کا ایک گروہ تھا اور وہ مرنے کے لیے ہی ہر شام مل بیٹھتے تھے۔ پچھلے سال جلدھر کی موت جگر کے زخم سے ہوئی اور تین مہینے بعد ہی پشپ لال پیٹ کے کینسر سے مرا۔ اس بار پیٹ کے درد کی وجہ سے بیہوشی کی حالت میں وشوناتھ پٹنہ کے اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ اور ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ رام رنجن کو کلکتہ کی ایک طوائف کے کوٹھے کی سیڑھیوں پر نشے میں دھت اور زخمی پایا گیا۔ دونوں کی حالت گمبھیر بتائی جاتی ہے۔

اس کے بعد مضمون کا بنیادی خیال اس سوال سے شروع ہوا ہے: ایسا کیوں؟ پھر، فاضل مضمون نگار نے نفسیاتی اور فلسفیانہ تجزیہ کرتے ہوئے خود ہی اس کا جواب دیا ہے۔ ممکن ہوا تو کبھی خود ہی پڑھ کر

سمجھ لوں گا۔ ابھی میرے ذہن میں اس مضمون کے کئی الفاظ اور فقرے ہی رہ رہ کر ابھر رہے ہیں۔ پرسنالٹی ڈس آرڈر اور ایڈیپس کمپلکس... ڈیتھ وش... سیلف ڈسٹرکٹو... شوپن ہار جسٹیفائڈ سوسائڈ بٹ نیور کمینڈڈ اِٹ... اے مین از دی پروڈکٹ آف ہز کلچر اینڈ انوائرنمنٹ...

میں ادب کا ایک عام قاری! مجھے ان بحثوں سے کیا لینا دینا! اُما کبھی کبھی ایک بنگلہ محاورہ دہرا کر مجھے سمجھاتی — ادرک کے بیوپاری کو جہاز کی خبر لینے کی کیا ضرورت؟ لیکن وہ مجھے جتنا سمجھاتی، میں اتنے ہی اُتساہ سے ادب اور فن کے ذکر میں لگ جاتا۔ پشپ لال کہتا: ''شیبودا! یہ میّا ہو ہائے ہائے' یعنی لوک فوک گیت گانا چھوڑ کر لکھنا شروع کیجیے...''

میں نے لکھنا تو نہیں شروع کیا، مگر داڑھی رکھ لی۔ رام رنجن دا نے اپنے ہاتھ سے ایک دن میری داڑھی کو تراش کر الٹرا ماڈرن بنادیا اور اسی دن میری پشپ لال اور رام رنجن دا سے 'ماڈرن' اور 'کونٹمپریری' الفاظ کو لے کر مار پیٹ تک ہوگئی۔ پشپ لال جب کبھی اپنی غلط بات کو صحیح کرنے کے لیے بھنگڑ کھڑا کرتا، رام رنجن دا ایسا ہی کرتے۔ ہم میں سب سے بڑے رام رنجن دا اور سب سے چھوٹے پشپ لال — دونوں کی یہ لڑائی دیکھنے کی چیز ہوتی۔

سو سب تو ٹھیک ہے، مگر سالے تم ماڈرن ہونے کیوں گئے؟ سچ سچ، میں کیوں اس چپیٹ میں پڑ گیا؟ کیسے پڑ گیا؟ لیکن میرا کیا دوش؟

سیاست کرتا تھا، جلسوں میں نیتاؤں کی تقریر سے پہلے، بھیڑ کو شانت رکھنے کے لیے، گیت سے بہلائے رکھنے کے لیے میری ضرورت ہوتی، اور ساتھ میں گھنگھرو والی کھنجنی لے کر میں ڈانس پر الاپتا ہوا آتا۔ 'بھیّا، کِسنوا اں ہو، دشمن تو ہار بڑ کا زمیندار...!'

اگر میرے گلے میں ایک خاص قسم کی مٹھاس نہ ہوتی اور اگر لوک گیت جدید ذہن والے شہری لوگوں کے یے فیشن نہ بن جاتا، تو آج میری جگہ کہاں ہوتی؟ تب شاید سیاست نہ چھوٹتی اور پارٹی بدلتے بدلتے پتا نہیں آج کس پارٹی میں ہوتا! اگر پٹنہ میں ریڈیو اسٹیشن نہ کھلتا تو میں جو تھا وہی رہتا...

یاد آتا ہے، پہلی بار ریڈیو سے جب میں نے ''سارنگ سدا برج'' نامی گیت کہانی نشر کی تھی تو

Scanned with CamScanner

اسٹوڈیو سے باہر آتے ہی سب سے پہلے پروگرام ایگزیکٹو مس نینی گٹی نے (جن کی مادری زبان ہندی نہیں تھی) مجھے مبارکباد دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا، ''میں نے گیت کا ایک لفظ نہیں سمجھا، لیکن گیت میری روح کے اندر اتر گیا۔'' اس کے بعد سے ہر ہفتے ایک دن صبح شام میرے گیت نشر ہونے لگے۔ کچھ ہی دنوں میں لوگوں کی زبان پر میرے گیت تھے، میرا نام کلچرل پروگراموں کے پرچوں میں موٹے حروف میں چھپنے لگا۔ اُدھر فلمی دنیا میں پنجابی بھنگڑے کی لہریں دھوم مچا کر لوٹ گئی تھیں۔ نئے دور میں لوک گیت کی باری آئی اور اس کے ساتھ ہی میری زندگی میں ایک نیا طوفان چلنے لگا... بمبئی، مدراس، کلکتہ... شراب، عورت اور جوا... عیاشی ہی عیاشی... کام سے جی چرانے کے ساتھ ساتھ دھوکا دھڑی، جعلسازی... مٹی میں گڑے ہوئے دیہاتی زبان کے لفظوں کو اکھاڑ کر بے ڈھنگے پن سے درجنوں کہانیاں گھڑ کر، قدیم اور روایتی لوک کتھا کے نام پر میں نے چالاکی سے چلا دیں۔ ایک فلم کے لیے تو ڈائنوں کا اجتماعی نرتیہ گیت تک لکھ کر میں نے ایک پروڈیوسر ڈائرکٹر کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ ''جناب، نیپال کی مورنگ ترائی میں بسنے والی کوچ اور تھارو قوموں کے بھگتوں، دھامیوں کے چرنوں کی سیوا کر کے اسے حاصل کیا ہے۔'' وہ اجتماعی نرتیہ گیت بعد میں سنسر والوں نے کٹوا دیا... ہال میں بچے ہی نہیں، بوڑھے اور جوان بھی بیہوش ہو گئے تھے۔

اُما نہ ہوتی تو میں جلدھر اور پشپ لال سے پہلے ہی ہوا ہو جاتا۔ لیکن پچھلے سال اُما نے ایک دن ہار کر کہہ دیا، ''تمھاری جو مرضی ہو کرو! میں اب کچھ نہیں بولوں گی! میرے بس سے باہر کی بات ہے۔''

تب مجھے اچانک غائب ہونے کا بہانہ مل گیا اور قریب دس مہینے تک کٹھمنڈو، کام روپ، کالمپا اور سنگھ بھوم کے جنگلوں پہاڑوں میں ایک نئی تہذیب، زندگی کے ایک نئے فلسفے کا مسیحا بن کر ملکی اور غیر ملکی لڑکے لڑکیوں کے ساتھ عیش کرتا رہا۔

سالے! یہ اسپتال ہے، چرچ نہیں!

نہیں نہیں، میں کوئی اعتراف نہیں کر رہا۔ میرا مطلب ہے، میں نے کوئی قصور کیا ہی نہیں۔ اس دنیا، یعنی اس بڑے طوائف کے کوٹھے میں میں ہی سب سے بڑی پاک صاف ہستی ہوں، کیونکہ میں ہی اسے ختم کرنا چاہتا ہوں، ایک دم تباہ! اُما جاگ گئی ہے۔ میری طرف دیکھ کر کہتی ہے، ''ناک

سے ٹیوب کیوں نکال دیا؟...اب تم مجھ سے نہیں سنبھل سکتے۔''

''ناک کے اندر زخم ہو گیا ہے۔''

''کس نے کہا؟''

''کہے گا کون...؟''

اُما شاید نیلما کو بلانے گئی۔ بھور ہونے کو ہے، لیکن نیلما اسی طرح کھلی ہوئی ہے۔ کہتی ہے، ''لیجیے، نگلیے... اور تھوڑا... ٹھیک ہے، وومٹ کرے گا تو ہم دیکھے گا... ٹھیک... واہ... !ابی نلی کھولے گا تو ابی ادھر آکے پلنگ میں دونوں ہاتھ باندھ دے گا۔''

میں کیا نیلما سے پیار کرنے لگا ہوں؟ کیا اُما سمجھتی ہے کہ میں نیلما سے پیار کرنے لگا ہوں؟ دیکھتا ہوں، عشق شروع کرنے اور عشق کرنے کی واحد جگہ آج بھی اسپتال ہی ہے۔

حرامزادے! نیلما یا کسی اور کو پیار کر کے اب کیا کرے گا تو؟ جب تک سانس چلنا بند نہ ہو، جنس کی آگ شاید نہیں بجھتی۔ نیلما کو دیکھتے ہی میرے جسم کا رواں رواں بج اٹھتا ہے۔ ٹھیک پندرہ سال پہلے اُما کو دیکھ کر ایسا ہی ہوتا تھا۔

نیلما میری آکسیجن سلنڈر۔ پریم کو دوبارہ جگانے والی متھن راشی کی کنیا!

سالے، پھر شاعری؟

پشپ لال نے اپنے لیٹر پیڈ کے ایک کونے پر متھن راشی کی علامت چھپوائی تھی ــــ سمبھوگ کے لیے تیار بیٹھے ادھ ننگے مرد عورت کی جوڑی۔ پچھلے پانچ برس سے اُما میرے ساتھ نہیں سوتی۔ نہیں سوتی یعنی سمبھوگ سے دور رہتی ہے۔ وہ میرے جسم کو ناپاک اور گھناؤنا سمجھنے لگی ہے۔ اور تب سے مجھے اُما سے شرم آنے لگی ہے۔ ایک بار لڑکپن پار کرنے کے بعد، یعنی خفیہ علاقوں میں ننھے ننھے کالے کالے گھنگھریالے بالوں کی پہلی فصل کے دنوں، ایک صبح آٹھ بجے تک مجھے سوتا دیکھ کر ماں نے غصے سے جسم پر سے چادر چھین لی تھی اور چادر کے نیچے میں ایک دم ننگا تھا... شرم کے مارے میں سات آٹھ دن تک ماں سے آنکھیں نہیں ملا سکا تھا... ویسی ہی شرم! یہیں مجھ پر اپنے خاندان اور محبت کے رشتوں کو بدنام کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

یہ سب کچھ نہیں، اصل میں میں ہر طرح سے دیوالیہ ہو چکا ہوں۔ شراب؟ سالی سانپ کے

Scanned with CamScanner

زہر سے بنی ہوئی شراب بھی میں نے پی ہے۔ شراب، گانجے، چرس اور سگریٹ کی زیادتی سے میری آواز خراب ہوگئی ہے۔ یہ اب بازار میں نہیں چل سکے گی۔ میری سریلی آواز اب پھٹے بانس سے نکلنے والی آواز کی طرح ہوگئی ہے۔ اور جب گا نہیں سکوں گا تو جی کر کیا ہوگا؟ فلیٹ میں میری الماری میں اب بھی ڈمپل کی بھری بوتل کھڑی ہوگی۔ میں نہیں رہوں گا تو وہ کس کے کام آئے گی؟ اُما اسے الماری سے نکال کر کھڑکی کے باہر پھینک دے گی۔ نہیں... نہیں، پھینک نہیں سکے گی، پھینکنا چاہ کر بھی رکھ لے گی۔ ممکن ہے کہ وہ پوجا گھر کے کونے، مہا کالی کے پٹ کے پاس رکھے... گنگا جل کی بوتل کے پاس ہی۔ گنگا... گنگا...

پٹنہ کی گنگا کو مگہہ کی گنگا، یعنی پُن کو دھو ڈالنے والی گنگا کہتے ہیں لوگ۔ اسی لیے پٹنہ کی گنگا کے کوئی پکے گھاٹ نہیں۔ ایک دو ہیں بھی تو اتنے گندے کہ اُدھر کوئی منھ بھی نہ پھیر سکے۔ پٹنہ کی گنگا کے کنارے جلنے والے مُردوں کو نہ شانتی ملتی ہے نہ مکتی۔ اس لیے پشپ لال جیسے باغی کی لاش اُس پار سیمریا گھاٹ پر لے جا کر جلائی گئی۔ لیکن اسی گنگا کے کنارے پٹنہ کلب کے رنمیا لان میں بیٹھ کر موج سے دارو پیتے وقت اور پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال کے کسی بیڈ پر بے بس پڑے دوا پیتے وقت آدمی کے من میں پٹنہ کی گنگا کی جے جے دھنی اپنے آپ گونج اٹھتی ہے۔ میرا وشواس پکا ہے کہ اس اسپتال کے ستر فیصد مریض سارے روگوں کو ختم کر ڈالنے والی گنگا کی ہوا کے اثر سے ہی صحت یاب ہوتے ہیں، مرتے مرتے جی جاتے ہیں۔ اپنے دیش میں کسی دریا کے کنارے اور کہیں کوئی اسپتال ہے، مجھے معلوم نہیں۔

گھاٹ سے کوئی اسٹیمر کھلنے کی تیاری کر رہا ہے شاید۔ آج کل نئی قسم کا سائرن بجتا ہے... اتھاہ پانی کے اندر سے آتی ہوئی، گھٹتی ہوئی سی آواز۔ اس سائرن کا صحیح نام کیا ہے؟ پوچھنا ہوگا۔

نہیں، اسٹیمر نہیں! یہ ہے کرائسس! یعنی آکسیجن سلنڈر لایا جا رہا ہے۔ فرش پر بھاری لوہے کے گھسیٹنے کی آواز بتدریج نزدیک آتی جا رہی ہے۔ کیوں؟ میرے پاس پھر کیوں؟ میں ہوش میں ہوں۔ جگا ہوا ہوں۔ پلنگ سے اسٹول سٹا کر، میرے بائیں کاندھے کے پاس سر رکھ کر اُما سو گئی ہے۔ دھیرے سے پکارتا ہوں۔ ''اُما!'' منھ سے آواز نکلنے کے پہلے ہی سلنڈر گھسیٹ کر لانے والا

آدمی اچھل کر میرا منھ دبا دیتا ہے۔ سلنڈر گھسیٹ کر لانے والا شخص وارڈ قلی نہیں، پولیس کا داروغہ ہے۔اس کے ساتھ پولیس کے کئی سپاہی ہیں جو میرے پلنگ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔۔۔وہ میری تلاشی لیں گے۔ میں نے رضائی کے نیچے فحش کتابیں، غیر قانونی گانجا اور نرس نیلما کی لاش چھپا رکھی ہے۔''اُما! دیکھو تو، وہ کیا کر رہے ہیں؟'' داروغہ چلّاتا ہے،''چپ رہ سالے!'' اور سپاہی میری رضائی ہٹانا چاہتا ہے۔ میں مزاحمت کرتا ہوں۔رضائی کے نیچے میں ننگا ہوں۔۔۔ایک دم ننگا ہوں۔۔۔ ''سالو۔۔۔ حرامزادو۔۔۔ مادر چو۔۔۔ بیٹی چو۔۔۔ کتی کا بچہ۔۔۔!'' دنادن دونوں لاتیں چلانا شروع کیا میں نے۔۔۔ اور اسی تال پر لڑائی کا نقارہ بجنے لگا۔۔۔ کسی کے منھ پر کسی کے پیٹ پر، فوطوں اور چوتڑوں پر میری لاتیں لگتی ہیں اور وہ ایک ایک کر کے نقارے کی تال پر بھاگتے جاتے ہیں۔ حد ہے! اُما اسی طرح جھکی ہوئی ہے۔ یہاں اتنا شور غل ہو گیا، کان کے پاس لڑائی کا نقارہ بج گیا، لیکن اس کی نیند میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ تب رضائی کے نیچے سے گردن نکال کر نیلما مجھ سے پوچھتی ہے،''پولیس کا لوگ سب چلا گیا؟ اب تم چپ چاپ مجھے مار ڈالو۔ آؤ!'' رجنی گندھا کی خوشبو میری ناک میں سماتی جا رہی ہے اور نیلما اب گڑگڑا کر کہہ رہی ہے،''پلیز! کل می!'' میں اُما کو جھنجھوڑ کر جگاتا ہوں۔ اُما لڑھک کر فرش پر گر پڑتی ہے اور اس کے گرنے کی آواز جلترنگ کی طرح۔۔۔ یا نیلما کھلکھلا کر ہنس پڑی ہے؟ میں بھی اس کے ساتھ ہنسنا چاہتا ہوں، لیکن ہنسنے کے بجائے میں ''ماں! ماں!'' پکار کر رونے لگتا ہوں۔ میں روتا جاتا ہوں اور نیلما اسی طرز پر بنگلہ کا رام پرسادی الاپتی ہے،''ماں آں آں آں!'' دراصل رونے کے بجائے گا رہا ہوں میں!

سمادھی نہیں، سپنا؟ پتا نہیں کیا سچ ہے اور کیا سپنا! جو بھی ہو، میں نے نیلما کو قتل نہیں کیا ہے۔ وہ ڈاکٹر کی مدد کر رہی ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، میں سپنے میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ نیلما ہنس کر کہتی ہے،''ہمارا اِدھر میں ایسا کِک مارا کہ ہم کو نوولجین لینا پڑا۔۔۔'' مجھے کوئی سوئی دی جا رہی ہے شاید!

اُما اس طرح گھبرا کر مجھے کیوں دیکھ رہی ہے؟ ایسی گھبراہٹ اس کے چہرے پر زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ رُندھے گلے سے پوچھ رہی ہے مجھ سے،''کیا ہو رہا ہے؟ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ کیسا لگ رہا ہے؟ بولو نا۔۔۔ بولتے کیوں نہیں۔۔۔ بابو۔۔۔ شیبو بابو رے۔۔۔!''

اچانک اُما چیخ پڑتی ہے۔ لگا، آسمان چرچرا کر پھٹ گیا۔۔۔ تارے تیزی سے ٹوٹ کر گر رہے

Scanned with CamScanner

ہیں۔'' ماں، او ماں! میں برباد ہو رہی ہوں۔ میرا کوئی نہیں اس کے سوا... ہاہاہا... ڈاکٹر بابو...!''

میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں، لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہا۔ نیلنا اُما کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھاتی ہوئی سمجھا رہی ہے، ''ایک نیا ڈرگ دیا گیا تھا، اسی کا ری ایکشن ہوا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔ سوئی پڑا ہے...'' سرجن اجے کی جھڑکی سنائی دیتی ہے۔'' اُما! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''میرا شیبو بابو بولتا کیوں نہیں، ڈاکٹر؟''

''بولے گا... ابھی بولے گا... تم چپ رہو۔''

''اچھا، میں رہوں گی! میں ہوں۔''

ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر شری نواس آئے ہیں۔ ان کی سفید لمبی ڈاڑھی کو دیکھ کر مجھے کویراج چکرورتی کی یاد آجاتی ہے۔ کویراج چکرورتی سونگھ کر کے ہی مرض کی تشخیص کر لیتے تھے۔ ڈاکٹر شری نواس بھی دور سے ہی مجھے دیکھ کر کہتے ہیں، ''ہارٹ نارمل ہے...''

میڈیسن کے ڈاکٹر داس آئے۔ وہ بھی مجھے دور سے دیکھتے ہیں۔ کوئی مجھے چھوتا تک نہیں۔ وہ مجھ سے بولنے کو کہہ رہے ہیں۔ میں ہاتھ کے اشارے سے کہتا ہوں، آواز نہیں نکل رہی! ڈاکٹر داس کہتے ہیں، ''ہاں، ری ایکشن ہی ہوا ہے۔''

میں جانتا ہوں، میں نے دیکھا ہے، حلق کے کینسر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بولی اچانک بند ہو جاتی ہے۔ اگر بولی نہیں لوٹی تو؟ ووکل کورڈ ڈیمیج تو نہیں ہو گیا؟ میں ڈاکٹر سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر...

سبھی اکٹھے بول پڑتے ہیں، ''آ گئی!''

بجلی گل ہونے کے بعد جب لوٹتی ہے تو لوگ اسی طرح ایک ساتھ بول پڑتے ہیں، ''آ گئی!''

لیکن اُما کو یقین نہیں آ رہا۔ وہ پوچھتی ہے، ''بولو تو، میں کون ہوں؟''

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے پوچھا، ''یہ سب سپنا تو نہیں؟''

''تمھاری طبیعت کیسی ہے؟'' اُما پوچھتی ہے۔

میں کروٹ لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُما منع کرتی ہے... پیٹ کے بیچوں بیچ شدید تکلیف... یہ کیا... میرے پیٹ پر بھاری کیا لدا ہے؟ ذرا بھی ہل ڈل نہیں سکتا۔ یا نیلنا نے سچ مچ مجھے پلنگ سے

باندھ دیا ہے؟

پٹنہ ٹائمز کا اسٹاف رپورٹر وتن آیا ہے۔ اُما سے وہ کچھ پوچھتا ہے۔ اُما کہتی ہے، ''آپریشن کے ٹھیک دس گھنٹے بعد ابھی کچھ دیر پہلے ہوش میں آئے ہیں۔ اب ٹھیک ہیں۔''

آپریشن؟ کس کا آپریشن؟ کب ہوا میرا آپریشن؟

اُما چپ چاپ مسکراتی ہے۔ ڈاکٹر اجے دس گھنٹے کے بعد ابھی ڈیرے پر گئے ہیں۔

''اور ڈاکٹر شری نواس، ڈاکٹر داس؟ وہ کب گئے؟''

اُما حیرت سے پوچھتی ہے، ''ڈاکٹر شری نواس اور ڈاکٹر داس؟ وہ یہاں کب آئے؟''

میں پوچھتا ہوں، ''میری آواز پھٹے جھانجھ کی طرح سنائی دیتی ہے؟''

''نہیں تو!''

''مجھے ڈرگ ری ایکشن ہوا تھا نا؟ میری بولی اچانک بند ہو گئی تھی نا؟''

''تم تو دس گھنٹے سے بیہوش تھے۔''

''اور نیلما؟ بلاؤ نا اسے ایک بار۔''

''کون نیلما؟'' اُما کو پھر حیرت ہوتی ہے۔

میں اپنے جسم میں چیونٹی کاٹ کر دیکھتا ہوں۔ میں ہوں، یا میں بھی نہیں ہوں؟ نہیں، میں ہوں۔ سپنا نہیں یہ سب... میں سپنا نہیں۔ لیکن پھر شک ہوتا ہے۔ پھر پوچھتا ہوں، ڈرتے ڈرتے۔

''اچھا اُما، پشپ لال اس سامنے والے وارڈ میں ہی مرا تھا نا؟''

اس بار اُما تھوڑا جھنجھلا گئی۔ ''کون پشپ لال؟ پتا نہیں کیا کیا بول رہے ہو! بولو مت، ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔''

مجھے اب یقین ہو رہا ہے، یہ سپنا ہی ہے۔ اور اس سپنے سے اب چھٹکارا نہیں! کیا ہوگا چھٹکارا پا کر؟ اچھا ہو، گنگا کے کنارے چل کر پانی میں اپنی کایا کو ایک بار جی بھر کر دیکھتے ہوئے اس خوبصورت غلاف کی ستائش کروں... جیون بھر دنیا کی ہر چیز اور ہر شخص میں اپنا عکس ڈھونڈتا رہا، دیکھتا رہا، خوش ہوتا رہا... نارسی سس؟ نان سنس! سپنے میں ایک بار گا کر دیکھنا چاہتا ہوں، میری آواز کہاں تک پہنچتی ہے۔ گنگا کے اُس پار... سفید بالو کے ٹیلوں کے پار، ہرے بھرے کھیتوں

Scanned with CamScanner

کے اوپر اڑتی ہوئی... یا اتھاہ پانی میں بجنے والے سائرن کی طرح، اتھاہ پانیوں کے نیچے کی طرف گھٹتی ہوئی...

❁❁

Scanned with CamScanner

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

ہیرا بائی ناچے گی

یہ تیسری بار ہوا تھا اور بالکل اسی طرح جس طرح پہلے دو بار۔ ویسے تو وہ لوگ اس بار بھی بلڈوزر لائے تھے، لیکن وہ دور ہی کھڑا رہا۔ دو موٹر ٹھیلوں میں آئے سپاہی سب سے پہلے زور زور سے چیختے اور بے مقصد لاٹھیاں پیٹتے ہوئے دوڑے۔ ان کی اس حرکت سے مردوں کے مقابلے میں عورتوں اور بچوں میں زیادہ دہشت پھیلی۔ اور ان سے زیادہ ڈر گئے وہاں گھومنے والے کتے، سور، کچھ مرغیاں، بکریاں اور طوطے۔ اس حملے سے وہاں ایک زبردست شور مچ گیا۔ شور نے گھبراہٹ اور زیادہ بڑھا دی۔ لہٰذا مرد، جو کم ڈرے تھے، اس وقت بستی اجاڑے جانے کی مہم کی مزاحمت کرنے کے بجائے ضروری سامان بچانے کے لیے بھاگے۔

سپاہیوں کے پیچھے لمبی لوہے کی سلاخوں اور ہتھوڑوں سے لیس کچھ لوگ بڑے اطمینان سے وہاں بنے چھوٹے گھر گرانے لگے۔ انھیں گرانے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑ رہی تھی۔

بستی میں زیادہ تر مکان عام جھونپڑیوں سے بھی زیادہ خستہ حال تھے۔ ان کی چھتوں کے بجائے بانسوں اور ٹیڑھی میڑھی لکڑیوں کے ٹٹر پر پرانے ٹاٹ سے لے کر پھٹے ہوئے پولیتھین کی چادر تک ٹوٹی سڑی رسیوں سے باندھ دی گئی تھی، اور یہ محنت اور ہوشیاری سے بنائی گئی چھتیں ہوا میں اڑ نہ جائیں، اس لیے ان پر بہت سے اینٹ پتھر لاد دیے گئے تھے۔ ایسے مکانوں کی دیواریں بنانا سب سے مشکل کام تھا اور وہ اکثر لمبے عرصے میں پورا ہوتا تھا، کیونکہ ان دیواروں کے لیے ڈھیرے

دھیرے کرکے دور دور سے اینٹیں چرا کر لائی ہوتی تھیں۔

یہ گھر زیادہ بڑی ضرورتیں پوری نہیں کرتا تھا۔ اس میں اکثر رینگ کر یا بہت جھک کر صرف سونے یا دھوپ اور بارش سے بچنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ بارش میں آس پاس کا پانی اندر بھی نہ بھر جائے، اس لیے نیچے کا فرش تھوڑا اونچا، ایک چبوترے جیسا بنا لیا جاتا تھا۔ حالانکہ اس میں چھت ہوتی تھی، پر بارش میں بھیگنے سے بچ پانا مشکل ہی ہوتا تھا۔ ان جھونپڑیوں کے بیچ ایک سؤر یا آدمی کے چلنے کی جگہ چھوٹی رہتی تھی، جس میں بہت زیادہ کیچڑ ہو جاتا تھا۔

اس طرح کے مکانوں والی بستی اُجاڑنے کے کام میں میونسپلٹی کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ لوہے کی چھڑ سے اُبار کر چھت پر ایک دھکا مار دینے سے ہی پورا گھر ننگا ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد ہتھوڑے والا آدمی باقی بچی چھوٹی چھوٹی دیواروں پر دو چار چوٹیں لگا دیتا تھا۔ اتنے کے بعد دھیرے دھیرے سال ڈیڑھ سال میں تیار ہوا ان کا گھر ملبے یا کوڑے کا ڈھیر بن جاتا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اس کارروائی کے بعد جب میونسپلٹی والے وہاں سے چلے تو عورتوں نے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ کچھ نے غصے میں آ کر جاتے ہوئے سپاہیوں کے پیچھے اینٹوں کے ٹکڑے بھی پھینکے۔ وہ چیخ چیخ کر روئیں بھی۔ پھر فوراً ہی ملبے کو کھودنے لگیں۔ بہت سا سامان ایسا تھا جو پچک جانے کے باوجود بچایا جا سکتا تھا، جیسے میلی، کالی پتیلیاں، لوہے یا پلاسٹک کے ڈبے، یا کنستر۔

نیت رام کمہار کی بیوی زور زور سے رونے لگی تھی کیونکہ جھونپڑی کے ساتھ ہی اس کے زیادہ تر برتن چور چور ہو گئے تھے۔

سڑک کی طرف لکڑی کے کچھ ڈبے جیسے بھی لوگوں نے کھڑے کر لیے تھے، جن میں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ پان بیڑی کی دکان۔ اسکوٹر مرمت یا سبزی کی دکان۔ ایک ننھا سا کارخانہ چھاتے اور سوٹ کیس کی مرمت کا۔ ایک موچی اور ایک حجام۔ ایک بجلی کی سجاوٹ والے الیکٹریشن کا کھوکھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی اس کارروائی کے بعد اب وہاں کا منظر بالکل مختلف تھا۔ زمین کے جتنے حصے میں وہ جھونپڑیاں اور کھوکھے تھے، وہ حصہ خاصا لمبا چوڑا میدان لگنے لگا تھا۔ اس میدان میں اینٹ پتھروں، بانسوں، چیتھڑوں کے ڈھیر اب اس طرح چھترائے پڑے تھے جیسے کسی جنگ کے بعد

Scanned with CamScanner

ٹوٹے رتھ، مرے گھوڑے اور زخمی سپاہی بکھرے ہوں۔ اچانک یہاں رہنے والے ہر شخص کا قد جیسے لمبا ہو گیا۔

پولیس والوں کی للکار کے بعد جو بچے ڈر کر چیختے ہوے دور تک بھاگتے چلے گئے تھے، وہ کھجور کے پیڑوں کے بیچ سے اس ساری کارروائی کو دیکھتے رہے تھے۔ پولیس اور میونسپلٹی کے دستوں کے جانے کے بعد وہ پھر لوٹ آئے تھے۔ ان کا اپنا ردعمل اپنے والدین کی نقل ہی زیادہ تھا۔ وہ بچے رونے لگے جن کے ماں باپ رو رہے تھے۔ کچھ بچے اپنی ماؤں کی طرح ہوا میں پتھر پھینک کر اپنا غصہ اتارنے لگے۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں رہا۔

نندو بڑھئی کا چھوٹا بیٹا مرچی چلایا، ''ابے او ئے پرموے، تیری گیند! تیری گیند مل گئی ہے۔''

''کہاں؟'' پرمو چونک گیا۔ وہ خود آس پاس کے کوڑے سے ایسی ہی کوئی چیز کھوج رہا تھا۔

یہ ایک عمدہ وزنی کرکٹ والی گیند تھی جو پرمو قریب ڈیڑھ برس پہلے لایا تھا۔ خرید کر نہیں، سرکاری افسروں والی کالونی کے پارک سے۔ چونکہ کئی دن سے ٹی وی اور ریڈیو مسلسل کرکٹ کا کھیل نشر کر رہے تھے، اس لیے لگ بھگ ہر جگہ ہر بچہ اسی کھیل میں مشغول تھا۔ کچھ بچے سستی پلاسٹک والے اتنے ہی سستے بلّوں کے ساتھ اینٹوں کے ڈھیر کو وکٹ بنا کر کھیلتے تھے تو کچھ بچے باقاعدہ پیشہ ور کھلاڑیوں والا سامان خرید لائے تھے۔ اس سامان میں بچوں کے قد سے بہت لمبے، بھاری، اُجلے پیڈ اور دستانے بھی تھے۔ انھیں ضرور کھیل کی ساری باریکیاں آتی ہوں گی، کیونکہ انھوں نے ریفری اور منیجر تک مقرر کر رکھے تھے۔ ان بچوں کا کھیل جس پارک میں ہو رہا تھا اس کے چاروں طرف پرمو جیسے کچھ بچے کھڑے تھے۔ گیند جب کبھی پارک سے باہر آ جاتی تھی تو انھی میں سے کوئی بچہ اسے احتیاط سے اٹھا کر واپس کر دیتا تھا۔ ایک بار گیند جب پرمو کی طرف آئی تو اس نے کسی ماہر کھلاڑی کی طرح روکنا چاہا، پر وہ اونچی زیادہ تھی؛ گیند کے گزرنے کی ہلکی آواز اسے آئی تھی، پر گیند دکھائی کہیں نہیں دی۔ کھیلنے والے بچوں نے بھی ڈھونڈا، پر وہ ملی کسی کو نہیں۔ ہار کر بچے دوسری گیند لے آئے۔ پرمو باقی کھیل دیکھتے ہوے بھی اسی گیند کے بارے میں سوچتا رہا — آخر وہ غائب کہاں ہو گئی، ہو سکتی ہے؟

کھیل دیکھتے دیکھتے ہی اچانک اس کی نگاہیں گیند کھوجنے لگیں۔ آخر اس نے گیند دیکھ ہی لی تھی۔ وہ پاس ہی بن رہے مکان کے سامنے جمع اینٹوں کے دو چٹوں کے بیچ تھی۔ پرمو نے فوراً ہی

اُدھر سے اپنی نگاہ ہٹالی۔

اس گیند کو وہ اسی وقت نہیں لایا۔ رات جب کالونی کے لگ بھگ سارے بچے ٹی وی دیکھنے میں مشغول تھے، پرمو وہ گیند نکال لایا تھا۔

سموچی بستی میں اتنی عمدہ اور نایاب گیند کسی کے پاس نہیں تھی۔ بہت دیر تک وہ لوگ آپس میں مل کر اس کا معائنہ کرتے رہے۔ اس سے پہلے بھی انھوں نے بہت سی گیندیں دیکھی تھیں، اور ان سے کھیلے بھی تھے۔ بچے نے تو کاغذ کے ایک گولے پر چیتھڑے لپیٹ کر ایک گیند تیار کر لی تھی۔ آس پاس پھیلی بہت سی کالونیوں میں کچھ کھلونے انھیں مل جاتے تھے، جیسے گڈے گڑیاں، ٹین کی موٹریں اور گیند۔ ربڑ کی کچھ کھوکھلی گیندیں پھٹی ہوئی ہوتی تھیں اور دیکھنے میں اوپر سے ثابت لگتی تھیں۔ ایسی گیندوں کو یہ لوگ فوراً پھاڑ دیتے تھے، تا کہ انھیں دوبارہ دھوکا نہ ہو۔

اس بار جو گیند ملی تھی وہ عجیب ہی تھی۔ اسے کئی مرتبہ ان لوگوں نے چھو کر دیکھا۔ گگن نے جوش میں آ کر اسے اچھال کر دیکھنا چاہا تو پرمو اس سے تقریباً لڑ ہی بیٹھا تھا۔

اس گیند کو کھیلنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ کسی ٹوٹے تختے سے یا بانس سے کھیلنا اس گیند کی بے عزتی ہی تھی، اس لیے پرمو اور اس کے ساتھیوں نے مرچی سے دوستی کی تھی۔ مرچی نندو بڑھئی کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا اور باپ کے ساتھ چارپائیوں کے پائے بنانے کے بجائے اسکوٹر مکینک لطیف کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ رُکھانی بسولے کے بجائے رینچ اور پیچ کش میں اسے ایک خاص طرح کی انگریزیت محسوس ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ بستی کے باقی بچوں سے زیادہ ملتا جلتا بھی نہیں تھا۔ مرچی کو راضی کرنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باپ نے ان لوگوں کے لیے ایک اچھا سا بلّا بنا دیا تھا۔ پر پتلے تختے سے جو بلّا اس نے بنایا تھا، وہ اصلی گیند کے ساتھ ٹکرا کر جلدی کہیں بیچ سے پھٹ گیا۔ تب وہ لوگ ایک بانس کے ٹکڑے سے گیند کھیلتے رہے تھے۔ شاید یہ بانس کا قصور رہا ہو یا چاروں طرف کباڑ کی طرح پھیلی ہوئی جھونپڑیوں کا، کہ جلدی ہی وہ گیند غائب ہوگئی۔ ایک زوردار ہٹ کے بعد وہ اچھلی تو پتا ہی نہ چلا کہ کہاں چلی گئی۔ گیند کی تلاش میں پرمو اور اس کے ساتھی کئی جھونپڑیوں کی چھتوں پر چڑھے اور توڑ دینے کے جرم میں خاصی گالیاں کھائیں۔ کئی روز پرمو جگہ جگہ اسے تلاش کرتا رہا تھا۔ اس سے زیادہ لگن سے اس کے ساتھیوں نے اس کی تلاش کی تھی۔ پر گیند نہیں ملنی تھی تو نہیں ہی ملی۔

بارش اور دھوپ سے بدرنگ ہوئی وہی گیند مرچی لیے کھڑا تھا۔ پرمو نے دیکھا اور جھپٹ کر گیند ہاتھ میں لے لی ــــ وہی ہے۔ اس نے اس کا میل اپنے کپڑوں پر رگڑا، پر وہ صاف نہیں ہوئی۔ جو بھی ہو، گیند تو مل گئی۔ اننت رام چورسیا کا پان سگریٹ والا کھوکھا پہلے ہی پرانا اور خستہ حال تھا۔ میونسپل کارپوریشن کی توڑ پھوڑ سے ایک دم دھڑام ہو گیا تھا۔ اس کا ایک پایا اٹھا کر پرمو نے تولا ــــ اس سے کھیلا جا سکتا ہے۔ یہ جلدی پھٹے گا بھی نہیں۔

پرمو نے ضرورت سے زیادہ جوش سے اپنے باقی دوستوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس گمشدہ گیند کے ملنے کی بات نے ہر کسی میں کچھ زیادہ ہی جوش پیدا کر دیا اور جلدی ہی وہ میونسپلٹی کی توڑ پھوڑ کو بھول گئے۔ اپنے خاندانوں کو روتا جھینکتا اور ملبے سے الجھتا چھوڑ، وہ بستی کے پیچھے کی طرف نالے سے سٹی اس خالی جگہ پر جہاں دھوبی اپنے کپڑے سکھاتے تھے، آ کھڑے ہوئے۔ آج کے اس اُدھم کے بعد دھوبی بھی وہاں سے غائب تھے۔ ان کے کرکٹ کھیلنے کی اس سے عمدہ جگہ انھیں آج تک نہیں ملی تھی۔

ابھی وہ کرکٹ کھیلنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ ایک اونچی چیخ، جیسے کوئی کسی سوّر کو مارنے کی کوشش کر رہا ہو، گونج گئی۔ وہ چیخ رکی نہیں۔ پان بیڑی کے کھوکھے والے کی ماں آ گئی تھی اور وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر روتی ہوئی بہت تیز آواز میں میونسپلٹی والوں کو کوس رہی تھی۔ اس آواز سے شہ پا کر دوسری عورتوں نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔

کرکٹ کا کھیل تھوڑی دیر کے لیے رک گیا، کیونکہ ہر بچے کو لگا، چیخنے والی عورتوں میں اس کی ماں بھی شامل ہے۔

اسی بیچ اچانک چلّا کر فحش گالیاں دیتے ہوئے مجید نے چھوٹے کو دھکا دیا۔ چھوٹے کا پیٹ بچپن سے ہی بے ڈھنگے طریقے سے بڑھ گیا تھا۔ دھکے سے لڑکھڑا کر وہ لڑھک گیا۔ اس پر وہ بھی اتنی ہی بھدی گالیاں بکنے لگا۔

گیند کی تعریف سے تھوڑا مغرور ہوا پرمو کسی بزرگ کی طرح اتنے ہی وزن کی گالیاں دیتے ہوئے چیخا، ’’کیا ہے بے؟ اس کو دھکا کیوں مار دیا؟‘‘

Scanned with CamScanner

مگر اس جھگڑے میں باقی بچے شامل نہیں ہوے، بلکہ جھنجھناتے ہوے وہ خود ایک حد تک چھوٹے پر تنقید کرنے لگے۔ اس بات نے پرمو کو حیران کر دیا۔ وہ بوکھلا کر باقی بچوں کا منھ دیکھنے لگا۔

''ابے تو بات کیا ہے؟''

جواب میں مجید اور چنندہ گالیاں بکنے لگا۔

بات سچ مچ گمبھیر تھی۔

پچھلے روز اچانک ہی مجید نے ایک نئے کھیل کی ایجاد کر لی تھی۔ بستی سے دور پیچھے کی طرف، جہاں خالی میدان ختم ہوتا تھا، کھجور کا ایک چھوٹا سا جنگل تھا۔ ان دنوں ٹھیکیدار یہاں تاڑی اتروا رہا تھا۔ تاڑی اتارنے کے کام میں مجید کا باپ بہت ماہر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اونچی اور مشکل جگہ چڑھنے کی اسے خاصی مشق تھی۔ اس نے تین بار بجلی کے ٹرانسفارمر اتارے تھے اور بجلی کے تار تو بہت بار کاٹے تھے۔ بجلی کا ٹرانسفارمر اتارنے میں ایک بار اسے سزا بھی ہو گئی تھی۔ اس حادثے کو وہ بہت خوشی سے بیان کرتا تھا۔

باپ جب تاڑی اتارنے جاتا تھا تو مجید بھی اس کے ساتھ ہو لیتا تھا۔ مجید کی عمر کے کچھ اور بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ جاتے تھے۔ انھیں تازہ اتاری، تھوڑی بدبو چھوڑتی میٹھی تاڑی جو مل جاتی تھی۔ اسے پینے کے بعد وہ سب دوپہر تک وہیں ٹھیکیدار کے لمبے چوڑے جھونپڑے کے آس پاس کھیلتے رہتے تھے۔ کل بھی وہ وہیں تھے۔ جھونپڑے کے اندر اکٹھا کی جا رہی تاڑی کی بدبو اور بڑی بڑی مکھیوں کی آوازوں میں اپنی چیخیں ملاتے وہ ایک دوسرے کو کھوج اور کھدیڑ رہے تھے۔

جب وہ اس بے مطلب کھیل سے اوب گئے تو کھجور کے اس چھوٹے سے جنگل کے پیچھے سے ہو کر بہنے والے ایک نالے میں اتر آئے۔ اس نالے میں انھیں کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹی مچھلی مل جاتی تھی جسے وہ بہت محنت کے ساتھ پکڑ لیتے تھے۔ لیکن دوسری مچھلی چونکہ کبھی ہاتھ نہیں آتی تھی اس لیے پکڑی ہوئی چھوٹی مچھلی کو، جو کب کی مر چکی ہوتی تھی، وہ مٹی میں پٹک دیتے تھے۔

نالے میں اگی لمبی لمبی گھاس کی پھنگیوں پر ننھے ننھے ہوائی جہازوں جیسے معصوم ٹڈے منڈلا رہے تھے۔ پکڑے جانے پر وہ بڑی تیزی سے پر پھڑپھڑاتے تھے۔

مجید نے ایک ٹڈا پکڑ لیا۔ وہ تیزی سے پنکھ پھڑپھڑانے لگا۔ مجید اسے اپنے چہرے کے قریب

لے آیا۔ ''ابے پنکھا! سالا بجلی کا پنکھا! آٹو میٹک۔ سالا ہوا مارتا ہے۔''

اس نے ٹڈا دوسرے بچے کے چہرے کے قریب کر دیا — اس نے بھی ہوا محسوس کی۔ اب سبھی بچے ٹڈے کے پنکھے سے کھیلنے لگے۔

مجید نے اس کے بعد آس پاس کی بچھو گھاس کی بالیاں جمع کیں۔ ان بالیوں کے روئیں آپس میں سٹا دینے سے یہ آپس میں جڑ جاتی تھیں۔ ایسی بہت سی بالیوں کو جوڑ کر اس نے ڈبے جیسا بنالیا اور ایک ٹڈا اس نے اندر بند کر دیا۔ ''دیکھ بے! انتظام پکا۔ جب گرمی لگے، ڈبے میں سے پنکھا نکالو اور ہوا لے لو۔''

اس کے بعد اور بچوں نے بھی اسی طرح کے پنجرے بنالیے۔ کچھ پنجروں میں انھوں نے ٹڈوں کے بجائے دوسرے کیڑے بھی بند کر لیے، جیسے روئیں دار رنگین بیر بہوٹی، تتلی، گبریلا۔

گبریلا ظہور نے پکڑا تھا۔ اس کیڑے کی عادت سبھی بچوں کو معلوم تھی۔ یہ بہت گھناؤنا، گندگی والا کیڑا تھا۔ یہ چلتے چلتے مٹی کی گولیاں جیسی بناتا جاتا تھا اور اپنے پچھلے پیروں سے لڑھکاتا ہوا اپنے سوراخ تک لے جاتا تھا۔

اسے دیکھتے ہوئے مجید نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے ایک چیخ ماری۔ ''ابے سالے، گندگی ڈھونے والا کیڑا۔''

''ابے سن!'' توندو نے عقلمندی جتاتے ہوئے کہا، ''میں بتاؤں، یہ سالا کیڑوں کا مہتر ہے۔''

''تب تو اور مزیدار بات ہے،'' للّو بولا۔ ''یہ سالا باقی کیڑوں کے پنجروں کی ٹٹی صاف کرے گا۔''

اب وہ اس بات کا اندازہ لگانے لگے کہ کون سا کیڑا کیا کام کرے گا۔ مرچی فوراً چلّایا، ''میری تتلی ناچے گی۔ نوٹنکی کرے گی، نوٹنکی۔ عورت کا پیارو والی فریدہ۔ واہ!''

''ابے تو چل، ایک کیچوا بھی پکڑتے ہیں۔ وہ بورنگ کرے گا۔ ہینڈ پائپ لگائے گا، ہینڈ پائپ،'' مجید نے مشورہ دیا۔

ان کی بستی کے بہت سے لوگوں کی طرح کام کرنے والے کیڑے انھیں مل گئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ انھوں نے ان پنجروں میں لگ بھگ سموچی بستی ہی بند کر لی ہے۔ اس بستی کو بسانے کے لیے

Scanned with CamScanner

اب ایک اچھی سی جگہ کی ضرورت تھی۔ جھونپڑیوں کے پیچھے والے میدان میں دور دور تک دھوبی اپنے کپڑے پھیلا دیتے تھے۔ کھجور کے پیڑوں کی آس پاس کی جگہ میں کوئی بھی کونا خالی نہیں تھا، کیونکہ وہاں تاڑی نکالنے والوں کے پیروں سے روندے جانے کا خطرہ تھا۔

دھوبیوں والے میدان اور کھجور کے جنگل کے بیچ ٹوٹی ہوئی قبر تھی، ایک ننھے سے ٹیلے پر۔ قبر کے پاس دو آم کے ٹیڑھے درخت تھے۔ یہ جگہ انھوں نے اپنی بستی کے لیے چنی تھی۔ یوں بھی چونکہ یہی جگہ خالی رہتی تھی اس لیے بستی کے بچوں نے یہاں کھیلنے کی عادت بنالی تھی۔

نایاب گیند کے دوبارہ مل جانے کے جوش میں وہ تھوڑی دیر کے لیے یہ بات بالکل ہی بھول گئے تھے کہ کل ہی انھوں نے یہاں اپنی ایک بستی بسائی تھی۔ اسی بستی کے کچھ پنجروں پر چھوٹے کے دونوں پیر بھرپور پڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک پنجرہ تو وہی تھا جس میں گانے ناچنے والی فریدہ بند تھی۔

بات معلوم ہوئی تو پرمو ہنسنے لگا۔ ''سالا، فریدہ! ابے یہ بھی مزیدار بات ہے۔ میونسپلٹی والوں نے ہماری بستی توڑ پھوڑ دی اور چھوٹے لال سالے نے مجید کی بستی توڑ پھوڑ دی۔ سالا یہ توندیل چھوٹو حرامزادہ... اس حرامی نے بستی اجاڑ دی... دیکھو تو، بھوتنی کا سالا، میونسپلٹی ہوگیا اے!''

چھوٹے شرمندگی کی مسکراہٹ کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ مجید اور دوسرے بچے جلدی جلدی ٹوٹے پنجرے دیکھنے لگے۔ پنجروں میں سے کئی کیڑے غائب تھے اور کئی مرے ہوئے تھے۔ جو نہیں کچلے تھے ان میں سے بھی۔

''ابے، ان میں تو پہلے ہی مہاماری پھیل گئی تھی۔ ہیضہ ہوگیا ہوگا ہیضہ۔'' پرمو نے کہا۔

''چل آج پھر پنجرے بناتے ہیں،'' مجید نے کچلے پنجروں کے ساتھ باقی پنجرے بھی پھینکتے ہوئے جوش میں بھر کر کہا۔

''ابے سالا چھوٹے پھر وہی کرے گا۔''

انھی مکالموں سے ایک بار پھر ایک بالکل نئے کھیل کی ایجاد ہوگئی۔ جھونپڑیوں والی بستی اور میونسپلٹی کے توڑ پھوڑ والے دستے کا کھیل۔

کھجور کی پتیوں اور گھاس سے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بننے لگیں اور سگریٹ اور ماچس کی

Scanned with CamScanner

ڈبیوں سے دکانوں والے کھوکھے۔ یہ ننھی سی بستی خاصی کاریگری سے تیار ہوئی تھی۔ کچھ کے چھپر باقاعدہ پھوس باندھ کر بنے تھے۔ ایسی چیزیں تیار کرنے کا جیسے انھیں پشتینی تجربہ تھا۔ جھونپڑیوں کے بیچ پیارے نے چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں توڑ کر ان کے ڈھیر سے لکڑی کی ایک ٹال کھول لی، تو معراج نے لمبی سینکیں اکٹھا کر کے بانس والے کی بانس منڈی تیار کر لی۔ دھول مٹی سے انھیں ایک تالے کا زنگ لگا کنڈا مل گیا تھا۔ اس سے ہینڈ پائپ تیار ہو گیا۔

جھونپڑیوں والی یہ بستی اب توڑنے جانے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

''بستی والو، تیار ہو جاؤ، دو منٹ میں بستی کو مٹی میں ملا دیا جائے گا!'' پرمو نے ڈرامائی انداز میں آواز لگائی۔

''ٹھہرو، ٹھہرو!'' معراج نے آواز لگائی۔ ''ابے، یہ تو ندیل آئے گا! سالے، تو سیٹھ ہے۔ سمجھا؟''

چھوٹے ہی نہیں، باقی بھی سمجھ گئے۔ پچھلے دنوں انھوں نے کئی فلمیں دیکھی تھیں۔ کچھ دن پہلے کھیم سنگھ کی لڑکی کی شادی تھی۔ اس نے پیچھے کے میدان میں تمبو لگا کر بارات کھلائی تھی۔ اس وقت وی سی آر پر لگاتار چھ فلمیں دکھائی گئی تھیں۔ فلمیں بہت ہی مزیدار تھیں۔ بچوں نے ان کے بہت سے کرداروں کی بہت دنوں تک نقل کی تھی۔ وہ لوگ فوراً سمجھ گئے کہ میونسپلٹی کی بجائے سیٹھ زیادہ دلچسپ رہے گا۔ انھیں مکالمے اور منظر میں کردار سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چھوٹے فوراً آگے آیا اور ڈرامائی انداز میں بولا، ''ابے او بستی والو!''

اچانک اپنا مکالمہ روک کر وہ تالے کی طرف بھاگا۔

''ابے اس کو کیا ہو گیا؟'' پرمو نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''سیٹھ سالے کو ٹٹی لگ گئی ہے!'' معراج نے کہا۔ سبھی ہنسنے لگے۔ تب تک چھوٹے دوڑتا ہوا واپس آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک چھڑی لے رکھی تھی۔

''یہ کیا ہے؟''

''چھڑی۔ چھڑی ہے۔ سیٹھ کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے۔'' چھوٹے نے فخر سے چھڑی گھمائی۔ ''ارے بستی والو، حرامزادو! دو منٹ میں بستی خالی کر دو، ورنہ آگ لگا دوں گا۔ گولیوں سے

سب بھون دیے جاؤ گے۔''

مکالمہ بولنے کے بعد چھوٹے نے فلم کے ولن ہی کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے بھنویں اوپر نیچے کیں۔ پرمو اور معراج اب اس کے غنڈے بن گئے تھے۔ مرچی، پیارے اور مجید آگے آئے اور ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بولے،''ہم پر دیا کرو مائی باپ، ہمارے گھر نہ اجاڑو۔ ہم برباد ہو جائیں گے مالک، ہم پر دیا کرو...''

چھوٹے ان کی پیٹھ پر چھڑی مارتے ہوئے چیخا،''کیا دیکھتے ہو؟ آگے بڑھو! توڑ دو بستی! اور جو سامنے سے نہ ہٹے، اس پر بھی ٹریکٹر چلا دو۔''

وہ لوگ بلڈوزر کو بھی ٹریکٹر سمجھتے تھے۔ پرمو اپنی گیند سٹیھے کے ناڑے میں اٹکا کر تصوراتی بلڈوزر چلانے لگا۔ وہ منہ سے آواز بھی نکالتا جا رہا تھا۔ اس نے پیروں سے سچ مچ ہی پیارے اور مجید کو ڈھکیل دیا۔ پیارے اور مجید نے پہیے سے کچل کر چھٹپٹانے اور مرنے کی ایکٹنگ بھی کی۔ اب بلڈوزر بستی کو گرانے جا رہا تھا۔ تبھی للو اچھل کر سامنے آ گیا۔ فلم کے ہیرو کی طرح کمر پر ہاتھ رکھ کر دونوں ٹانگیں پھیلائے، اس نے للکارا:

''ارے او سیٹھ کے کتو! جسے اپنی موت پیاری ہے وہ سامنے آ جائے۔''

پرمو بلڈوزر بننا چھوڑ کر بولا،''ابے یہ کیا؟ سالے ہٹ۔''

''ابے او پرموے کے بچے!'' للو چیخا۔''الٹا کر کے ٹریکٹر گھسیڑ دوں گا تو منہ سے باہر آ جائے گا۔''

مرا ہوا مجید اٹھ کر بیٹھ گیا۔''ابے اوئے للو! سالے، کیوں کھیل بگاڑ رہا ہے!''

مجید نے اپنی جھونپڑی کے اندر ایک بھاری پتھر چپ چاپ رکھ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا، جو بھی اس میں ٹھوکر مارے گا، چلّائے گا۔

''ابے تو تو پہلے ہی مر گیا سالے، چپ کر!'' للو نے اسے ہڑکا دیا۔''اور تم لوگ بھی سن لو، جس نے بھی جھونپڑی کی طرف پاؤں بڑھایا، سالے کی ٹانگ توڑ دوں گا۔'' سب جانتے تھے، للو میں طاقت تھی۔ سب سے زیادہ۔ وہ ان میں سے کسی کا بھی ہاتھ مروڑ سکتا تھا، یا کسی کو بھی اٹھا کر پٹک سکتا تھا۔

Scanned with CamScanner

پیارے بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چھوٹے اسے سمجھانے لگا: "بات مانا کر یار، ٹھیک ٹھاک کھیل چل رہا تھا۔"

"ابے، تو یہ بھی کھیل سہی۔" للّو بولا۔

معراج نے کہا: "ابھی ابھی تو دیکھ چکے ہو۔ فلموں والی بات الگ ہوتی ہے۔ دیکھا نہیں، میونسپلٹی والے گھر گرا گئے۔ روکا کسی نے؟"

"نہیں روکا ہوگا، میں تو روکوں گا۔ جس میں ہمت ہو آگے آ جائے۔" للّو نے للکارا۔

چھوٹے کو ابھی پوری طرح یقین نہیں ہوا تھا کہ کھیل بدل چکا ہے۔ اس نے معراج کو آواز دی: "کوتوال صاحب، اس غنڈے کو گرفتار کرلو۔"

معراج غنڈے سے کوتوال بن تو گیا، مگر آگے نہیں بڑھا۔ للّو نے اس کی طرف گھونسا تان کر کہا: "کیوں بے سالے، تو کوتوال بنے گا؟"

معراج گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔ "کوتوال کسی اور کو بناؤ۔ میں تو تمھارا غنڈا ہوں۔"

جھونپڑیوں کی توڑ پھوڑ کے کھیل میں اچانک پیدا ہونے والی رکاوٹ سے بھی کو جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ تبھی تاڑی والے ٹھیکیدار کے بڑے سے جھونپڑے سے باہر آ کر للّو کے باپ نے آواز دی: "ابے او للّو!"

"کیا ہے؟"

"ابے ذرا دیکھ جا کر، ریڑھے والا لدو کہاں مر گیا! سالے کو بول، ٹھیکیدار صاحب بلا رہے ہیں۔" حکم دے کر اس کا باپ پھر اندر چلا گیا۔

باقی بچوں نے یقیناً ہی چین کی سانس لی ہوگی اور للّو یہ بھانپ بھی گیا ہوگا، کیونکہ وہ جاتے جاتے بولا: "ایک بات بتا دوں، میں ابھی آ رہا ہوں، اس بیچ اگر کسی نے بھی جھونپڑیوں کو ہاتھ لگایا تو سمجھ لینا۔"

اس کی اس دھمکی سے بھی سکتے میں آ گئے۔

جاتے جاتے للّو نے انھیں ایک بار پھر دھمکایا اور نالے کے پل کی طرف دوڑ گیا۔

Scanned with CamScanner

اس کے جانے کے بعد بچوں نے بستی کی طرف دیکھا۔ ننھے چھپروں اور چھوٹے چھوٹے گھروندوں والی وہ بستی اچانک اچھی لگی۔ چھوٹے چھوٹے کھوکھے والی دکانیں اور جھونپڑوں کے بیچ والی گلیاں جیسے ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''ابے رہنے دو۔ اس سالی کو اور سجائیں گے،'' پرمو نے کہا۔ بچے اس بات پر فوراً راضی ہو گئے۔

''ابے ہاں،'' معراج بولا، ''یہاں ایک تخت بنا کر ڈال دیتے ہیں بے۔ اس کے آگے دری بچھے گی۔ رات میں یہاں ہیرابائی ناچے گی۔ کیوں بے؟''

''دیا لیتے آنا بے۔ اس کی گیس بتی بنا لیں گے۔''

''عورت کا پیار کھیل ہو گا بے۔ عورت کا پیار۔''

وہ ایک بار پھر نئے اُتساہ سے سینکوں کا تخت بنانے میں جٹ گئے۔ چپ رہنے والا مرچی گانے لگا، ''نہیں کسی نے دیا ہے تم کو یہ اختیار، بلا خطا کے جو اس طرح رعیت ڈالو مار... گڑگڑ، گڑگڑ، دُھم...!''

❁❁

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

چوہے

اس ایک چوہے کو پہچاننے میں وہ قطعی بھول نہیں کرسکتا تھا۔ اگر ہمیشہ ہی اسے دیکھ کر موے لے کو بے طرح غصہ نہ آتا ہوتا تو اب تک وہ اس کا کوئی نہ کوئی نام رکھ چکا ہوتا۔

اس چوہے کی کئی خاصیتیں تھیں، یا موے لے کی سمجھ کے مطابق کئی پہچانیں تھیں۔ انھیں خاصیت کہنا موے لے کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہوتا۔ پہلی بڑی پہچان یہ تھی کہ وہ اپنی بڑی بڑی ابھری ہوئی لوہے کے چھرّے جیسی آنکھوں کو بنا حرکت دیے بیٹھا رہتا تھا اور شکار کرنے والے کو لگتا تھا کہ اسے جھپٹ کر بڑی آسانی سے مار لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہیں موے لے ہی کیا، کوئی بھی دھوکا کھا جاتا تھا۔ اکثر وہ اس قدر بدتمیز ثابت ہوتا تھا کہ پیچھے بھاگنے کی بجائے شکاری کی ٹانگوں کے ٹھیک بیچ سے ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا تھا اور اس طرح شکار کرنے والا اپنے آپ کو ٹھگا گیا ہی نہیں، بیوقوف بنایا گیا بھی محسوس کرنے لگتا تھا۔

دوسری بڑی خاصیت تھی اس کا پچھلے پیر سے تھوڑا لنگڑانا، اور موے لے یہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ چوہا جان بوجھ کر لوگوں کو چڑانے کے لیے لنگڑاتا تھا تاکہ شکار کو یکایک تیزی سے بھاگ کر الّو بنا سکے۔

اس کے علاوہ اس کا رنگ دوسرے چوہوں سے کچھ زیادہ ہی مخملی تھا۔ وہ شاید یوں بھی کہ اوسط چوہوں سے وہ قد میں خاصا بڑا تھا اور اس کی ہمت کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اس نے کسی کتے کو بھی کھدیڑ دیا تھا۔ ایک بار تو موے لے کے سامنے ہی ایک کتے نے بڑے جوش کے ساتھ اس پر حملہ کرنے

Scanned with CamScanner

کی کوشش کی۔ چوہا اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ مولے اس وقت حیران ہی رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ چوہے نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اپنا جبڑا تھوڑا سا کھولا، گویا ہنسنے والا ہو، اور کتا ٹھٹک گیا۔ اس دن مولے نے چوہے کی بجائے کتے پر ہی اپنی لاٹھی دے ماری۔

وہی چوہا اس وقت مولے کے سامنے تھا۔ حالانکہ بے حد لمبی دوڑ کی وجہ سے مولے بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن اس چوہے کو یکایک اپنے سامنے پا کر وہ اپنی حالت بھول گیا۔ آج وہ نہتا تھا اور بنا کسی ہتھیار کے ہی اس چوہے کو مار دینے کا فیصلہ اس نے فوراً کر لیا تھا۔ چونکہ کھیت جوت دیا گیا تھا اور کافی بڑا تھا، اس لیے چوہے کو بھاگنے کے لیے لمبا راستہ طے کرنا پڑتا۔

مولے نے دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہونے کی بھول نہیں کی تھی۔ اس طرح چوہے کو اپنی ٹانگوں کے بیچ سے نکلنے کی ہتک آمیز صورت حال پیدا ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن چوہا پھر بھی بالکل اسی طرح بلا خوف کھڑا تھا گویا اسے اپنے بچ نکلنے کا پورا یقین ہو۔

یوں چوہے کے شکار میں مولے سب سے چالاک تھا۔ شکار کے وقت وہ خود بھی ایک قد آور متشدد چوہا بن جاتا تھا۔ بلکہ اس کے آگے کے دانت چمکنے لگتے تھے اور اس وقت ایک نظر نہ آنے والی دُم بھی اس کے پیچھے کی طرف ریڑھ کی ہڈی کے نچلے سرے پر مروڑ کھاتی ہوئی اُگ آئی دیکھی جا سکتی تھی۔ عام طور پر ایک موٹی رسی کے سہارے کمر سے لے کر جسم کے پوشیدہ حصوں تک کو ڈھکنے کے لیے بالشت بھر چوڑا جو میلا کپڑا وہ پہنتا تھا، وہ بھی ایک خاص ڈھنگ سے پھڑکنے لگتا تھا، گویا اس میں جسم کی نسیں پیدا ہو گئی ہوں۔

مولے ایک عرصے سے یہی کام کر رہا تھا۔ بڑی ندی کی طرف بہنے والے نالے کے بے حد اوبڑ کھابڑ کنارے کی زمین کا وہ ایک طرح سے ماہر ہی ہو گیا تھا اور وہاں کے کھیتوں کے بارے میں اس کی جانکاری کھیت کے مالکوں سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے بتا سکتا تھا کہ کس کھیت کے کنارے پر بتوار ہے اور کس کنارے پر بار بار بند کیے جانے کے باوجود ہر بارش میں تیار ہو جانے والا گڈھا ہے۔

حالانکہ وہ ان میں سے کسی بھی کھیت کا مالک نہیں تھا، لیکن مالکانہ حق کے ساتھ ہر کھیت میں جاتا تھا اور کھیتوں کے مالکوں سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ اسے ان سے ہو گیا تھا۔ ان کھیتوں میں چوہوں نے

Scanned with CamScanner

اپنی سرنگیں بنا رکھی تھیں۔ بے حد موٹے موٹے وہ چوہے کسی بلی سے کم نہیں تھے۔ کھیتوں میں پیدا ہوئے اناج کے دانوں کو اکثر وہ بالیوں کے ساتھ اپنی سرنگوں میں کھینچ لے جاتے تھے اور اس طرح سرنگ کے اندر کافی مقدار میں اناج محفوظ کر لیتے تھے۔ اس اناج کو اکٹھا کرنا ان کا پیدائشی حق تھا اور یہ کام وہ کھیت کے مالک کی پوری جانکاری میں بڑے اطمینان سے کرتے تھے۔

ایسی سینہ زوری سے اکٹھا کیے گئے اس اناج سے کھیت کا مالک عام طور پر ہاتھ دھو بیٹھتا تھا، لیکن کچھ لوگ تھے جن کی لڑائی چوہوں کے اس اندھیر کے خلاف لگاتار جاری تھی۔ ان لوگوں کے کوئی گاؤں نہیں تھے، بستی بھی نہیں تھی۔ کم سے کم گاؤں یا بستی کی تعریف کی رو سے جس سماجی نظام کا احساس ہوتا ہے، وہ بالکل ہی نہیں تھا۔ جس چیز کے اندر گھس کر وہ لوگ رات گزارتے تھے اسے عام طور پر جھونپڑی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بس وہ لوگ وہاں آس پاس پھیلے رہتے تھے جیسے بارش میں گبر یلے پھیل جاتے ہیں۔

غریبی جیسے لفظ سے جس چیز کا احساس شہر میں رہنے والے آدمی کو ہوتا ہے وہ ان لوگوں کے بیچ ڈھونڈنا مشکل کام ہی ہوگا۔ اسی لیے اپنے غریب ہونے یا کسی کے غریب نہ ہونے کی حالت سے ان کا تعارف قریب قریب نہیں کے برابر ہی تھا۔ وہ خاصے خوش بھی دکھائی دیتے تھے اور کسی وقت — اور ایسا اکثر ہوتا تھا — کچھ کھانے کو نہ رہنے پر آسمان، موسم، کھیت، عورت اور ایسی ہی معمولی سی چیزوں پر بڑی گمبھیرتا سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ مولے نے پچھلے دنوں چوہوں کی چار گپھائیں ڈھونڈی تھیں، لیکن ان میں کسی میں بھی نہ تو چوہے ملے اور نہ ہی اناج ہاتھ آیا تھا۔ بلکہ ایک سوراخ اتنا لمبا تھا کہ اسے کھودنے میں اسے سارا دن لگ گیا اور اس کی تہہ میں میلا، سڑا ہوا پانی ملا۔ ان دنوں میں چوہوں کے گوشت میں اسے کوئی ذائقہ بھی نہیں ملا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ بہت گھٹیا قسم کے چوہے ہی مار پاتا تھا۔ مولے کو اس بات پر بھی غصہ آتا تھا کہ اس کی بجائے اس کا باپ چوہے مارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اُبلا ہوا گوشت جس میں مسالہ بالکل ہی نہ ہو — اور وہ ہوتا بھی نہیں تھا — کھانے کے بعد اس کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ کرنا مولے کے لیے مشکل کام بھی نہیں تھا۔ اکثر باپ سے اس کا جھگڑا اسی بات کو لے کر ہوتا تھا۔ گھٹیا گوشت کو بھی باپ ذائقہ لے کر چباتا تھا، اور مولے کے منہ سے اسی بات پر

Scanned with CamScanner

گالی سننے کے بعد تو باپ لگ بھگ کسی بوڑھے چوہے کی طرح کھانے میں معروف ہو جاتا تھا۔

یہ عجیب بات تھی کہ مولے کو اکثر اپنے باپ اور اس پاجی چوہے میں بہت کچھ ایک جیسا لگتا تھا۔ سب سے پہلے تو، کسی چیز کو اس کا باپ کھانے کی بجائے کترتا تھا۔ بھلے ہی اپنی ڈاڑھیں کمزور ہونے کی وجہ سے وہ ایسا کرتا ہو، لیکن اس سے وہ چوہے جیسا لگنے لگتا تھا۔ پھر اس کی آنکھیں بھی لوہے کے چھرّوں کی طرح اُبھری ہوئی اور دیر تک بنا پلک جھپکے گھور سکنے والی تھیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کا باپ اکثر چوہا مارتے وقت یا اس کا سوراخ کھوجتے وقت چاروں ہاتھ پیروں پر چلتا تھا۔

وہیں سے مولے نے اپنے باپ کا مقابلہ ایک چوہے سے کرنا شروع کر دیا تھا، بلکہ اکثر وہ اسے چوہا ہی سمجھ بیٹھتا تھا۔ مولے کو یاد ہے، ایک بار وہ باپ کے ساتھ چوہوں کی ایک بستی پر حملہ کرنے گیا تھا۔ لاٹھی کے علاوہ پتلے ٹھوس بانس کو آگے کی طرف نوکیلا کر کے بنایا گیا بھالے کی شکل کا ایک ہتھیار بھی اس کے پاس تھا۔ چھید میں گھسے چوہے کو اس ہتھیار کی مدد سے وہ آسانی سے مار لیتا تھا۔ چوہے کے سوراخ کو کسی پھرتیلے چوہے کی طرح پنجوں کے سہارے ہی کھودتے اپنے باپ کو دیکھ کر جانے کیسے اس کے جی میں آیا تھا کہ اس نوکیلے ہتھیار کو وہ اس کی پسلی میں گھسا دے۔

جہاں تک مولے سوچ سکتا تھا، اس کی یہ لڑائی تب سے چلی آ رہی تھی جب سے اس نے چوہوں کے خلاف لڑائی شروع کی تھی۔ شاید باپ کی لڑائی اپنے باپ سے بھی اسی طرح ہوتی رہی ہو گی۔ شاید چوہوں اور چوہوں کے ان دشمنوں میں کچھ باتیں خاصی ایک جیسی رہی ہوں۔ جس طرح چوہوں میں خون کے رشتوں کا کوئی مطلب نہیں رہا ہے، ویسے ہی ان میں بھی نہیں تھا۔ ہر چوہے کو دوسرے چوہے میں اپنا دشمن یا حریف دکھائی دیتا تھا اور ان لوگوں میں بھی۔ چوہے کا سوراخ کھوجنے تک وہ لوگ ایک دوسرے کے مخالف تھے، لیکن گپھائیں کھود کر اپنا شکار نکالنے تک ان کے آگے کے دانت لمبے ہونے شروع ہو جاتے تھے، ان کے جسموں پر بھورے بالوں کا کمبل اُگ آتا تھا اور ان کی ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں مروڑ کھاتی ہوئی نظر آنے والی پونچھیں اگنے لگتی تھیں۔

مگر اِس وقت صورت حال بالکل الگ تھی۔ مولے مولے تھا اور وہ چوہا اس کا شکار نہیں، صرف ایک دشمن تھا، اور مولے کے خیال میں اس نے چوہے کو گھیر لیا تھا۔

چوہا اس طرح اچانک اسے مل جائے گا، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جس طرح کے دہشت کے لمحات سے وہ گزر رہا تھا، اس میں اس کا دھیان اس طرف جاتا ہی نہیں اگر وہ اس کی ایک لمبے عرصے کی 'عداوت' ہی نہ ہوتی۔

وہ جس دنیا کا آدمی تھا، اس کے لیے یادداشت بے معنی سی چیز تھی۔ کیونکہ اکثر آدمی کے لیے یادداشت تاریخ کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے تاریخ کا بھی وجود نہیں تھا۔ صحیح کہا جائے تو مولے اور اس کی ذات کے ان تھوڑے سے لوگوں کے لیے وقت کی ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کے کوئی معنی نہیں تھے۔ احساس بھی نہیں، وہ صرف جینے کا ایک عمل بھر تھے۔

اس دن چوہوں کے سوراخ کو کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد کھودنے پر اسے گیہوں کا اچھا خاصا ڈھیر اکٹھا کیا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ڈھیر اتنا بڑا تھا کہ اس کے لیے لائی ہوئی ٹوکری بھی ناکافی ہی تھی۔ اسی بیچ مولے نے گنگارام کی آواز سنی: ''کون ہے بے؟ کیا کر رہا ہے؟''

یہ کھیت کے مالک کی آواز تھی جسے پہچاننے میں مولے سے غلطی نہیں ہوئی۔ گھبراہٹ میں کافی گیہوں مٹی میں دوبارہ چھترا گیا۔ وہ گھگھیایا، ''میں ہوں سرکار، مولے۔''

اس طرح برآمد کیے گئے گیہوں پر عام طور سے کھیت کا مالک اپنا حق چھوڑ چکا ہوتا ہے اور اس پر برآمد کرنے والے کا حق مانا جاتا ہے۔ لیکن ایک ساتھ اتنا گیہوں دیکھ کر گنگارام کو چوہوں سے زیادہ مولے پر غصہ آنے لگا۔ ''کہاں لیے جا رہا ہے ایں، کہاں لیے جا رہا ہے؟ تیرے باپ کا گیہوں؟''

''ایں سرکار...'' مولے کا باپ گھبرا کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ لیکن مولے نہیں اٹھا۔ اس نے ٹوکری بھی نہیں چھوڑی۔

''ابے حرامی کے پلے، چوری کرتا ہے؟'' گنگارام پھر دہاڑا۔ عام طور پر ایسے آدمیوں سے جو گھر بنا کر رہتے ہوں، کپڑے اور جوتے پہن سکتے ہوں اور اپنے لیے بنائے گئے بازار میں پیسے دے کر اپنی پسند کی چیزیں، چاہے وہ گڑ ہی کیوں نہ ہو، خرید سکتے ہوں، ڈرنا مولے جیسے لوگوں کے لیے فطری بات تھی۔ دراصل وہ چوہے اور آدمی کے بیچ کی کوئی چیز تھے، جو آدمیوں سے ڈرتے تھے لیکن چوہوں کو ڈراتے تھے۔

''میں تو... میں تو کہہ رہا تھا سرکار، تھوڑا بہت ہوتا تو دوسری بات تھی، یہ تو بہت زیادہ ہی

چوہوں نے اکٹھا کرلیا تھا... تھوڑا بہت ہوتا تو بات تھی، میں تو کہہ رہا تھا...'' بدبداتا ہوا مولے کا باپ پیچھے ہٹا۔

گنگارام کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ ''چور سالا!''

''میں پہلے ہی کہہ رہا تھا اس سے۔ سور مانا ہی نہیں، سمیٹنے لگ گیا۔'' باپ اپنے آپ کو بچانے کے لیے انجانے ہی گنگارام کی طرفداری کرنے لگا۔

''مگر... مگر میں نے تو یہ کھود کر نکالا ہے... سبھی نکالتے ہیں...'' مولے نے کسی طرح تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''ابے کھود کر گاڑ دوں گا تجھے، اٹھ!'' گنگارام نے اپنے ہاتھ کی لاٹھی کا موٹا والا سرا مولے کی کمر میں اڑا کر طاقت لگا کر اسے پیچھے دھکیلا۔ مولے نے محض عادتاً دلچسپی سے بنائی اور ہمیشہ ہاتھ میں رہنے والی، چوہے کو چھیدنے کے کام آنے والی لمبی چھڑی گرتے گرتے ہاتھ میں تھام لی۔ عادت کی وجہ سے کی گئی صرف اسی حرکت نے اس کے بعد ایک بھاری ہنگامہ پیدا کر دیا۔

گنگارام دہشت زدہ ہو گیا۔ اس نے ایک بار دور دور تک پھیلا سناٹا دیکھا اور پھر اپنے نوکیلے ہتھیار کی طرف بڑھا ہوا مولے کا ہاتھ اور یکایک چیخ پڑا۔ ''ارے، دوڑو رے! مار ڈالا...'' چیختا ہوا وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ صرف اس لیے خطرناک دِکھنے لگتے ہیں کہ ان کے پاس سونے کے لیے گھر نہیں ہوتا اور حجامت کے لیے استرا ابھی انھیں نہیں مل پاتا۔ چونکہ وہ کپڑے بھی نہیں کے برابر پہنتے ہیں، اس لیے سماج دشمن عنصر لگنے کے پورے امکانات ہو جاتے ہیں، اور لوگ ان کی تصوراتی کمینگی پر بڑی آسانی سے یقین کرنے لگتے ہیں۔

گنگارام کے بھاگ جانے کے بعد مولے ڈر گیا۔ اس کا باپ گنگارام سے پہلے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اتنا احساس مولے کو ہوا کہ اسے جلدی ہی وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ اناج وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے جتنا ممکن ہوا اتنا ٹوکری میں بھرا اور مارے گئے دو چوہے اس نے کمر کی رسی سے لٹکا لیے اور چل پڑا۔

وہ ماحول بہت عجیب تھا اور یقینی طور پر خونخوار لوگوں کی بستی والا تھا۔ اندھیرے میں لپٹی زمین

Scanned with CamScanner

اور دھند لکے سے پُتے آسمان کے بیچ، بنا کسی روشنی کے، وہ لوگ ہلتے ڈُلتے اپنا کام کر رہے تھے اور ان کے ساتھ کے ڈرپوک مریل سے کتے تھوڑی دور سے چیختے سیاروں کی آواز میں اکثر اپنی آوازیں ملانے لگتے تھے۔ چونکہ ان لوگوں کی بستی شہر نہیں تھی، اس لیے اتنے نزدیک آ جانا موت کی وجہ نہیں بنے گا، یہ سیار بھی جانتے تھے۔

گنگا رام اور اس کے ساتھی اپنے ساتھ لالٹینوں اور مشعلوں کے علاوہ بیٹری سے جلنے والی بتیاں بھی لائے تھے۔ یہ لوگ طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر چلے تھے، گویا وہ کسی خطرناک اور ازمنۂ وسطیٰ کی جنگ کے لیے نکلے ہوں۔

گنگا رام اور اس کے ساتھی گاؤں والوں کو دیکھ کر اندھیرے میں ہلتے ڈُلتے مانس پنڈ خاموش ہو گئے۔ سہم گئے۔ گاؤں والوں کی وہ بھیڑ تیزی کے ساتھ، لگ بھگ کسی فوج کی مستعدی سے، ان لوگوں کے بیچ گھسی۔ وہ اپنے ہتھیاروں کو اٹھائے ہوئے جس طرح چوکنا ہو کر آگے بڑھ رہے تھے اس سے وہ مضحکہ خیز ہی لگ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ کھائیوں اور جھاڑیوں میں چھپے گوریلا لڑاکوں کا نشانہ لینے والے ہوں۔ ان میں سے شاید ہی کوئی بہادر ہو، لیکن جن کے بیچ وہ اپنا شکار کھوجنے آئے تھے، ان کے مقابلے میں تھوڑے بہتر وسائل اور بہتری کے احساس کی وجہ سے وہ جنگجو بن گئے تھے۔

مولے نے انھیں آتے دیکھا۔ دور کے مستقبل کے بارے میں وہ ضرور اندھا تھا لیکن اتنے نزدیک ہی کچھ خطرناک ہونے کا احساس اسے ویسے ہی ہو گیا جیسے اس کے قدموں کی آہٹ سے چوہے چوکنا ہو جاتے تھے۔ آنے والی مصیبت نے اس کی رانوں میں اپنے ناخن گاڑ دیے اور اٹھ کر کھڑے ہوتے وقت اسے اپنی ٹانگیں بے حد کمزور معلوم ہوئیں۔

"چور... چور... پکڑلو!" گنگا رام ہاتھ کی بیٹری والی بتی کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالتا ہوا چیخا۔ چیختے وقت وہ خود بھی گھبرا رہا تھا کیونکہ اس کی آواز بہت واہیات ڈھنگ سے پھٹ گئی تھی۔

مولے نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا باپ اسی کے قریب بیٹھا ہوا چوہوں کی کھالیں اتار رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے جانور کی طرح ہی پیچھے کی طرف کھسکا۔ کھسکنے کے بعد عجیب آواز میں بھنبھنایا، "میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا... میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا..."

Scanned with CamScanner

گنگارام کی للکار پر اسے پکڑا کسی نے نہیں، ہاں بیٹری والی بتی کی ڈنک مارنے والی روشنی کی وجہ سے پیدا ہوئی اندھیرے کی گپھا سے ہاتھ بڑھا کر کسی نے اس پر لاٹھی چلائی۔ لاٹھی مارنے والا یا تو بے حد اشتعال میں تھا یا پھر ڈرا ہوا تھا۔ لاٹھی مولے کے کندھے کو چھیل بھر سکی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے جان سے مار دینے والی آواز پیدا ہوئیں۔ انھیں سن کر وہ بنا کچھ سوچے پلٹ کر بھاگا۔

یہاں اس نے تھوڑی سی غلطی کی۔ اگر اپنے دشمن اس چالاک چوہے کی طرح جھک کر اس نے لوگوں کی ٹانگوں سے نکل بھاگنے کی کوشش کی ہوتی تو لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگ ہی کھڑے ہوتے۔

جس وقت وہ بھاگ رہا تھا اسی وقت کسی نے آواز لگائی، ''جانے نہ پائے، پکڑو!''

اسی بیچ بھاری پتھر یا کلھاڑی جیسی کوئی پھینک کر ماری گئی چیز اس کے کولھے سے ٹکرائی، ٹکرا کر گر بھی گئی، لیکن مولے اس چیز کے ٹکرانے کا درد کولھے پر چپکائے بھاگتا گیا۔ اس کے پیچھے بھاگنے والوں کو اس وقت سب سے زیادہ پریشانی لالٹینوں کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ حالانکہ مولے کو بھاگنے کے لیے لالٹین کی ضرورت نہیں تھی اس لیے وہ کافی اچھی طرح سے بھاگ رہا تھا، لیکن اتنی بڑی بھیڑ نے آخر نالے کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے دھر ہی لیا۔

مولے رک گیا۔ وہ جانتا تھا اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ رکا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف پھیلائے اور لگ بھگ بھر بھرا کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اسی وقت آگے بڑھ کر کسی نے ایک لمبی سی لاٹھی ماری۔ وہ لاٹھی آدھی مولے پر اور آدھی زمین پر پڑی۔ اس کے بعد کئی لاٹھیاں ایک ساتھ گریں۔ مولے پہلی لاٹھی کے بعد ہی زمین پر کپڑے کی گٹھڑی کی طرح گر گیا۔

تبھی کسی نے قانونی سمجھداری دکھاتے ہوئے کہا، ''سنبھال کے رے! دفعہ تین سو دو نہ بننے پائے۔''

''ہاں، تین سو دو نہ بننے پائے،'' گنگارام نے بھی کہا۔

''اندرونی چوٹ مارو، اندرونی۔ ضربِ خفیف ہوگا،'' اسی قانون باز نے پھر کہا۔

ایسا ہوتا ہے چور — گاؤں کی عورتیں اور ڈرے ہوئے بچے بڑی رات تک نیم کے پیڑ کے ساتھ بندھے مولے کو دیکھنے آتے رہے۔ باندھنے کے بعد چونکہ اسے پیٹنا کمزور سے کمزور آدمی کے لیے بہت آسان تھا، اس لیے لگ بھگ ہر کسی نے اسے پیٹ لیا تھا۔ بلکہ کئی لوگ اس بات کی

Scanned with CamScanner

شکایت کرنے لگے تھے کہ وہ کتنا سخت جان ہے۔
اس کے جسم سے بہتے ہوئے خون اور چہرے کی سوجن نے اسے گاؤں والوں کے لیے پرانے قصوں سے نکلا سماج دشمن بنا دیا تھا۔

اگلے روز گاؤں میں پولیس کے لوگ آ گئے۔ ان میں سے ایک سب سے بڑا حوالدار لگاتار ڈکار لیتا رہتا تھا۔ موٹے کو دیکھ کر اس نے ڈکار لیتے ہوئے کہا، ''ہاں، تو یہی ہے وہ حرامی! میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔''

''یہی ہے صاحب،'' کسی نے ڈکار لے کر بولنے والے حوالدار کے پیچھے سے کہا۔
حوالدار نے پیچھے گھوم کر ڈکار لی اور بولنے والے کو گھورا۔ وہ سہم کر چپ ہو گیا۔
ایک سپاہی غرایا، ''تم سے کس نے کہا بیچ میں بولو؟ ہم تفتیش کر رہے ہیں۔''
دوسرا سپاہی زیادہ ہی عقلمندی دکھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''یہ شاطر لگتا ہے۔ اس کی تو بہت سے معاملوں میں تلاش ہوگی۔ تفتیش...''
''تفتیش وفتیش مت جھاڑو۔ اب اس کو لے چلو،'' حوالدار نے کہہ کر پھر ڈکار لی۔
دو سپاہی اور حوالدار کے ساتھ ایک چھوٹی سی بھیڑ اسے لے کر تھانے کی طرف چل دی۔
کسی نے کہا، ''ہوشیار رہیے گادیوان جی، اس کے پاس اسلحہ ہو سکتا ہے۔''
''اسلحہ کیا، بم ہی چھپائے ہو سکتا ہے اپنے لنگوٹے میں،'' ایک اور بولا۔ پھر کچھ یاد کر کے اس نے جوڑا، ''ایسے خطرناک مجرم پرچیاں بھی رکھتے ہیں۔''
''پرچیاں؟'' پہلے نے پوچھا۔
''ہاں پرچیاں، سیاسی پرچیاں۔''
''یہ کون سیاست بگھار رہا ہے؟'' ڈکار لے کر حوالدار نے گھر کا۔
بولا کوئی نہیں، اب وہ لوگ تھوڑا فاصلے سے چلنے لگے تھے اور تھانے تک کا لمبا راستہ خطرناک ڈاکوؤں اور قاتلوں کے قصے سنا کر طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔
ان قصوں میں ایک طرح کی مسابقت بھی تھی۔ اکثر اپنے قصے کو کسی دوسرے سے کم خطرناک

محسوس کر کے دوسرے سے چڑ جاتا تھا اور اس زیادہ خطرناک قصے کو ناقابلِ یقین ثابت کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ اس میں خاصا من مٹاؤ بھی پیدا ہوتا جا رہا تھا۔

تھانے پر ان لوگوں کو باہر بیٹھا دیا گیا اور سپاہی 'کلنگ کی جنگ کے فاتح' سپہ سالار کی طرح مولے کو لیے اندر چلے گئے۔

تھانے کی بے حد گندی کوٹھری میں بند ہونا مولے کے لیے ایک عجیب تجربہ تھا۔ اپنے ہوش میں اس نے اتنی صاف ستھری، پکی دیواروں اور چھت والی جگہ میں قدم نہیں رکھا تھا کیونکہ وہاں چاروں طرف سے بدبو آ رہی تھی۔ مٹی کوڑے کو مہینوں سے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ وہ سب کچھ اسے اچھا ہی لگتا رہتا اگر گھٹنے کے درد سے چڑچڑائے بدمزاج داروغہ نے اسے ناحق پٹوایا نہ ہوتا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ پٹائی تو داروغہ نے محض رسمی طور پر ہی کی تھی اور باقاعدہ تکلیف دیے جانے کا سنہری موقع اس نے کبھی بعد کے لیے ٹال رکھا تھا۔

دوپہر کے قریب ایک سپاہی نے اس کی کوٹھری کا دروازہ کھولا اور سٹپٹا گیا۔ ٹھیک اسی مکار چوہے کی طرح سپاہی کی ٹانگوں کے بیچ سے بے حد تیزی سے وہ نکلا۔ اسے کسی سوّر کی طرح اپنی طرف آتے سپاہی نے دیکھ لیا تھا۔ چونکہ وہ ٹانگوں کے بیچ سے نکلا تھا، اس لیے موٹے سپاہی کا جسم تھوڑا اونچا ہوا اور دھم سے نیچے گرا۔ وہ چلّایا: ''ارے مار ڈالا''

دو لمحے بعد ہی مولے تھانے سے باہر جھاڑ جھنکاڑ کی طرف بھاگ رہا تھا۔

گرا ہوا سپاہی بے حد پریشان ہو گیا۔ اسے لگا، داروغہ اس کی جان ہی لے لے گا کیونکہ بھاگتے وقت مجرم نے اس کی ٹانگوں سے نکلنے کی بدتمیزی کے علاوہ اسے ایک خراش بھی نہیں لگائی تھی۔ وہ ڈر گیا کہ داروغہ سب سے پہلے تو یہی پوچھے گا کہ وہ اپنی ٹانگیں سمیٹ کر کیوں نہیں کھڑا ہوا تھا۔

بے حد لمبی دوڑ کے بعد مولے نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں آ رہا ہے۔

تب اس نے تھوڑا سا ٹھہر کر لمبی لمبی سانسیں لینی شروع کیں۔ یہاں سے اسے نئی دوڑ شروع کرنی تھی۔

ٹھیک اسی وقت اس کی نگاہ اس مکار چوہے پر پڑی جو مونچھیں مٹکاتا ہوا چمکیلی آنکھوں سے اس کے بھاگنے کی گواہی کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ بھاگنے کی بجائے ایک دم ٹھہر گیا۔

Scanned with CamScanner

مولے کے پاس اس وقت اس کا ہتھیار نہیں تھا۔ لاٹھی بھی نہیں تھی۔ وہ عام طور پر چوہے کے شکار کے وقت غصے میں نہیں آتا تھا، بے حد صبر کے ساتھ وہ اپنی کارروائی کرتا تھا۔ لیکن لمبی دوڑ، زخمی اور چوٹ کھائے جسم کے علاوہ اپنے پیچھے لگے خطرے کی وجہ سے اچانک ایک شرارت کی طرح مل گئے اس چوہے پر اسے زبردست غصہ آنے لگا۔ مولے نے اپنی جلتی ہوئی آنکھیں مچمچائیں۔ اسے یکایک تعجب ہوا کہ بیچ بیچ میں چوہے کی جگہ اس کا باپ کیوں اسے دکھائی دے جاتا ہے۔

پتا نہیں کتنی دیر دونوں اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے رہے ہوں گے، لیکن جب مولے کو لگا کہ وہ مخلوق اس کے صبر کا امتحان لے رہی ہے تو اسی نے پہل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک بھدی سی گالی نکالتے ہوئے اس نے اپنے اور چوہے کے بیچ کا فاصلہ کم کیا اور نیچے جھک کر مٹی کے کچھ مضبوط اور بڑے بڑے ڈھیلے اٹھائے۔ لگ بھگ بجلی کی سی تیزی سے بے حد طاقت کے ساتھ اس نے ایک ڈھیلا چوہے پر پھینکا۔ دھوپ میں تپتی ہوئی کھیت کی مٹی خاصی بھربھری ہوگئی تھی۔ ڈھیلے کی چوٹ سے وہاں گرد کا ایک بگولا سا اٹھا اور مولے نے دیکھا، بنا کوئی نقصان اٹھائے چوہا الٹی طرف بھاگا جارہا ہے۔ مولے نے موقع گنوایا نہیں۔ اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہ لگاتار اس پر ڈھیلے چلاتا رہا۔ تب چوہا اچانک ٹھٹک گیا اور مولے کی طرف گھوما۔ مولے چونکہ بھاگتے چوہے پر اگلے ڈھیلے کا نشانہ لگا چکا تھا، اس لیے ڈھیلا تھوڑا آگے جاکر گرا۔ اور تبھی چوہے نے مولے کے لیے نہایت ذلت آمیز حرکت کردی — تیزی سے جھپٹ کر وہ مولے کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل گیا۔ وہ بے تحاشا چوہے کے پیچھے بھاگا اور تبھی اس نے جو کچھ دیکھا اس نے اسے ایک بار پھر ٹھٹک جانے پر مجبور کردیا۔

اس کے ٹھیک سامنے اپنے اگلے دانت چمکاتا ہوا اس کا باپ کھڑا تھا۔ چوہے کی بجائے باپ کی موجودگی نے اسے سکتے میں ڈال دیا۔ باپ کے اس طرح اچانک ظاہر ہونے کا حادثہ مولے کے احساسات سے ٹکرایا اور ان میں ایک نہ سمجھ میں آنے والی تبدیلی آگئی۔

اس کا باپ چوہے میں بدل گیا تھا۔ چوہا چونکہ اب دونوں کے بیچ تھا، اس لیے اس کا باپ اس کے ممکنہ شکار کی امید میں عجیب ڈھنگ سے اچھل اچھل کر چچیانے لگا۔

مولے نے دیکھا، باپ نے اپنے ہاتھ کے نوکیلے سے ہتھیار کا وار کرنے کی تیاری کرلی ہے۔

Scanned with CamScanner

ٹھیک اسی وقت مولے کا پھینکا ہوا بھاری ڈھیلا اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ شاید تکلیف یا گھبراہٹ کی وجہ سے باپ کے ہاتھ کا ہتھیار چھوٹ گیا اور وہ لڑکھڑایا۔ مولے نے دوسرا ڈھیلا بھی چلایا۔ باپ بے ڈھنگے طریقے سے اچھلنے لگا۔ آس پاس کا دھوپ سے تپا ہوا سناٹا کافی دور ہٹ کر اس جنگ کو دیکھنے لگا۔

ہاتھ کا ہتھیار اٹھانے کی جلد بازی میں باپ اپنی ہی ٹانگوں میں الجھ کر گر پڑا۔ مولے نے اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے باپ پر چھلانگ لگا دی۔ لگ بھگ اس کی کمر پر گھٹنوں کے بل بیٹھے بیٹھے اس نے ہاتھ کا بھاری ڈھیلا چلایا۔ وہاں بھد کی آواز ہوئی اور باپ کلکلانے لگا۔ اب وہ اپنی حفاظت کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ کسی چوہے کی طرح ہی بدن مروڑ کر اس نے دونوں پنجوں سے مولے کی پنڈلی پکڑی اور اپنے کمزور دانتوں سے کاٹنے لگا۔ دانت زیادہ گہرے نہیں گڑے تھے، لیکن پنجوں کو پنڈلی سے چھڑانے کی کوشش میں اس کے ناخنوں نے کافی کھال کھرچ لی تھی۔ درد سے مولے دانت کچکچانے لگا۔

باپ نے پنجے بڑھا کر اس کی دوسری پنڈلی بھی پکڑ لی۔ مولے کو لگا، اس کا شکار زیادہ ہی خونخوار ہو اٹھا ہے۔ اپنی پنڈلیوں اور کمر سے لپٹتے جاتے آدمی سے چھوٹنے کی کوشش میں وہ خود بھی لڑھک کر گر گیا، لیکن اب اس نے پھرتی کے ساتھ باپ کے ہاتھ سے گرا نوکیلا ہتھیار اٹھا لیا۔ باپ نے اسے اپنی طرف آتے نہیں دیکھا۔ مضبوط پتلے بانس کی تیکھی نوک اس کے کمر کے پاس کے گوشت میں آسانی سے دھنس گئی۔ اسے کھینچتے وقت وہاں کھال کا ایک چھوٹا سا تمبو جیسا تب تک بنا رہا جب تک ہتھیار بدن سے باہر نہیں آ گیا۔ ہتھیار باہر آتے ہی پسینے اور گرد بھرے بدن پر گاڑھا سرخ خون تیزی سے پھیلنے لگا۔

باپ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ لیکن اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے پنڈلی کو چھوڑ کر گردن کو موڑتے ہوئے کمر کے پاس پھیلتے اس خون کو دیکھا اور اس کے دانت اور زیادہ کھل گئے۔ اس کا منہ حلق تک ایک گپھا کی طرح بن گیا۔ مولے کا دوسرا وار اس کے چہرے پر ہوا۔ شاید اسے وہ کھلا منہ سخت ناپسند تھا۔ اس کے بعد اس نے موقع نہیں دیا۔ دہشت سے بے جان ہوئے جسم کے پاس کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے وہ بار بار اس نوکیلے ہتھیار کو گھسانے لگا۔ ہر بار ہتھیار اتنی آسانی سے دھنس جاتا تھا کہ اسے ایک قسم کی گدگدی سی محسوس ہوتی تھی۔ کامیابی کی خوشی اور اس

Scanned with CamScanner

گدگدی کی وجہ سے اس کی آنکھیں لگ بھگ مُند گئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں اس کا ہاتھ تھک گیا اور وہ ہتھیار تھامے ہوئے ہانپنے لگا۔ اسے اپنی کوشش کی کامیابی کا احساس ہو گیا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

دھوپ کی چمک میں بھی اسے پہچاننے میں مشکل نہیں ہوئی۔ اس سے کافی محفوظ فاصلے پر جو ہتھیار بند شکلیں کھڑی تھیں، وہ پولیس کے سپاہی تھے۔

''ہوشیاری سے، خطرناک ہے!'' کسی سپاہی نے آواز لگائی۔

مولے کے چھلے ہوئے پیر کی ٹیس بدن کے الگ الگ حصوں کی تکلیف میں ایک نئی شرکت تھی۔ کوشش کر کے مسکراتے ہوئے اس نے کہا، ''ارے نہیں صاحب، خطرناک نہیں ہے۔ مگر حرامی نے کاٹ کھایا ہے۔ چوہے کاٹتے بہت زور سے ہیں...'' کہہ کر وہ اپنی پنڈلی دیکھنے لگا۔

❁❁

Scanned with CamScanner

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

سانچی بولو راجہ

موقعے پر وہ یہ بھی بتا سکتا تھا کہ اینٹھن یا پیچش میں کس چیز کا پھنکا لگانا چاہیے۔ اگر حکیم نہ سہی تو دشمول کے کاڑھے کا نسخہ باندھ سکنے والا عطار وہ ضرور تھا۔ اور خالی عطار ہی کیوں، ویدھوں کے منجن، چورن اور انجن کی ڈبیا وہ کافی بیچ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر لوگوں کی ٹنکچر آیوڈین، بورک پوڈر اور ایڈوفارم جیسی چیزیں بھی گراہکوں کی ضرورت پر پیش کرنے کی وجہ سے اسے کھاسے کمپاؤنڈر کا جوڑی دار مانا جا سکتا تھا۔ عورتوں کے باورچی خانے کا مسالہ، بوڑھوں کی بیماریوں کی دوائیں اور چاٹنے کا ستو اور بچوں کے لیے منگھا رام کے کارخانے والے لیمن جوس، بات بات میں سالے بہنوئی بنانے والے پٹے بازوں کے لیے تو کھیا پتنگیں، پڑھنے لکھنے والوں کے لیے کاغذ، قلم، پنسل، بابوؤں کے لیے لپٹن کی ٹکی چائے — غرض کہ ہریش چند اپنے میں اکیلے ہی ایک خاصے اچھے گڑبڑ جھالا بازار کا کام دے جاتا تھا۔

دکان میں ہریش چند کے علاوہ اور کوئی بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ سارا سامان ٹھنسا پڑا تھا۔ ذرا چوکے کہ ٹانگ تیل کے پیپے میں جا گھسی، پیٹھ پر سابودانے کی ہانڈی بھدا کے کے ساتھ آ گری، نک چھیدوں میں جھاڑو کی سینکیں گھس گئیں، ہاتھ کے پنجے میں چوک کا پکا مانجھا الجھ پڑا اور کالا کھٹید ار کنکوا انگریزی کالر کی طرح گردن میں آ پڑا۔ مگر ہریش چند ایسا موقع کم ہی آنے دیتا تھا کیونکہ وہ ایسی صورت میں اپنے بچاؤ کی قطعی کوشش نہیں کرتا تھا، کیونکہ اسی وجہ سے وہ قیامت آتی تھی — بھلے ہی وہ

Scanned with CamScanner

آٹے کے پیپے سے لدابد ہو کر بھوت بن جائے۔

''ارے بھائی ہریش چندا!'' سپاہی نے بچھونے کے اندر اپنا کولھا کھجاتے ہوے آواز لگائی۔

''حکم کیجیے حوالدار شاہیب۔''

''چائے کی پڑیا ہو گی نا؟''

''ہے تو، دے جاؤں آ کر کیا؟''

''نہیں نہیں، میں خود آتا ہوں،'' کہہ کر سپاہی اٹھنے کے لیے زور لگانے لگا۔

''آیئے ماسٹر شاہیب، آیئے۔ کچھ حکم کیجیے،'' ہریش چند نے شلوکے کے پھندنے میں گانٹھ لگاتے ہوے کھیسیں نکوس کر کہا۔

''جے رام جی کی بابو جی!'' بڑے لڑکے نے اپنے کو بڑ کو دروازے سے رگڑتے ہوے کہا۔

دوسرا لڑکا بھی ایک بار باپ کی طرف اور دوسری بار بھائی کی طرف دیکھ کر بولا، ''جے رام بابو!''

''جیتے رہو، جیتے رہو! شاباش!'' ماسٹر صاحب نے بچوں کو دعائیں دیں اور بولے، ''ارے بھائی، ذرا دو آنے کی شکر تو دینا۔''

''دو آنے کی؟ بابو جی، پوری پاؤ بھر تیرہ پیشے کی لے لیجیے۔ ویشے اِش میں میرا انکشان نہیں فائدہ ای ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں، اتنے دنوں شے آپ کی کھدمت میں ہوں — ایک پیشہ لوں گا مگر ایمانداری شے ہی لوں گا۔ اور بابو جی، آپ شے اب کیا بتاؤں، اشل میں برکت ایمان کے پیشے میں ہی ہوتی ہے۔'' اس نے اپنی بھری پری دکان پر ایک نظر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو: اور یقین نہ ہو تو اس دکان پر میرے پیسے کی برکت کا پھل دیکھ لیجیے۔

ماسٹر جی نے اس کی ایمانداری پر یقین کیا۔ اس بیچ ان کا چھوٹا بچہ، جو سویٹر کی جیب میں ہاتھ گھسیڑے تھا، اس کبڑے لڑکے کو گھورتا رہا۔ باپ نے ٹوکا، ''بیٹا، ہریش چند کو نمستے نہیں کی!''

لڑکا کچھ نہیں بولا، چپ چاپ گھورتا رہا۔ ہریش چند نے بنا نمستے کے ہی دعائیں دینی شروع کر دیں۔ ''جیتے رہو، کھوب پڑھو، بڑے ہو، ایں! ہو ہو، ابھی بچہ ہیں بابو جی!''

لڑکا تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا۔ پھر بولا، ''میں بچہ نہیں ہوں۔ کھلو نے نہیں کھیلتا۔''

بنیا ہو ہو کر کے ہنسا اور ترازو پر شکر چڑھانے لگا۔ سپاہی ایک سلیٹی رنگ کا لمبا چوڑا لبادہ اوڑھ

Scanned with CamScanner

کر دکان پر آ پہنچا۔ بھاری بھر کم جوتوں میں اس نے بنا فیتے کے ہی پاؤں گھسیٹر رکھے تھے، لہٰذا وہ سڑک کوٹنے والے کسی اوزار جیسے دکھ رہے تھے۔ ماسٹر صاحب نے پیچھے ہٹ کر جگہ دیتے ہوئے ادب سے کہا، ''اوہ، حوالدار صاحب، آیئے، آیئے! آداب عرض!''

''آداب عرض آداب عرض!'' سپاہی نے سوتے میں تتر بتر ہو گئی مونچھیں سنوارتے ہوئے کہا۔ وہ ایک کورا سپاہی ہی تھا مگر اس کے بھاری بھر کم جسم کو لوگ حوالدار سے کم کہنے میں ہچکچاتے تھے۔ اس کے حوالدار ہونے کے موقعے بھی آئے کیونکہ وہ پرانا اور وفادار آدمی تھا۔ مگر ابھی تک نہ تو اسے پریڈ میں قدم ملانے کی مشق ہو پائی تھی اور نہ چست وردی پہننے کی۔ قدم ملانے کی کوشش میں وہ نہ جانے کیسے ہمیشہ اگر داہنا پاؤں آگے بڑھاتا تھا تو داہنا ہی ہاتھ بھی نکالتا تھا اور یوں عجب بے ڈھنگی چال چلتا تھا۔ اپنا لمبا چوڑا اوورکوٹ اسے کافی پسند تھا۔ اسے پہن کر وہ پیچھے سے ایک بھاری گینڈے کی شکل کا دکھتا تھا۔ یہ کوٹ اسے کافی پسند تھا۔ یہ کوٹ اس کے لیے کچھ نامبارک بھی ثابت ہو چکا تھا۔ اسے وہ برساتی کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا اور آتے جاتے اپنی پریمکا کو بھی اسی خول میں بندریا کی طرح چھپا لیتا تھا۔ ایک دن وہ اسے اپنے اوورکوٹ میں چھپائے کہیں لیے جا رہا تھا کہ اس کے حلقے کے داروغہ نے دھر پکڑا۔ نوکری سے تو نہیں نکالا گیا، مگر ترقی رک گئی۔ تب سے اس نے اپنی پریمکا کی ناک کاٹنے کی ٹھان لی تھی اور وہ بھاگ کر دھوبیوں کی بستی میں رہنے لگی تھی۔ ان دنوں اس کی زبان پر ایک غزل چڑھ گئی تھی جسے وہ کبھی قوالی اور کبھی رامائن، یہاں تک کہ ہنومان چالیسا کی طرز پر گایا کرتا تھا:

کیوں آگ لگائی جاتی ہے، کیوں درد بڑھایا جاتا ہے
کیوں ہم کو نسیلی آنکھوں سے، بیہوس بنایا جاتا ہے

'کیوں' کو وہ کبھی کبھی 'بھی' سے بدل دیا کرتا تھا۔ تالیاں دیتے جانے کے ساتھ گلے کو اس قدر بیٹھاتا تھا کہ آواز ہیجڑوں جیسی بن جاتی تھی۔ کسی سے ملنے پر وہ اس کی خیریت ضرور پوچھتا تھا، لیکن جواب کی امید کیے بنا ہی یا تو اپنی بات چھیڑ دیتا تھا یا سوکھی گھاس جیسی الجھی مونچھیں سنوارتا آگے بڑھ جاتا تھا۔ ''ماسٹر صاحب، اور سب حال چال ٹھیک ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ماسٹر صاحب بتانے لگے، ''ہاں، سب آپ کی مہربانی ہے...''

لیکن سپاہی بنا پوری بات سنے ہی ہریش چند سے پوچھنے لگا، ''آج بالا سنگھ نہیں دکھا؟''

''لووہ تو آ گیا،'' ماسٹر صاحب نے اشارہ کیا۔ سپاہی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ذرا اترچھا ہو کر مونچھ کے بال اینٹھتا ہوا، نیچے کے ہونٹ کا ایک سرا اوپر کے ایک کنگر دانت سے دبا کر مسکرانے لگا۔

بالا سنگھ ایک کمسن گورا چھوکرا تھا جو بالوں کو زیادہ تر کھلا رکھتا تھا۔ چہرے پر بال نہیں دکھتے تھے، گو کہ ایک آدھ موٹا سا بال ٹھڈی کے نیچے دکھائی پڑ جاتا تھا جسے وہ زیادہ تر اکھاڑ دیا کرتا تھا کیونکہ وہ ابھی سے اپنے صاف گالوں پر بن مانسوں جیسے بالوں کے گچھے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کوئی ایک نیا گانا سیکھ آیا تھا:

ساری رات میں تکنی آں راہ، تاریاں توں پُچھ چن وے
تیرے پچھے میں ہوئی آں تباہ، تاریاں توں پُچھ چن وے

چھوکرے نے سپاہی کو ترچھی آنکھوں سے گھورا، ماسٹر کو نمستے کیا اور ہریش چند سے چھٹانک بھر مونگ کی بڑھیا دال مانگی۔ ہریش چند ماسٹر صاحب کی شکر کی پڑیا باندھتا ہوا کہنے لگا، ''آج تو بڑا اچھا گانا سیکھ آیا رے! کوئی نیا بائیسکوپ دیکھا ہے کیا؟''

سپاہی لڑکے کو رومانی نظروں سے تاکتا ہوا کہنے لگا، ''آج کل فلموں میں گانے اچھے آنے لگے ہیں۔ کیوں ماسٹر صاحب؟''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،'' ماسٹر صاحب شکر کی پڑیا کوٹ کی جیب میں ٹھونستے ہوئے بولے۔ اور کوئی موقع ہوتا تو وہ سنیما دیکھنے سے ہونے والی ہانیوں پر ایک لمبا چوڑا کلاسک بتا جاتے۔ اسی بیچ انھوں نے سنا، ان کا لڑکا دوسری طرف گھوم کر گنگنانے لگا تھا: ''کہاں گنوائی ساری رین ہو، سانچی بولو راجہ!''

ماسٹر صاحب کی بھنویں چڑھ گئیں۔ ''کیا گا رہا ہے رے؟'' انھوں نے ڈانٹا۔ لڑکا گھوم کر سہما سا چپ ہو رہا۔ سپاہی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''ہو ہو، واہ بیٹا واہ، کیا گانا نکالا ہے — سانچی بولو راجہ! آئے ہائے! ہو ہو!''

''یہ چھوکرے بے حد پاجی ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں تمام ایسی بیہودہ باتیں کیسے سیکھ جاتے ہیں۔ گدھا کہیں کا!'' ماسٹر صاحب بڑبڑانے لگے۔

''اوہ کہیے ماسٹر جی، کیا ہوا؟'' ایک صاحب لمبی سی جمائی چھوڑتے ہوئے آ کھڑے ہوئے۔

Scanned with CamScanner

ماسٹر صاحب بولے، ''کیا ہوا، ان چھوکروں کی بات کر رہا تھا۔ ایسے پاجی ہو گئے ہیں، ابھی سے اتنی گندی باتیں سیکھنے لگے ہیں۔ سوشل ا۔ٹما سفیئر کا کیا کہا جائے۔''

''ارے ماسٹر شاہیب، ابھی بچے ہیں، آپ شیکھ جائیں گے۔ اور بڑے ہونہار ہیں یہ شب،'' ہریش چند چھٹانک بھر بڑیوں کی پڑیا لپیٹتا ہوا بولا۔ آنے والے صاحب مسواک کا سرا کترنے لگے تھے۔ بولے، ''آخر بات کیا ہوئی؟''

اس پر بالا سنگھ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنے لگا، ''ہوا کیا! یہ گا رہے تھے: کہاں گنوائی ساری رین ہو، سانچی بولو راجہ!''

سپاہی نے پھر زور سے ایک غیر ضروری ''ہو ہو'' کی۔

''کیوں بیٹا؟'' وہ صاحب بچے کے کندھے پر ہاتھ تھپکتے ہوئے نصیحت کرنے لگے، ''ایسی باتیں سیکھا نہیں کرتے نہ بیٹے — ہاں!'' لڑکا انھیں گھورتا رہا۔ ''ارے اب کیا ہے صاحب...'' وہ مسواک چباتے کہتے گئے، ''ہم لوگوں کا بھی زمانہ تھا۔ مجال تھی بھلا ہم لوگ کبھی بری باتوں پر آنکھ بھی اٹھا دیں۔ غضب ہو جائے جی۔ گھر سے نکل کر کھیلنے سڑک پر نہیں آپاتے تھے۔ تبھی نا دیکھیے، جغرافیہ وغیرہ کا ایسا اچھا حافظہ تھا کہ بس، اب آپ سے کیا کہوں! ضلع کے تھانے کے نام، کمشنریاں، پرگنے — اس فرّاٹے سے یاد تھے کہ بس آپ سے کیا کہوں!''

''ارے، اس زمانے کی بات ہی اور تھی۔ کہاں رہا اب وہ زمانہ اور کہاں رہی وہ تہذیب۔ ویدک عہد میں تو بچوں کو گروکلوں میں رشی لوگ پڑھاتے تھے۔ تب ان کا کردار بنتا تھا،'' ماسٹر صاحب آسمان کی طرف تاک کر اس ادا سے بولے جیسے یہ کوئی ان کے بچپن کی بات رہی ہو۔

''دیکھو بیٹا، اب مت گانا اس گندی بات کو۔ سمجھے؟ ہاں، بڑے اچھے لڑکے ہو تم! کس سے سیکھا تھا یہ گانا تم نے؟'' وہ صاحب پوچھنے لگے۔

''میں اچھا لڑکا ہوں۔ یہ گانا مانو گاتی ہے،'' لڑکا چھاتی پھلا کر بولا۔

وہ صاحب چونک گئے۔ ''ہونہہ! یہ سب انھی بدذاتوں کی تعلیم ہے، پاجی کہیں کے!''

''تھے تو سچ مچ بہت برے ماسٹر صاحب۔ میں کہتا ہوں، وہ لوگ اتنے برے تھے کہ اب آپ سے کیا کہوں۔ آپ خود جانتے ہیں... اگر وہ محلے میں تھوڑے دن اور رہ جاتے... بس ایک

مہینہ اور، میں کہتا ہوں سارے کے سارے محلے کو خراب کر ڈالتے۔ میں کہتا ہوں، بھٹیار خانہ بنا دیتے بھٹیار خانہ۔ بڑا بھلا ہوا جو آپ لوگوں نے انھیں نکال باہر کیا۔''

''ارے میں کیا! ارے یہ تو سب حوالدار صاحب کی مہربانی اور محنت کا پھل ہے، ورنہ ہمارے کیے کیا ہوتا؟''

اب سپاہی خاص طور سے مخاطب ہوا۔ گو کہ ابھی تک کی باتیں اس نے بالا سنگھ کے ساتھ مذاق کرنے میں نہیں سنی تھیں، مگر انداز سے بولا،''ارے صاحب، ہم تو آپ کے خدمتگار ہیں۔''

اس پر ہریش چند کہنے لگا،''نہیں، ایشی بات نہیں۔ اگر میں کہوں، شچ ماننا بھیا، بھگوان مالک ہے، جھوٹ نہیں بولوں گا... کہیں ایشی ہی ہماری شاری شرکار ہو جائے تو راج اتنا اچھا چلے کہ کیا کہا جائے!''

وہ صاحب بچے کو پھر پڑھانے لگے۔''دیکھو بیٹا، اب ایسی باتیں مت سیکھنا۔ بھلا کہیں کوئی راجہ بیٹا گندی باتیں سیکھتا ہے؟ مانو تو اب کبھی آئے گی نہیں، مگر اب ایسوں کے ساتھ کبھی نہ کھیلنا۔''

''ہاں بھیا، بری شنگت سے تو بھگوان بچائے۔ ماشٹر شاہیب، آپ ان کو یہاں بھیج دیا کیجیے۔ ہمارے بھی بچے ہیں، یہیں کھیلا کریں گے۔'' ہریش چند اپنے بیٹے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

ماسٹر صاحب کا لڑکا ہاتھوں کو جیب سے نکال کر پیچھے باندھتے ہوئے پھر تن کر بولا،''میں گندے لڑکے کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ اس کی پیٹھ ٹیڑھی ہے۔ میں مانو کے ساتھ کھیلوں گا۔'' وہ گھوم پڑا، چلنے کو ہوا۔ وہ صاحب ہاتھ پکڑ کر بولے،''نہیں خبردار! ادھر دیکھو۔ اب کبھی ایسی بات مت کرنا۔ میرا کہنا نہیں مانو گے؟''

''نہیں۔''

''جاؤ! تم خراب لڑکے ہو۔ اور پھر کھیلو گے کیسے؟ اب مانو تو کبھی آئے گی نہیں۔''

''آئے گی۔ بابو جی کہتے تھے۔''

''او، بابو جی تمھیں جھوٹ کہتے تھے۔''

''جھوٹ؟ نہیں! آئے گی۔''

''اونہوں! پوچھ لو بابو جی سے۔''

Scanned with CamScanner

''ہاں رے!'' وہ ڈپٹے۔ ''اب تو بڑا شریر ہوتا جارہا ہے۔ مگر جانتا ہے، اب ماتو کبھی آئے گی ہی نہیں۔ میں نے اسے محلے سے نکلوا دیا ہے اور اس کی حرّافہ ماں کو بھی۔ سمجھا؟ گدھا کہیں کا!''

لڑکا گھورتا رہا۔ پھر بولا، ''کیوں؟''

''سوّر کہیں کا! دو جھانپڑ دوں گا تجھے!'' ماسٹر صاحب نے زور سے ڈانٹا۔ لڑکا روہانسا ہو کر ایک طرف چل دیا۔ اس بیچ بنیا اکڑوں ہو کر ان کی باتیں سننے لگا تھا۔ سپاہی بالا سنگھ کو ہنس ہنس کر بتا رہا تھا کہ اس کی جورو اس سے کتنا پیار کرے گی۔

ماسٹر صاحب بولے، ''اب یہ بڑا ضدی ہوتا جارہا ہے۔ کسی دن اٹھا کر پٹک دوں گا۔ ایک آدھ ہاتھ پیر ٹوٹ جائے گا بس!''

ہریش چند نے موقع تاڑ کر ہمدردی جتائی۔ ''ارے ماشٹر شاہیب، بچے ہیں...''

وہ صاحب کہنے لگے، ''ارے ہاں، ابھی عمر ہی کتنی! مگر بھئی، بات تو یہ ہے کہ تاڑنا تو ابھی سے ضروری ہے۔ بھئی، ضد تو ہمیں بھی قطعی ناپسند ہے۔ ہم تو اسے ذرا بھی برداشت نہیں کرتے۔ ایک دن میرا بچہ ضد پکڑ گیا: مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلائیے۔ آخر کھا کر ہی مانا۔ میں نے اسے کافی ڈانٹا۔ کہا، تم کیا ابھی دو برس کے بچے ہی ہو؟''

اس پر بات چیت آج کل کی تعلیم پر چل پڑی۔ سپاہی نے اپنے تجربات سنائے... کیسے ایک بار اسکول جانے میں اسے دیر ہوگئی تھی تو مولوی صاحب نے اس کی ٹانگ پر ڈنڈا دے مارا تھا۔ اس کا نشان بھی کہیں ہوگا، اس نے کہا، پر کھوجنے پر وہ ملا نہیں۔ بے بات کی بات پر لوگوں کو ہنسی آئی۔ سپاہی اپنے کو بڑا حاضر جواب سمجھتا تھا، گو کہ اس کے مذاق پر اس لیے ہنسی آسکتی تھی کہ اسے مذاق کرنا یا تُرنت جواب دینا نہیں آتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے بتایا، ''وہ زمانہ ہی اور تھا۔ سنسکرتی سبھیتا ہی اور تھی۔ تبھی نا بھِشم جیسے برہمچاری اور بہادر بیٹے پیدا ہوتے تھے۔ اگر زمین پر لات ماردیں تو پانی نکل آئے۔'' اس بات کے امکان کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے زمین پر موٹر ٹائر والے جوتے کا پاؤں بھی پٹکا، گو کہ پانی نہیں نکل سکا۔ تب باتیں بہادری پر اتر آئیں۔ سردار نے فتح سنگھ زور آور سنگھ کے دیوار میں چنے جانے کا قصہ سنایا۔ بتانے لگا، ''جب دیوال چنتے چنتے چھوٹے کی گردن تک آگئی تو بڑا رونے لگا۔ چھوٹے بھائی نے پوچھا، کیوں روتے ہو؟ تو بڑا بھائی بولا، میں روتا ہوں کہ تم مجھ سے

پہلے شریر چھوڑے جاتے ہو۔ اس پر چھوٹا لڑکا بہادری کے ساتھ بولا، واہ! جو ریل گاڑی اسٹیشن پر بعد میں آتی ہے وہ پہلے چھوٹ جاتی ہے۔ میں بعد میں دنیا میں آیا ہوں اس لیے مجھے پہلے جانا چاہیے۔''
اس بات کی سب نے خوب داد دی۔ ہریش چند داد دیتے دیتے اکڑوں سے کھڑا ہو گیا۔ گو کہ کسی کے دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ گرو گو بند سنگھ کے زمانے میں ریل گاڑی کا تصور بھی نہیں تھا۔

ان صاحب کی مسواک ختم ہو رہی تھی۔ سپاہی کا ساتھی روٹیاں بنانے کے لیے گالیاں دے دے کر پکار رہا تھا۔ بالا سنگھ کی اماں بیلن لیے سڑک پر آ نکلی تھی۔ اس لیے سبھی لوگ چلنے لگے۔ چلتے چلتے ماسٹر صاحب کہنے لگے، ''مگر یہ ڈھونگی یہاں سے نکل گئے، چلو محلہ پاک ہوا! ارے، جب دیکھو ناچ ہو رہا ہے، گانا ہو رہا ہے، طبلہ ٹھنک رہا ہے، چائے اڑ رہی ہے! لوگ باگ چلے آ رہے ہیں، محفلیں جم رہی ہیں۔ کیا تماشا!''

''ارے صاحب، آپ سے کیا کہوں۔ نیند حرام کر رکھی تھی جی نیند! آپ پولیس کا سہارا نہ لیتے تو کیا بھاگتے! غنڈے کہیں کے، کلاکار بنے گھومتے تھے! ان کی چھوکری کو نا دیکھیے۔ اب آپ سے کیا کہوں، یہ مانو ہی پکی رنڈی نکلے گی۔۔۔ پکی رنڈی! اور نہ یقین ہو تو دیکھ لیجیے گا۔ اب آپ سے کیا کہوں، میری بات غلط نکلے تو مونچھ منڈا ڈالوں۔'' وہ صاحب اپنی کھچی چھاپ مونچھیں ٹٹولنے لگے۔

''ارے صاحب، اس میں بھی شک ہے!''

ماسٹر صاحب چلنے لگے تو دیکھا، بچہ نہیں تھا۔ سوچا، گھر چلا گیا ہوگا۔ راستے میں وہ اسی بنگالیوں والے خالی گھر کے سامنے سے نکلے تو دیکھا، اندر برآمدے میں بند دروازوں کے سہارے ان کا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ چونکے۔

''یہاں کیا کر رہا ہے رے۔۔۔؟'' وہ دروازے پر پیر پٹک کر چیخے۔ لڑکے نے ایک بار گھوم کر پیچھے دیکھا اور پھر دروازے پر سر رکھ کر سسکنے لگا۔ باپ نے اسے کندھے سے پکڑ لیا۔ ڈانٹ کر اسے ساتھ لے چلے۔ مگر وہ مچل گیا، ''نہیں جاؤں گا۔ میں نہیں جاؤں گا!'' وہ بولا اور زمین پر لوٹ گیا۔ ماسٹر صاحب کا غصہ بڑھ گیا۔ انھوں نے زور سے اسے بانہوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور باہر لے چلے۔ لڑکے نے لاتیں پھینکیں اور پھر بھی بس نہ چلا تو دانتوں سے کاٹا۔ ماسٹر صاحب نے اسے زمین پر ڈال دیا۔ پھر پیٹا۔ چیخے چلائے، مگر وہ نہیں اٹھا، نہیں گیا۔ غصے سے کانپتے ہوئے ماسٹر صاحب

نکلے۔ لڑکے کو اندر پڑا رہنے دیا اور بروٹھے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے پاؤں پٹکتے چلے گئے۔

لڑکا وہیں پڑا رہا۔ دھیرے دھیرے اس نے سر اٹھایا۔ بروٹھے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ بند دروازے پر اس نے تھاپ دی۔ ''مانو! دروازہ کھولو مانو!'' اندھیرا گھومنے لگا اور وہ بند تالے پر سر گڑا کر سسک اٹھا۔ اندھیرے میں مانو اور اس کی گڑیا ابھر آئیں۔ وہ اسے گھیر کر ناچ ناچ کر گانے لگیں: ''کہاں گنوائی ساری رین ہو!'' اس نے دروازے پر تھاپ دے کر پھر کہا، ''مانو! مانو!'' وہ ناچتی ہوئی چھایائیں اداس ہو کر بجھ گئیں جیسے مانو کی ماں کا گیت ''برہنی نول کشور!'' وہ سسکتا رہا۔

باہر بیرک میں روٹی پکاتا ہوا سپاہی قوالی کی طرز پر گا رہا تھا:

کیوں آگ لگائی جاتی ہے، کیوں درد بڑھایا جاتا ہے

بھئی ہم کو نسیلی آنکھوں سے، بیہوش بنایا جاتا ہے

بالا سنگھ سڑک کے نل سے پانی لانے چل دیا تھا۔ وہ بھی گا رہا تھا:

تیرے پچھے میں ہوئی آں تباہ، تاریاں توں پچھ چن وے!

اور ہریش چندا اپنے بچوں کو سکھا رہا تھا، ''بیٹا دیکھو، بڑی والی لیمن چوش کی گولیاں کشی کو پیشے کی دو سے جیادہ مت دینا۔'' اور چھوٹا لڑکا اس کی بات سننے سے زیادہ سوچ رہا تھا کہ اگر بڑے بھائی کی پیٹھ پر سواری گانٹھی جائے تو کیسا رہے۔

❁❁

مدرا راکھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

رس کہی

راجہ صاحب کی بگیا سے سپاہی نے جب ساڑھے بارہ کا گھنٹہ ٹھونکا تو پیڑے والی بوا کے لچے بیٹے شہزادے نے کچہری کے چپراسی کی طرح آواز لگائی، ''ڈھونڈھے کی اماں، ایک تو بج گیا۔''

سب کو معلوم تھا کہ بگیا کا سپاہی عام گھڑیوں سے آدھا گھنٹہ پیچھے رہتا ہے۔ ڈھونڈھے کی اماں نے اپنے پیارے کلیجے کے ٹکڑے ڈھونڈھے کی بہو کو ایک کام چلاؤ گالی سنائی اور دیوار کے کونے میں تھوڑی سی پیک تھوک دی۔ یہ تمنزلے سے نیچے اترنے کی تیاری تھی۔ اس کے سپوت ڈھونڈھے نے سانپ ستارہ اور مچھلی چپکا کر رپٹنے والی، میگنٹ کی ولایتی پھرکی کھلیتے میں ڈالی، کونے سے گھس گئے تاشوں کی گڈی سُتھنے کے نیفے میں اٹکائی اور ماں کو گھورتا ہوا اپنے پیٹ کے بیچوں بیچ اسی سُتھنے جیسی بے مطلب سی دِکھنے والی توندی کھجانے لگا۔ ماں بولی، ''دُلّن کے گھر جاتے ہو بیٹا؟''

اس نے معصومیت سے ہامی بھری۔ ماں نے ہدایت کی، ''کھیلنا مت، بھلا!''

''ہاں اماں، کتاب لیے جا رہا ہوں،'' اس نے کہا اور الماری سے جلد اکھڑی ہوئی قصہ طوطا مینا کی کتاب اتاری، بولا، ''عام کتاب لیے جا رہا ہوں اماں!''

ماں مطمئن ہو کر کُرتی میں بانہیں گھسیڑنے لگی۔

شہزادے کی آواز رُگی نے بھی سنی۔ وہ اس وقت اپنی دونوں چھوٹی بچیوں کو چاول چگا رہی تھی۔ وہ لمبی، جوان، چوڑی کمر اور بھینگی آنکھوں والی، کاہل قسم کی عورت تھی۔

Scanned with CamScanner

بوڑھی پیڑے والی نے اپنے ڈھیلے گندے کی طرف دیکھ کر پریشانی ظاہر کی کیونکہ اس کی تیاری میں ابھی دیر تھی۔ کندن کی پوپلی تائی نے دو تین بار جھک جھک کر کمر کی ہڈیاں چٹخائیں اور کھجور کی چٹائی کا بنڈل بغل میں دبا لیا۔ کچھی چند کی ٹھگنی لگائی نے پہلے ہی اپنی تیاری پوری کر لی تھی۔ پدّن کی اماں کا منسوا موزے والے کی دکان پر منیم تھا۔ صبح دس بجے کھانا کھا پی کر چلا جاتا تھا، اس لیے پدّن کی اماں عام طور سے ایک نیند سے لیا کرتی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وقت پر جاگ کر ناک کے اوپر کے مسّے میں اُگے ایک بال کو اکھاڑ کر پھینکنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ آواز سننے کے ساتھ ہی وہ تڑپ کر کھٹ سے باہر آئیں۔ رُگی، پیڑے والی، کندن کی تائی وغیرہ قانون ساز اسمبلی کے ارکان کی طرح آ کر جٹنے لگیں۔

لوگوں کے آنے جانے کے راستے والی سیلن بھری گلی میں کندن کی تائی کی چٹائی بچھتی تھی۔

پدّن کی ماں ہمیشہ کی طرح نچلے زینے کو بطور شاہی تخت استعمال کرتی ہوئی دیوار کی ٹیک لگا کر براجمان ہو گئیں۔ وہ بیٹھک کی صدر تھیں۔ کوئی ان کا مخالف نہیں تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اول تو یہ کہ ان کا خاوند منشی تھا جو ہمیشہ دھلا کرتا پہن کر منیم گری کرنے جاتا تھا۔ دوئم یہ کہ رتوندھی کے مرض کے باوجود انھیں محلے ٹولے کی اگی چھپی یوں زبانی یاد تھی گویا ضلعے پرگنے کا جغرافیہ ہو۔ سوئم یہ کہ کسی نئی پیدا شدہ بچی کو جموگا دھر پکڑے تو کہاں کنڈیل کے پھول اور سیندور کا تلک پہنچایا جائے، یہ انھی کو معلوم تھا۔

گھر والیوں کے بچے مکھیوں کی طرح چاروں طرف رینگ کر بھنبھنانے لگے، مگر ان کی ماؤں نے انھیں دھکیا کر، مکے مار کر اور کھونت کر پرے بھگا دیا۔ آج دو عدد راز بھری چرچائیں زیر غور تھیں — ایک تو ٹنگنو لال کی لڑکی کا چال چلن اور دوسرے سیو پرساد کی بٹیا کا بیاہ۔

جب لڑکے بچے جلسے سے پرے ہٹ گئے تو پدّن کی اماں نے اپنے ہاتھ کی چھوٹی سی پنکھیا نیچے ڈال دی اور بات کہی شروع کرنے کی غرض سے ذرا تن کر بیٹھ گئیں۔

رُگی کو پچھلے دنوں ایک چوری دھر پکڑی تھی پدن کی ماں نے، اور لوگوں کو بہ آواز بلند اس بات کی اطلاع بھی دے چکی تھیں کہ شوالے کے بہانے رُگی کمپنی باغ جاتی رہی ہے۔ اس اطلاع کے اُجاگر ہونے کے بعد سے رُگی میں ایک خاص تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ خود بھی زیادہ سے زیادہ چٹ پٹی خبروں کی جاسوسی میں تن من سے لگ گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

آج ان کے پاس بہتر مزیدار خبر تھی۔ پجاری ٹکنو لال کی لڑکی دراصل ماما کے گھر نہیں گئی تھی بلکہ بھاگ گئی تھی۔ یوں تو اڑتی چڑیا کے پر کاٹنے میں اپنے کو ماہر ماننے والی پدن کی ماں نے اس امکان کا اظہار کل ہی کر دیا تھا (بھلے ہی چڑیا پر کٹنے سے پہلے ہی اڑلی!) پر پکا ثبوت آج ملا۔ وہ ثبوت ملا رُگی کو، اس لیے رُگی آج ذرا غول کے بیچ بیٹھی تھی۔

پدن کی ماں کے اندازے اکثر صحیح ہوتے تھے۔ وہ مہینوں سے کہہ رہی تھیں کہ ٹکنو لال پجاری کی لڑکی کنیا اور بابو لال میں کچھ غلط کنکشن ہے۔ پھر ابھی جمعہ جمعہ سات، یا سمجھو آٹھ دن ہی ہوئے ہوں گے جب پچھی چند کی لگائی نے اپنی آنکھ سے مندر کے دو طلے کی کوٹھری میں دونوں کو بند ہوتے دیکھا تھا۔ پھر گھنٹے آدھ گھنٹے بعد بابو انگو چھا لپیٹتا، چھپت لاگھتا، اپنے گھر ہو رہا اور کنیا موئی فلمی گانا گاتی نیچے اتر گئی۔

''اے بہنا، ایسی اندھیر کہیں نہیں دیکھی!'' بمو مہاراجن نے کہا اور نخرے کے ساتھ منہ بناتے ہوئے خربوزے کے بیج چھیلنے لگی، چٹ پٹ۔

''اے لے، اس کی سن!'' پدن کی ماں نے فوراً زبان پکڑی۔ ''اے اتنی بات میں اندھیرا ہو گیا! چپ چاپ رہو بھوجی، یہ نہیں ہوا اندھیرا۔''

بمو مہاراجن کی پھونک نکل گئی۔ محفل کے شرکا نے کگیا کر ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوڑیں۔

بمو مہاراجن دراصل ذات کی سنارن تھیں اور ٹکھو مہاراج کے گھر آ بیٹھی تھیں۔ ٹکھو مہاراج کی اماں تو مہاراجن تھیں، پر بیوگی کے دنوں جو تیرتھ کر کے لوٹیں تو پیٹ میں ٹکھو کا لونڈا لیے۔ مہاراجن گھبرا کر دوا پر دوا کھانے لگیں، پر ٹکھو چگادڑ کی طرح پیٹ میں، ایسے چپکے نہ گرنے کا نام ہی نہیں لیا۔ بس ہوا اتنا کہ ٹکھو کی ایک آنکھ بالکل صاف ہو گئی اور دوسری میونسپلٹی کی بتی کی طرح چندھی ہو رہی۔ سو ٹکھو مہاراج نے گھر بٹھایا بمو سنارن کو، جو بعد میں بمو مہاراجن کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ٹکھو کی کمر کچھ دن تو پختہ رہی، پھر بائی نے دھر دبوچا۔ اس کے بعد بمو مہاراجن تو کہیں نہیں گئیں، ہاں ٹکھو کے ایک چچا زاد بھائی ضرور گھر آ بیٹھے۔ آئے دن ٹکھو اور بمو مہاراجن میں چخ چخ ہو جاتی۔

اُس دن تو حد ہی ہو گئی: جب پدن کی اماں نے اپنے روشندان تک میز کرسی لگا کر جھانکا، پدن کی اماں کی آنکھیں پھٹ گئیں وہاں کا منظر دیکھ کر۔ چار پائی پر لیٹے ٹکھو مہاراج گلا پھاڑ کر گالیاں بک

Scanned with CamScanner

رہے تھے اور بمو کے دیور جی بمو کی گود میں سر دیے لیٹے آرام سے کہہ رہے تھے، ''چپکے رہو بھوجی!''

پدّن کی ماں نے وہ سارا قصہ محفل میں پیش کیا تو بمو کے ہوش فاختہ ہو گئے۔ یہی بات تھی جسے کہہ کر آئے پھر پدن کی ماں نے بمو کا پتّا کاٹ دیا۔

کندن کی پوپلی تائی ذرا بھکتن قسم کی تھیں، سو ناحق ناک بھوں سکوڑ کر بولیں، ''ہرّے جائیے!'' بولنے والے کے سبجیکٹ کے خلاف اپنے ویٹو کا صحیح استعمال کرنے کے بعد تائی نے اپنی ناک گھمائی ہی تھی کہ ڈھونڈھے کی اماں نے بترس کے سر کے میں اپنی سُمِا ابیا تیرا دی۔ ''اے تائی، ابھی کیا! ابھی تو گنیا کے گُن سنو، گنیا کے!''

اتنا کہہ کر وہ کھی کھی ہنسی لیکن اس کی ہنسی میں کسی نے ساتھ نہیں دیا، اور پھر وہ ہنسی جو ایک عجیب آئیں بن کر گلے سے نکلی تو منہ پھیلا کا پھیلا ہی رہ گیا۔

گلیارے کے آخری چھور پر بنی کوٹھری کے دروازے پر نہ جانے کب رمّو بھوجین چپ چاپ آ بیٹھی تھی اور بتے بھر کے آئینے کو گھٹنوں میں ٹکا کر سینگ کی کنگھی سے بالوں کے پتے کھینچ رہی تھی۔

بمو مہاراجن نے پنکھیا اٹھا کر اس کی ڈنڈی سے پچھمی چند کی لگائی کو تین کھونچے مارے اور پھسپھسا کر کہا، ''اے بچی، یہ کب آ گئی؟''

ڈھونڈھے کی اماں نے یاد آنے پر غڑاپ سے اپنا منہ بند کیا اور گردن لمبی کر کے رمّو کو گھورنے لگیں۔ کندن کی تائی نے آنکھیں مچیائیں اور گلی کے چھور پر دیکھا۔ پھر مچیائیں، پھر دیکھا۔ پر دکھائی کچھ بھی نہ پڑا۔ جھلا کر کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ پیڑے والی نے گھٹنا ہلا کر انھیں روک دیا۔

ان کی اس اچانک چپّی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا رمّو پر۔

رمّو بھوجین بھی پہلے اس بیٹھک کی رکن تھی، رکن بھی ایسی کہ ہر کوئی ڈاہ کرے اور ہر کوئی حمایت کرے۔ ڈاہ اس لیے ہوئی کہ وہ سب سے زیادہ اچھی رسیلی کہانیاں سنا سکتی تھی۔ باقی ارکان کچھ تو عمر کی بڑھا بڑھی کی وجہ سے اور کچھ گھر گرہستی کے جنجال کی وجہ سے، عورت مرد کے تعلق کے رسیلے پہلو کی بجائے زچہ خانے کی تکلیفوں اور اُگلے چبائے چھنالوں کے غیر مطمئن تذکروں تک ہی محدود رہتی تھیں۔ ان میں بھی اگر پچھمی چند کی لگائی نے اگر بتایا کہ اس کے پہلوٹھی والے بچے کے وقت سارے دن الٹیاں ہوتی تھیں تو پیڑے والی نے ٹرمپ مارتے ہوئے کہا کہ یہ کون بڑی بات ہوئی،

Scanned with CamScanner

میری تو بچہ دانی ہی الٹ پلٹ جاتی تھی۔ اس طرح ہر ایک کے تجربات ایک دوسرے سے بیس ہی نکلتے، اور ظاہر تھا کہ ہر کوئی اپنے درد کو خفیف ثابت ہوا جان کر گڑھ جاتی۔ چھنالے کی چرچا اور بھی خطرناک تھی۔ اس میں یا تو جھوٹ اور سچ کی شہادت کے نام پر تو تو میں میں ہو جاتی یا پھر ایک دوسرے کی لگی لپیٹ کھولنے کی نوبت آتی۔ اور واک آؤٹ ہو جاتا۔

کچھ بھی ہو، ان کے چرچے اتنے رس بھرے نہیں تھے جتنے رمّو کے۔ وہ پچھلے چھ سال کے رومانی جیون میں نہ تو ماں ہی بنی تھی اور نہ ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ بھوجین صرف اس کے سرمئی رنگ کی وجہ سے کہا جاتا تھا ورنہ وہ ذات کی مالن تھی۔ سب سے مزے کی بات تو یہ ہے کہ بنا بیاہ ہوئے وہ مانگ میں سیندور تک بھر لیتی تھی۔

اس کی حمایت کرنے کو بھی بیتاب رہتی تھیں، پر اندر اندر ایک حسد محسوس کرتی تھیں۔ رمّو منھ پھٹ بھی خاصی تھی اور چٹورن بھی۔ منھ پھٹ تھی، اس۔ لیے اپنے اوپر باتوں کا داؤ نہیں چلنے دیتی تھی اور خود چٹوری ہونے کے باوجود دوسروں کو کھلانے میں خاصی فراخدل تھی۔ ڈھونڈھے کی اماں کو تو اس نے ایک دن گن کر۔ پورے سولہ گول گپے کھلا دیے۔ یہ بات دوسری ہے کہ دوسرے دن برف کی لسی پینے کے بعد بھی انھیں شک ہوتا رہا کہ کہیں انھیں بواسیر نہ ہو جائے۔

ادھر رمّو پچھلے کوئی دو مہینوں سے غائب تھی۔ جس دن وہ غائب ہوئی اس سے پہلی رات محلے میں رتّو بنّو کا رات بھر کے لیے ناچ ہوا تھا۔ پیپل کے پیڑ کے نیچے دری بچھا کر محلے کے نٹھلوؤں سے لے کر استادوں تک کے ہجوم تک کی واہ واہی لوٹتی ہوئی رتّو بنّو کی کشش گھر والیوں کے بیچ بھی کم نہیں تھی۔ رتّو ذرا موٹی اور ٹھگنی تھی، بنّو لمبی اور دبلی۔ گلا دونوں کا سُریلا تھا، لیکن اداؤں میں بنّو کافی آگے تھی۔

ناچ گانے سے بہویں بگڑ نہ جائیں، اس لیے زیادہ تر بوڑھیوں نے بہوؤں کو دھمکا کر اندر کر دیا اور خود رات بھر جاگرن کیا۔ ڈھونڈھے کی اماں نے آٹے چاول کے ٹین رکھ کر منڈیر سے ساری رات ناچ دیکھا۔ بدّن کی اماں نے اٹاری پر چارپائی ٹکا کر چڑھنے کی کوشش کی تو چارپائی چرمرا گئی اور وہ بھد بھدا کر نیچے آ رہیں۔

دو چار بار ''اوئی اماں'' اور ''ہائے اوئی'' کرنے کے بعد انھوں نے اپنی کمر تھامے تھامے سِدّا لگائی اور کانکھ کانکھ کر ساری رات پھسک پھسک ہنستی رہیں۔

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر بعد رمّو بھوجین بھی پدّن کی اماں کے پاس آدھمکی۔ عمر میں فرق ہوتے ہوئے بھی من کی ہمجولی کا ہی اثر کہیے کہ بھور تک ان دونوں 'ست بھتریوں' (سات شوہروں والیاں) کو دادو یتی رہیں۔ صبح تڑکے سیڑھی سے ہڑبڑاتا ہوا بدحواس پدّن اوپر آیا۔

اس کی آہٹ سے پدّن کی اماں کھسیا کر چونکی۔ لیکن پدّن نے کھسیاہٹ کی طرف دھیان دیے بنا لپک کر ان کے دونوں کندھے پکڑے اور جھنجھوڑ کر بولا، ''اماں، اماں!''

''ارے بھیا کیا رے؟'' اماں نے جھلا کر پوچھا۔

''اماں، وہ... وہ کہاں ہے؟''

''ارے کون رے؟''

''ک... ک... کلاوتی نہیں ہے!''

''اے کیا بات ہے رے؟'' پدّن کی اماں ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئیں۔ ''اے ہو گی کہیں۔''

''نہیں ہے گی اماں، کہیں نہیں ہے گی! سب جگاں دیکھ لیا میں نے۔''

پدّن کی اماں کا کلیجہ ڈرے ہوئے چوہے کی طرح ان کی پسلیوں میں ٹھپا ٹھپ ٹکریں مارنے لگا۔ انھوں نے زور سے پدّن کو جھٹکا دیا۔ ''ہائے رام، تو چلاتا کاہے ہے؟ اے ہو گی کہیں!''

رمّو ان مکالموں میں کسی راز کی بو پا کر غور سے سن رہی تھی۔ پدّن کی اماں کی نظر رمّو پر پڑی تو وہ زیادہ گھبرائیں۔ انھوں نے بات وہیں ختم کی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئیں۔

رمّو نے اندازہ لگا لیا کہ کیا بات ہو سکتی ہے۔ پدّن کی اماں سے بھی چھپا نہ رہا کہ رمّو کو راز معلوم ہو گیا۔ اسی دن کا انھیں ڈر تھا۔ لیکن ہونی شاید ہو کر ہی رہی۔

جب سے پدّن کی بہو گونے میں آئی، اسے تین بار کوٹھری میں بند کیا جا چکا تھا، چار بار رفاتے کرائے گئے تھے اور پانچ چھ بار ڈھنائی کی جا چکی تھی۔ لیکن ہونی پر کس کا بس چلتا ہے۔

پدّن کی اماں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا، یہاں تک کہ مٹکوں اور بالٹیوں تک میں جھانک ڈالا، لیکن بہو کا پتا نہیں چلا۔ لاچار ہو کر اماں سے پہلے خود پدّن نے ہی سر تھام کر بھوں بھوں رونا شروع کر دیا۔

پیڑے والی اس وقت کلّی کرتی ہوئی یہ سوچ رہی تھی، کیوں نہ وہ اساڑھی کے میلے میں کھوئے

کی جگہ کاغذ کی لگدی ڈال کر برفی جما لے۔ اچانک بھوں بھوں کی آواز سنی تو منھ اونچا کر کے آواز دی،
''اری او پدّن کی ماں! جے کون رونے لگا؟''

پدّن کی اماں گھبرا گئیں پھر بھی انھوں نے بات بنالی، بولیں، '' کچھ نہیں جیا، یہ پدّن سوتے سوتے بڑبڑانے لگا۔'' لیکن پھر بھی انھوں نے سوچا کہ یہ خطرناک وقت ہے، کہیں کوئی آہٹ لیتا یا پوچھتا ہوا اوپر ہی نہ آ دھمکے، اس لیے وہ خود ہی دروازہ کھول کر باہر آ گئیں۔ لیکن باہر نکلتے ہی ان کا جی دھک سے ہو گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے دروازے سے اچانک مڑ کر رمّو تیزی سے زینے کی طرف جا رہی ہے۔ رمّو کی اس جاسوسی پر بے بسی کے دانت پیستی ہوئی وہ چھجے کے سہارے ٹک گئیں۔ ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو لڑھکنے لگے۔

سویرے سویرے پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ پدّن کو اپنی خالہ کے گھر بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ دروازہ بند کر کے کمرے میں پڑ رہیں۔ کسی نے پوچھا تو اندر سے ہی ''آہ، اوہ'' کر کے بولیں کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ دوپہر ہوتے ہوتے پچھی چند کی لگائی اور رگّی میں جانے کیا مسکوٹ ہوئی کہ وہ پدّن کی اماں کی بیماری کا حال چال لینے آ دھمکیں۔ رگّی کی چکر مکر ہوتی آنکھیں دیکھ کر پدّن کی اماں کی آنکھیں سلگ گئیں۔ رہی سہی کسر پوری کر دی پچھی چند کی لگائی نے۔ اس نے پوچھا، ''اے بہنا، بھور یا سویرے سے نہیں دکھی!''

''اے لو، بتایا تو کتنی بار کہ رات میں تار آیا تھا۔ اس کی اماں بیمار ہے، سو دیکھنے گئی ہے گی۔ اور کیا پر پنچ بگھار رہو اس میں تم لوگ!'' پدّن کی اماں نے بڑے تیکھے پن سے سچائی کا پردہ اٹکا کر منھ موڑ لیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں نیچے اتر گئیں۔ پدّن کی اماں نے پہلے تو گن کر دس بارہ گالیاں نکالیں اور پھر منھ ڈھک کر پڑ رہیں۔ بیمار وہ سچ مچ دکھنے لگی تھیں، اس لیے اکیلیں الجھن بن کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔

دوپہر چڑھتے ہی جیسے پدّن کی اماں کو بخار سا چڑھ آیا۔ انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ آج کی بیٹھک میں ان کی غیر حاضری اور رمّو کی جاسوسی سے جو گل کھلے گا وہ انھیں کہیں کا نہیں رکھے گا۔

لیٹے لیٹے کئی بار ان کے جی میں آئی کہ اٹھ کر وہ رمّو سے ملیں، اسے پٹانے کی کوشش کریں۔ لیکن ان سے اٹھا نہیں گیا۔ انھیں لگا جیسے ان کا خون دھیرے دھیرے سوکھتا جا رہا ہے۔ پیاس گلے میں کانٹے چبھونے لگی۔ خواہش ہوئی کہ کسی سے پانی کے لیے کہیں، پر اس کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر

Scanned with CamScanner

نہ جانے کب وہ سو گئیں۔

جب ان کی نیند کھلی تو انھوں نے دیکھا کہ کندن کی پوپلی تائی ان پر جھکی انھیں پکار رہی ہیں۔ پدن کی اماں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ کمرے کے اجالے سے انھیں لگا کہ شام ہونے والی ہے۔ تائی کو دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئی تھیں۔ لیکن تائی صرف حال چال لے کر ہی نیچے اتر گئیں۔ معلوم ہوا کہ دوپہر کو آج بیٹھک ہی نہیں ہوئی۔ اس بات سے انھیں بے حد اطمینان ہوا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ سکون ہوا ایک اور خبر سے۔ رمّو صبح سے غائب تھی۔

رمّو ببن پان والے کے ساتھ بھاگ گئی — جس وقت پدن کی اماں نے یہ فقرہ گھڑا اس وقت انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے ہاتھ میں ہنومان کی گدا آ گئی ہو، جس سے وہ کسی بھی پر پنچ کا سر توڑ دیں گی۔ ان کے چہرے کا پیلا پن غائب ہو گیا۔ کمر تن گئی۔ بھاری بھرکم کولھے سکیل کر وہ دوسرے دن پھر اسی زینے والے شاہی تخت پر آ براجیں۔

اس دن کی بیٹھک کا نام چھمی چند کی لگائی نے دیا تھا — ''سلیما والی بیٹھک۔'' خوب مزے لے لے کر پدن کی اماں نے بتایا کہ رتّو بتّو کے ناچ کے وقت رمّو اور ببن کے کیا کیا گل کھل رہے تھے۔ رُگی نے ایک ایک باریکی پر روشنی ڈالنے کی گزارش کی اور ایک دوسرے کو کھیا کر لگائیوں نے برتن میں گلاب جامن کی طرح ڈبکیاں لگائیں۔ پدن کی اماں رائے عامہ کو بہو کے واقعے کے طرف سے رمّو کی طرف موڑ کر اطمینان سے بیڑے چباتی رہیں۔

لیکن ابھی دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ببن پان والا باقاعدہ فلمی گانا گاتا ہوا اپنی دکان پر آ دھمکا۔ وہ پدن کا جگری دوست تھا۔ دراصل پدن کی بیوی کے گول مال کا نائک وہی تھا۔ پدن کی اماں نے بیسیوں بار بیٹے کو اس کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ خود ببن کو بھی بالواسطہ گالیوں کا تحفہ بھجوا چکی تھیں۔ لیکن پدن کی مجبوری یہ تھی کہ وہ افیم کھاتا تھا اور ببن افیم کے نشے کی ندیا پار کرانے والا واحد مانجھی۔

نتیجہ سامنے تھا۔ ناچ کے دن اس نے پدن کو ایک ڈبل خوراک نگلوا دی اور اس کے بعد اس کی گوری گوری، گول گول بیوی کو لے کر چمپت ہو گیا۔

اسی بیچ پدن کی اماں نے پہلے تو بیٹھک کی ارکان کو طرح طرح کی اطلاعوں میں الجھائے رکھا اور پھر ایک دن بہو کے بیمار پڑ جانے کی خبر دے ڈالی۔ اس بیچ منشی جی پہلے سے بھی زیادہ صبح چلے

جاتے اور دیر سے لوٹتے۔ آخر کار ایک صبح اچانک پدّن کی اماں نے ٹسوے بہا کر لوگوں کو بتایا کہ بہو بیچاری جاتی رہی۔

لیکن اس ماتم کو ایک ہفتہ بھی نہیں بیتا کہ بتّن آ ٹپکا۔ سب سے پہلے پچھاڑ کھائی پدّن نے۔ اسے یہ بخوبی معلوم تھا کہ اس کی بیوی کس کے ساتھ گئی ہے، پر وہ اس خیال میں تھا کہ بتّن کے ساتھ بیوی بھی لوٹے گی ہی۔ بتّن اکیلا لوٹا تو اس نے سر پیٹ لیا۔

مگر اماں کو ایک اور فکر ستانے لگی۔ غنڈا تو غنڈا۔ محلے کے چھوکروں سے بہو کی چرچا ضرور کرے گا۔ چھوکرے بات پھیلائیں گے۔ اس لیے احتیاطی تدبیر کے طور پر انھوں نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا — بچارن کی بٹیا کا۔ یہ سچ تھا کہ کم سے کم کچھ دن لگائیوں کا دھیان بٹائے رکھنے کے لیے یہ قصہ کافی تھا۔ تب کچھ اور سوچا جاتا۔

پر اب یہ آ ٹپکی رمّو۔ باپ رے باپ! پدّن کی اماں کو لگا جیسے انھیں کسی نے سر کے بل الٹ کر کھڑا کر دیا ہو۔

رمّو کی طرف منھ پھیلائے تاکتی لگائیوں کو جب ہوش آیا تو وہ پھر پدّن کی اماں کی طرف مخاطب ہوئیں۔ لیکن کرسی ایک دم خالی تھی۔ پتا ہی نہیں چلا کہ اماں کب سرک لیں۔ ایک دوسرے کو سنکیاتی، کونچتی لگائیاں کچھ دیر تو بیٹھی رہیں کہ شاید اماں لوٹیں، لیکن جب وہ نہیں لوٹیں تو بیٹھک کی ارکان کا ہجوم ان کے کمرے کی طرف خبر لینے چلا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر سے پدّن کے اماں کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ رگّی نے دھیرے سے دروازہ تھپتھپایا۔ تھوڑی دیر بعد کراہتے ہوئے پدّن کی اماں نے اندر سے کہا کہ ان کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔

❁❁

مدرا را کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

آسیب

وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آخران کا مکان گیا کہاں؟ سمو چا مکان یکایک غائب۔ ہوسکتا تھا؟ کیا ایسا بھی ممکن تھا کہ سب کچھ وہاں ہو، بس ان کا مکان ہی کہیں غائب ہو گیا ہو؟ گلی، گلی کے چبوترے، مزار، پیپل کا درخت، بدبو پھیلاتی ہوئی موریاں، گلی میں کھلتے کچے پاخانے، گھروں سے پھینکا گیا کوڑا —سب کچھ تو تھا۔ گلی کے باہر جا کر تراہے سے وہ گلی میں پھر داخل ہوے۔ پھر وہی الجھن۔ اس بار وہ بڑی احتیاط سے ہر چیز کو پہچانتے گئے تھے، پر نہیں دِکھا تو ان کا اپنا مکان۔ جسے ٹھیک ٹھیک بھرا پُرا کہا جا سکتا ہے، ایسا مکان تھا۔ بیوی، بچے، ایک چھوٹے متوسط گھرانے کا سامان۔ کیا ایسا سچ مچ ممکن ہوسکتا تھا کہ باقی سب کچھ وہاں موجود ہو اور ان کا مکان ندارد ہو جائے، بیوی بچوں سمیت؟

کیا انھیں ہی کوئی دھوکا ہوا تھا یا وہ کسی غلط گلی میں آ گئے؟ کیا ان کی گلی کوئی دوسری ہے؟ کہیں اور ہے؟ دھیرے دھیرے وہ گلی سے باہر آئے۔ گلی میں جس طرف سے وہ داخل ہوے تھے اُدھر ایک تراہا تھا اور اس تراہے سے ہٹ کر پانچ گلیوں کا ایک چھوٹا سا چوک تھا۔ وہ تراہے تک ہی نہیں، پانچ گلیوں کے اس تنگ سے چوک تک واپس آ گئے۔ یہاں بیچوں بیچ جھنڈے کے لیے لوہے کی چھڑ گڑی تھی۔ اسے انھوں نے غور سے دیکھا۔ اس پر پندرہ اگست اور چھبیس جنوری کو پرچم لہرایا جاتا تھا۔ چوک کے ایک کونے پر بہت پرانا نیم کا درخت تھا اور درخت کے تنے سے سٹا چھوٹا سا ایک مندر۔ اسے بھی انھوں نے پہچانا۔ اس مندر کو وہ پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اسے

Scanned with CamScanner

توڑ ہی دیتے۔ ان کا تعلق آریہ سماج سے تھا اور وہ بت پرستی کے سخت مخالف تھے۔ انھیں ایک مرتبہ اس بات پر غصہ بھی آیا تھا کہ آریہ سماج کے چیئرمین لالہ دیو کی نندن اس مندر میں ہونے والی بھگوتی جاگرن کی شوبھا بڑھا رہے تھے۔

اس مندر کے پاس انھوں نے دھیرج سے اندازہ لگایا کہ ان کے مکان کو کون سا راستہ جاتا ہے۔ ویسے تو سب راستے ایک سے ہی تھے۔ کبھی جگہ جگہ سے کھدائی کی وجہ سے اوبڑ کھابڑ ہو گئے تھے۔ کبھی راستوں پر لوگوں نے اپنے چبوترے آگے کھسکا لیے تھے۔ کبھی پر راستہ گھیر کر سودا لگانے والے ٹھیلوں، چارپائیوں اور اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ انھی اینٹوں کے ڈھیر سے کبھی کبھی چپ چاپ کوئی چبوترا اور چوڑا ہو جاتا تھا اور نشے کی حالت میں جھگڑتے ہوئے لوگ انھی اینٹوں سے ایک دوسرے کو زخمی بھی کر دیتے تھے۔

اس بار وہ کوئی بھول نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر عمر ہو گئی ہے۔ عمر بڑھنے پر تھوڑا بہت حافظے کی کمزوری کا مسئلہ ہوتا ہی ہے۔ پر اتنا تو نہیں ہو سکتا۔ اور اسے حافظے کی کمزوری بھی کیوں کہا جائے؟ کتنی ہی باتیں وہ اس درمیان سوچتے رہے تھے۔ انھیں تمبا کو خریدنا تھا، روہ اس دکان پر جا کھڑے ہوئے تھے جہاں سے بالوں میں لگانے والا تیل خریدتے رہے ہیں۔ تمبا کو خریدتے خریدتے انھوں نے سوچا، وہ کچھ بادام ضرور خرید لیں گے۔ پیسے لائے ہوتے تو خرید بھی لیتے۔ چار پانچ بادام کھانے سے دماغ میں طاقت آتی ہے، انھوں نے سوچا تھا۔ خیر، ادھر دھیان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ فی الحال گھر کا راستہ نہ بھٹک جائیں، یہی زیادہ ضروری ہے۔ ادھر اُدھر سے دھیان ہٹا کر انھوں نے اپنی گلی کی جانی پہچانی نشانیوں پر مرکوز رکھنا چاہا۔

جلدی ہی ان کی الجھن بڑھ گئی۔ گلی کی پہچان والی نشانیوں کی جگہ ان کے دماغ میں ایک سنگیت گونج رہا تھا، اور سنگیت بھی وہ جس سے وہ نفرت کرتے تھے، بھگوتی جاگرن کا کرخت سنگیت۔ اس چھوٹے سے چوک کے ننھے سے مندر کو دیکھ کر انھیں وہ یاد آیا تھا اور ان کے بھیجے کے اندر بجے جا رہا تھا، گھڑیال، جھانجھ، کھڑتال، ڈھولک، ہارمونیم کے ساتھ۔ انھوں نے بے دلی سے سر جھٹکا، جیسے ماتھے پر بیٹھ رہی کسی ضدی مکھی کو اڑا رہے ہوں۔ پر وہی گانا ایک لمحے کے لیے ان سے الگ ہو کر پھر جیسے ان کے سر سے آ چپکا۔ اس سنگیت کا شور بہت زیادہ تھا، اتنا زیادہ کہ باقی کسی چیز کی جگہ وہ ان کے

Scanned with CamScanner

دماغ میں نہیں چھوڑ رہا تھا۔ کوئی تصویر بھی وہاں تک نہیں پا رہی تھی۔ اس شور کے چلتے سڑک کو پہچاننے میں دماغ کیسے لگے آخر؟ اس بار، اس بار تو گھر پہنچنا ہی ہے۔ وہ اپنا گھر کھوج نہیں پا رہے، یہ بات ابھی تک کسی اور کو پتا نہیں تھی۔ انھوں نے آس پاس دیکھا۔ ہلو سبزی والا اپنے ٹھیلے پر رکھی سبزی نالی کے پاس لگے ہینڈ پمپ سے بھگو رہا تھا۔ اس سے وہ خوش نہیں تھے۔ وہ ہر سبزی کا دام زیادہ بولتا تھا اور انھیں لگتا تھا کہ وہ صرف انھی سے زیادہ دام بولتا ہے۔ شاید ان سے چڑتا ہے۔ پر وہ انھیں باقاعدہ نمستے بھی کرتا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی اس نے نمستے کیا اور سبزی پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ اسے مسکرا کر جواب دینے کے بعد وہ آگے بڑھ آئے۔ بہت زور زور سے فلمی گانے بجاتا ہوا مدی تمبوقنات کا سامان سنبھال رہا تھا۔ اس سے ان کا کئی بار جھگڑا ہو چکا تھا۔ آریہ سماج کی تقریبوں کے لیے تمبوقنات وہی لگاتا تھا اور ہر بار کوئی نہ کوئی گھٹیاپن کرتا رہتا تھا۔ چاٹ والا پنالال بھی دکھائی دیا۔ اس کے ایک کمرے کے مکان میں اس کے نہانے دھونے کی جگہ بھی تھی، کھانا بنانے کی بھی اور سات بچوں سمیت پریوار کے سارے سوتے بھی وہیں تھے۔ اپنی چاٹ کا سامان وہ چھت پر بناتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے ٹھیلے سے دیگچیاں اور مسالے اتار رہا تھا۔

انھیں لگا کہ ان کے دماغ میں گھومتا سنگیت غائب ہو گیا ہے۔ انھیں خاصا اطمینان ہوا۔ اب وہ یہ بھول جانا چاہتے تھے کہ وہ اپنا مکان بھول گئے ہیں اور پھر سے کھوجنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید اس طرح سہج ہو جانے پر وہ حادثہ پھر نہ ہو۔ وہ اب اطمینان سے آگے بڑھے۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ اس بار اپنے آپ ان کے قدم اپنے گھر کے سامنے ہی پہنچ کر رکیں گے۔

اب انھیں اپنے آپ پر تھوڑی ہنسی آئی۔ غنیمت ہے کہ انھوں نے گھبراہٹ میں کسی سے کہا نہیں کہ وہ اپنا گھر بھول گئے ہیں۔

پچھلے کچھ عرصے سے ان کے ساتھ کچھ گڑبڑیاں ہونے لگی تھیں، پر وہ ان کا سامنا ہمت سے کر رہے تھے۔ انھوں نے ایک بار غور کیا کہ گھر میں جہاں وہ پیشاب کرتے تھے وہاں چیونٹے لگنے لگے ہیں۔ انھوں نے حکمت اور ویدک کی بہت سی پرانی کتابیں اکٹھی کر رکھی تھیں۔ کئی روز انھیں الٹنے پلٹنے کے بعد معلوم ہوا، یہ ذیابیطس کی بیماری کی نشانی ہے۔ اب انھوں نے اس کا علاج شروع کیا۔ وہ ڈھولک اور ہارمونیم بہت اچھا بجاتے تھے۔ دونوں باجے بہت اچھی حالت میں رکھتے تھے۔ پر

ذیابیطس کے لیے انھوں نے اپنے اس طبلے کا دایاں کھول ڈالا جسے انھوں نے کچھ دن پہلے ہی خریدا تھا۔ چمڑے کی ڈوری اور منڈھی ہوئی کھال کے ساتھ طبلہ ملانے والے لکڑی کے گٹے ایک تھیلے میں باندھ کر حفاظت سے رکھ لیے تھے۔ طبلے میں وہ رات کو پانی بھر لیتے تھے۔ وہی پانی وہ دوسرے دن پیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ جامن کے پیڑ کی چھال لے آتے تھے۔ اسے وہ چندن کی طرح ہر صبح پیستے تھے اور پی لیتے تھے۔ یہ سب وہ کرتے رہے اور کسی کسی دن پیشاب میں چیونٹے لگتے نہ دکھائی دیتے تو وہ خوش بھی ہوتے تھے۔ پر دو چار روز بعد چیونٹے پھر لگنے لگتے۔ ایک دن راستے میں انھیں چکر آ گیا۔ سب کچھ بہت تیزی سے گھوما اور وہ بری طرح لڑکھڑائے، پھر ایک کھمبے کا سہارا لے کر پاس کی دکان کے چبوترے پر بیٹھ گئے۔ دکاندار نے انھیں ایک گلاس پانی پلایا۔ سنبھل کر وہ گھر لوٹے اور اپنی کتابیں پھر کھول لیں۔ کتابوں میں دیکھ کر کئی دن تک پالک کا رس پیتے رہے اور دوبارہ چکر نہیں آیا تو خوش ہوئے تھے۔ طبلے کو دوا میں بدل لینے کے بعد وہ اب ڈھولک پر زیادہ انحصار کرتے تھے۔

وہ پیشہ ور بجانے والے نہیں تھے۔ گاؤں میں ہی انھوں نے نھکو کہار سے ڈھولک سیکھ لی تھی۔ بعد میں انھیں شہر کے کباڑی بازار میں ایک پرانا ہارمونیم مل گیا تھا جسے وہ سائیکل کے پیچھے باندھ کر لے آئے تھے۔ اس کو بجانے کی بھی اچھی مشق ہو گئی۔ ان کے آس پاس کے لوگ کہتے تھے کہ ان کے ہاتھوں میں نائی ہو کر بھی سنگیت کے استادوں کا فن ہے۔ انھیں لگتا تھا، وہ جلدی ہی سچ مچ استاد ہو جائیں گے اور استاد ہو جانے کے بعد ان کے وجود میں گھسا ہوا ایک آسیب انھیں آزاد کر دے گا۔ یہ ایک ایسا آسیب تھا جو نسلی ورثے کی طرح انھیں اپنے پتا سے ملا تھا۔ کبھی کبھی کوئی ابھاگا ایسا بھی پیدا ہو جاتا ہے جسے اپنے والدین سے ناک، کان، منھ، آنکھ، رنگ روپ کے ہی نہیں، کسی اور چیز کے ان چاہے جراثیم بھی مل جاتے ہیں، جیسے کسی روگ کے۔ لگ بھگ ویسا ہی ورثہ انھیں بھی ملا تھا — نائی ہونے کا ورثہ۔ جب تک وہ چھوٹے تھے، اس ورثے پر ان کا سیدھا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ ساتھ کھیلنے والے بچے کبھی کبھی مذاق میں اپنی ہتھیلی پر انگلی سے استرا تیز کرنے کی اداکاری کرتے تھے اور وہ بہت جلدی سمجھ جاتے تھے کہ ان کا اشارہ کیا ہوتا ہے۔ تب تک وہ نائی کے بچے بھر ہی تھے۔ پر وہ جلدی ہی بڑے ہو گئے تھے، دوسرے بچوں کے مقابلے میں ان سے پہلے، ان سے کم عمر میں ہی۔ پتا بیمار

Scanned with CamScanner

تھے اور چودہ برس کی عمر میں ہی انھیں پنڈت رادھے شیام کے ساتھ شہر جانا پڑا تھا، ایک شادی کے سلسلے میں۔ نائی کیا ہوتا ہے، اسے کیا کرنا ہوتا ہے، اسے کیسے اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے، یہ سب وہ ایک دن میں سیکھ گئے تھے۔

غنیمت ہے، پتا جلدی ٹھیک ہو گئے اور گلے میں آپڑا طوق انھوں نے پھر پتا کو ہی سونپ دیا تھا۔ پتا بھی اس بات سے ناخوش نہیں تھے، بلکہ انھیں یہ اچھا ہی لگتا تھا کہ آس پاس کے گاؤوں میں بھی ان کا بیٹا ڈھولک یا گاہے بہ گاہے ہارمونیم بجاتا تھا اور اچھا ہی بجاتا تھا۔ اس کا گلا بھی برا نہیں تھا، اس لیے وہ کبھی کبھی گاتا بھی تھا — کوئو نوالبیلے کی نار جھما جھم پانی بھرے...

ان کی شادی ہوئی تو ان کے پتا انھیں بہو کے ساتھ کامیشور پنڈت کی حویلی لے گئے۔ کامیشور پنڈت برہمن تھے، پر کسی لٹھیت ٹھاکر کی ادا سے رہتے تھے۔ کھیتی تو تھی ہی، قصبے میں دال مِل بھی لگا رکھی تھی۔ وہ انھیں دیکھ کر زور سے ہنسے۔ اپنا آشیرواد دیا، پھر بولے، ''بھئی جب آئے ہو تو کچھ ہو جائے۔ وہ کیا گاتے ہو، جھما جھم پانی بھرے۔''

فرمائش ہوتے ہی پتا دوڑ کر ان کا باجا لے آئے۔ گانا سن کر کامیشور پنڈت نے گانے کی تعریف کی اور ایک بار پھر آشیرواد دیا۔ پھر پتا سے بولے، ''اب تو بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ تمھارا بوجھ ہلکا کرنا چاہیے۔ کیوں بھئی، ایسا کرو، اس کو لے کر کل ہماری دال مل پر آجاؤ۔ مل کے سامنے سڑک کے کنارے ہماری کافی زمین ہے۔ کئی لوگ دکانیں کھولے ہوے ہیں۔ تھوڑی سی جگہ یہ بھی لے لے، وہاں ایک سیلون کھول لے۔ حجامت کی دکان وہاں ہے نہیں، خوب چلے گی۔ کل آجانا۔''

وہ پتا کے پیچھے پیچھے گھر لوٹے۔ پتا بے حد خوش تھے، پر انھیں لگا تھا جیسے یہ ایک سازش ہے، ایک بہتر کام سے دور رکھ کر انھیں استرے کے ساتھ باندھ دینے کی۔

ان کی دکان کامیشور پنڈت کی دال مل کے پاس خاصی ٹھیک چلی۔ دکان سے انھوں نے سمجھوتہ کر لیا تھا، پر دکان کے ماتھے پر لگا نام پٹا (سائن بورڈ) انھیں کھلتا تھا — ہیئر کٹنگ سیلون، ماسٹر نندلال نائی۔ نام پٹا بھی چونکہ کامیشور پنڈت نے ہی بنوا دیا تھا، اس لیے وہ اسے اتار نہیں سکتے تھے، پر نائی ہونے کا ایسا اعلان انھیں تکلیف دیتا تھا۔ ان کے پتا نے ان کا یہ سیلون دیکھا تو بہت خوش ہوے تھے۔ ان کے خاندان میں پہلی بار کسی کی ایسی دکان کھلی تھی۔ اس خوشی نے نندلال کو اور زیادہ

Scanned with CamScanner

اداس کر دیا تھا۔ وہ سنگیت کے گیانی یعنی گائک یا ساز بجانے والے ہو جاتے، اس کا کوئی خاص تصور انھوں نے نہیں کیا تھا، پر جتنی دیر وہ بجاتے یا گاتے تھے، استرے کی دھار ان کی گردن سے دور ہٹ جاتی تھی۔ یہ استرا عجیب چیز تھا۔ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے آدمی کی حجامت بناتا تھا، پر حجامت بنانے سے پہلے بڑی صفائی سے ان کی اپنی گردن کاٹ کر ان کی اپنی خودداری کو برش، کنگھی، پانی کی پچکاری اور قینچی کے بیچ رکھ دیتا تھا۔ ہر شام انھیں اپنے دھڑ سے الگ ہو گئی خودداری کو دوبارہ اپنے کندھے پر لگانا پڑتا تھا اور تب وہ پاگلوں کی طرح دیر تک ڈھولک بجاتے تھے۔

ایک دن وہ اپنی دکان سے گھر لوٹے تو دہشت سے بھر گئے۔ اب تک ان کے تین بچے ہو چکے تھے۔ بیچ والی بچی کو بٹھا کر ان کے بڑے بچے نے گلے میں پھٹا سا کپڑا لپیٹ دیا تھا اور کہیں سے آئس کریم کی چپٹی سی لکڑی کی پٹی اٹھا لایا تھا۔ اسے اس نے استرا بنا لیا تھا اور حجامت بنانے کا کھیل کھیل رہا تھا۔

''ابے حجامت ہی بنانی ہے تم سب کو بھی سالو!'' وہ چیخے تھے اور انھوں نے بچوں کو پیٹا تھا۔ بیوی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس غصے کا مطلب کیا تھا۔ آخر اور کریں گے کیا؟ کیا وہ دال مل بھی کھول سکتے ہیں؟

وہ دہشت ان پر کئی دن سوار رہی تھی۔ آخر ایک دن انھیں موقع مل ہی گیا۔ وہ قصبہ چھوڑ کر وہ شہر آ گئے۔ شہر میں انھیں ایک چھوٹی سی جگہ رہنے کو مل گئی۔ اب وہ اپنا پچھلا سب کچھ چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

موقع انھیں خود بخود ہی ملا۔ کامیشور پنڈت نے اس بیچ دال مل کے سامنے سڑک کے اُس پار ایک مکان بنوا لیا تھا۔ یہیں سے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی۔ اس شادی میں انھوں نے سارے باراتیوں کی حجامت بنائی تھی اور یہیں انھیں ان کا چاہا موقع بھی ملا۔ گانے بجانے کے لیے پارٹی شہر سے آئی تھی اور اس گانے بجانے کے بیچ انھوں نے بھی اپنا ہنر دکھایا تھا۔ یہی پارٹی انھیں شہر لے آئی تھی۔ اب وہ گاؤں سے اپنا ہارمونیم بھی لے آئے تھے۔ جھما جھم پانی بھرے کے علاوہ جلدی ہی انھوں نے کچھ فلمی گانے بھی سیکھ لیے تھے۔ مگر اس سنگیت پارٹی میں ان کا زیادہ کام گانا نہیں، بجانا ہوتا

تھا، خاص طور سے ڈھولک۔ اور اب ان کا ایک نیا لیکن بیہڑ سفر شروع ہوا۔

اپنا استرا، قینچی وغیرہ انھوں نے کاغذ میں لپیٹ کر صندوق میں رکھ لیا تھا۔ خود اپنی حجامت کے لیے بھی انھوں نے باقاعدہ سیفٹی ریزر اور بلیڈ خرید لیے تھے۔ اب وہ اس پہچان کا سب کچھ اپنے آپ سے دور کر دینا چاہتے تھے جس کی وجہ سے ہر پل اپنا سر کندھوں سے اتار کر نیچے رکھنا پڑتا تھا۔ بچوں کو انھوں نے اسکول بھیجا اور جب بچے پڑھنے لگے تو انھوں نے خود بھی کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔

سنگیت پارٹی کا کام زیادہ دن نہیں چلا، پر انھیں ایک تمبو قنات والے کے یہاں کام مل گیا۔ تمبو قنات والے کے یہاں بھی مزدوران پڑھ تھے۔ اکیلے نند لال ہی ایسے تھے جنھوں نے دو حرف سیکھ لیے تھے، اس لیے دوسروں کے مقابلے میں انھیں زیادہ اہمیت مل رہی تھی۔ تمبو قنات والے کا بہت سا سامان لگاتار ایک درزی کے یہاں تیار ہوتا رہتا تھا۔ اس کی دیکھ ریکھ انھی کے ذمے تھی۔

سردیوں کے موسم میں انھیں ایک بار پھر اپنے کندھوں پر رکھے سر کو بچائے رکھنے کا موقع ملا۔ آریہ سماج کا سالانہ جلسہ تھا۔ وہاں تمبو قنات لگانے کے بعد شام کو شروع ہوئے پروگرام میں وہ بھی بیٹھ گئے۔ انھوں نے دور سے بہت لوگوں کو بہت طرح کے بھاشن کرتے دیکھا تھا، پر کبھی دھیان نہیں دیا تھا کہ وہ کیا اور کیوں بول رہے ہیں۔ انھوں نے کچھ دھرمی جلسے بھی دیکھے تھے، پر وہ جانتے تھے کہ ان جلسوں کا رشتہ ان سے نہیں ہے۔ وہ جلسے صرف ان کے ہوتے تھے جن کی حجامت وہ بنایا کرتے تھے۔

آریہ سماج کا یہ جلسہ انھیں پسند آیا۔ بڑے مقرر کا بھاشن تو بہت ہی اچھا لگا۔ مقرر نے بڑے پر اثر ڈھنگ سے مندروں، مورتیوں، پُرانوں کو ڈھکوسلا قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھی باتوں سے سماج زوال پذیر ہے۔ ذات پات پر انھوں نے جو کہا وہ سن کر نند لال کو پہلی بار لگا کہ ان کے کندھوں پر رکھا ہوا سر سچ مچ انھی کا ہے اور اسے وہ وہیں رکھ سکتے ہیں۔ مقرر نے کہا کہ ذات تو کرم سے ہوتی ہے، جنم سے نہیں؛ اگر کوئی پڑھ لکھ کر ودوان ہو جاتا ہے اور ذات سے شودر ہے تو اسے برہمن ماننا چاہیے۔

جیون میں پہلی بار کسی کی کہی ہوئی باتیں انھوں نے بڑی ہوشیاری سے یاد کر لی تھیں۔ بیوی اور بچوں کے سامنے وہ باتیں انھوں نے کئی بار کئی طرح سے دہرائی تھیں۔ اگلے روز وہ پھر وہ انھی مقرر کو سننے گئے تھے۔ مقرر اپنے بھاشن کے بیچ کچھ بھجن بھی گاتے تھے۔ بھجن کے ساتھ ڈھولک بجانے

والا شاید اناڑی تھا۔ بنا کسی سے کچھ کہے وہ منچ تک گئے اور ڈھولک خود لے لی تھی۔ بیچ میں مقرر نے انھیں دیکھا اور مسکرائے تھے۔ آریہ سماج نام کی تنظیم سے ان کا رشتہ ایسے ہی بنا تھا۔

یہیں انھوں نے باقاعدہ اور محنت سے پڑھنا لکھنا سیکھنا شروع کیا۔ آریہ سماج کی عمارت میں شام کے وقت کچھ لوگوں کو درزی کا کام سکھایا جاتا تھا۔ وہ انھوں نے سیکھا تاکہ سلائی کی ایک دکان کھول لیں، مگر زیادہ دلچسپی یا تو ڈھولک اور ہارمونیم میں تھی یا پھر پڑھنے میں۔ جلدی ہی انھیں پوجا کے کچھ منتر بھی یاد ہو گئے اور تب انھوں نے سنسکار وِدھی نام کی ایک کتاب خریدی۔ انھیں یقین تھا کہ اس کتاب کا اچھی طرح مطالعہ کر لینے کے بعد وہ پوجا یا شادی بیاہ کی رسومات ضرور کرا لیں گے اور ان کے کندھوں پر آ گی ان کی خودداری استرے سے کٹے گی نہیں۔

یہ یقین ہونے کے بعد ان میں ایک نئی تبدیلی آ گئی۔ اپنے چھوٹے سے گھر کی پُتائی کرانے کے بعد انھوں نے کباڑی بازار سے ہی خرید کر دو پرانی کرسیاں بھی رکھ لیں۔ وہ کچھ ایسے جملے کسی بہانے ضرور بولتے تھے جن کا سننے والوں پر اثر پڑے، جیسے بچوں کو اچھے سنسکار سکھانے چاہییں یا انسان اپنے کرموں سے ہی اچھا یا برا بنتا ہے، وغیرہ۔ ایسے زیادہ تر جملے وہ آریہ سماج کے جلسوں سے سیکھ لیتے تھے۔ آریہ سماج میں بھی ان کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ وہاں زیادہ تر لوگ آس پاس چھوٹا کاروبار یا چھوٹی نوکری کرنے والے تھے۔ انھیں اتنا وقت تو مل جاتا تھا کہ اتوار کی صبح کی سبھا میں آ جائیں یا کسی بڑے جلسے وغیرہ میں شام گزار لیں، مگر وہاں کہی گئی باتوں کو یاد کر لینے کا وقت یا موقع ان کے پاس نہیں ہی ہوتا تھا۔ ان کے لیے نندلال کی قابلیت خاصی اہمیت رکھتی تھی اور لوگ متاثر بھی ہوتے تھے۔ نندلال کے لیے یہ صورت حال بہت اطمینان بخش تھی۔ وہ پرجوش ہو کر مہذب ہونے پر اور زیادہ محنت کرتے تھے۔

ایک بڑے مقرر کے بھاشن میں انھوں نے سنا تھا کہ ویدک منتر تین سُروں میں گائے جاتے تھے۔ انھوں نے اکیلے میں اس کی بھی کچھ مشق کی۔ ایک اتوار کو آریہ سماج میں ہونے والے ہَون میں جس وقت بہت سے لوگ منتر پاٹھ کر رہے تھے، تھوڑا سا پیچھے بیٹھ کر انھوں نے بھی ساتھ ساتھ منتر پڑھے۔ پتا نہیں کسی نے دھیان دیا یا نہیں، پر کچھ اتوار اسی طرح منتروں کو ادا کرنے کے بعد وہ تھوڑا آگے کھسک آئے اور انھوں نے بھی آہوتیاں دیں (چڑھاوے چڑھائے)۔ اب انھیں لگا، وہ

کا میشور پنڈت سے کہیں، پنڈت جی، دیکھیے، آپ کے آشیرواد سے اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پر وہ واپس گئے نہیں۔ انھیں لگتا تھا کہ وہاں ان کا جو استرا تھا وہ ان کے ساتھ شاید آج بھی وہی سلوک کرے۔ اس استرے سے اب وہ بڑی ہوشیاری سے دوری بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی انھیں لگتا تھا کہ استرے کی دھار بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ کیوں ہوتی ہے اتنی تیز؟ وہ چہرے کے بال ہی نہیں کاٹتی، اس کی دھار سے ان کی گردن کہیں زیادہ صفائی سے کٹتی ہے۔

ایک دن آریہ سماج میں ہونے والی ایک شادی کے دوران ان کے مُنہ سے ادا کیے ہوئے منتروں کے بیچ اچانک ان کا وہی استرا ان کی گردن سے آلگا۔

استرے کی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ آپ کی انگلی اگر اچانک اس سے کٹ جائے تو ایک لمحے کے لیے آپ کو ہلکی سی گدگدی سی ہی محسوس ہوگی، لیکن ایک لمحے کے بیتتے نہ بیتتے ایک زبردست ٹیس اور جلن اُبھر آتی ہے۔

بچپن میں ایک بار پتا کے استرے کو ہتھیلی پر تیز کرنے کا کھیل کرتے ہوئے ان کی ہتھیلی کٹ گئی تھی۔ اس وقت انھیں بالکل ایسا ہی لگا تھا۔ وہ حیران ہوئے تھے کہ کٹنے کے بعد انھیں جو تکلیف ہوئی تھی وہ اس وقت کیوں نہیں ہوئی جب ہتھیلی کٹ رہی تھی؟

استرے سے کتنا وہ پہچانتے تھے۔ ان کا منتر پاٹھ حلق میں ہی کہیں پھنس گیا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ گہری تکلیف نہ ہونے کے باوجود ان کا سر ان کے کندھوں پر ہے یا نہیں۔

شادی کی جو تقریب اس دن تھی، اس میں لڑکے والوں کی طرف کے ایک شخص کو وہ پہچان گئے تھے، کیونکہ اس شخص نے بھی انھیں پہچان لیا تھا۔ اس شخص کو 'کوتاہ گردنیا' کہا جا سکتا تھا، بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ ہی کچھ تھا۔ گردن نام کی چیز اس شخص کے جسم میں تھی ہی نہیں۔ اس کا سر اس کے کندھوں پر ایک چھوٹے موٹے ٹیلے کی طرح جما ہوا تھا۔ وہ شخص کا میشور پنڈت کی بیٹی کی شادی میں آیا تھا۔ بارات کے سارے لوگوں کے ساتھ نند لال نے اس کی بھی حجامت بنائی تھی اور چونکہ رات کے منورنجن میں نند لال نے نہ صرف ڈھولک بجائی تھی بلکہ کچھ اچھا گایا بھی تھا، اس لیے اس شخص نے انھیں پہچاننے میں بھول نہیں کی۔

بیاہ کی رسم پوری ہونے کے بعد اس بنا گردن کے شخص نے بہت خوش ہوتے ہوئے کہا تھا،

''میں تو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ کیسے ہو؟''

نمسکار کا جواب انھوں نے خاصی ہٹپٹاہٹ کے ساتھ دیا تھا۔ وہ خود ایک اندرونی تکلیف سے بھر گئے تھے مگر ابھی تک ظاہراطور پر کوئی خاص گڑبڑی نہیں ہوئی تھی، پر کھانے کے وقت وہ ہوگئی۔ آنگن میں کھانے کا انتظام تھا۔ لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف کے اور آریہ سماج کے لوگوں کو ملا کر کوئی پینتیس لوگ ہوں گے۔ آنگن کے چاروں طرف تہہ کر کے چاندنی بچھادی گئی تھی۔ یہیں بیٹھ کر وہ بھی کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک اس بے گردن شخص نے پوچھا، ''بھیا، تمھارا نام کیا ہے؟ میں بھول گیا۔''

انھوں نے نام بتا دیا۔ وہ شخص بولا، ''بھائی، تم گاتے بہت اچھا ہو۔ ہم نے مگن بابو سے کہا ہے۔ آج شام آجاؤ۔ پتا لے لینا۔ کیا بات ہے! ایسا سریلا گلا!''

انھوں نے دھیرے سے ہامی بھری۔ تب ہی اس شخص نے پوچھا، ''وہاں تم نے اپنی دکان بند کر دی ہے کیا؟ میں دو ایک بار گیا تو دکان بند ہی تھی۔''

اس شخص نے ایک گلاب جامن اور منگاتے ہوئے کہا، ''کامیشور پنڈت کی بیٹی کی شادی میں گیا تھا تب ان کا گانا سنا تھا۔ واہ، کیا گایا تھا! آئے تو تھے یہ ہم لوگوں کی حجامت بنانے۔ تب تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ اتنا عمدہ گاتے ہیں۔ ارے، سماں باندھ دیا تھا۔''

لوگ کھاتے کھاتے انھیں دیکھنے لگے۔ انھوں نے کسی کی طرف نہیں دیکھا، پر وہ جانتے تھے کہ لوگ انھیں دیکھ رہے ہیں اور ان کے پاس کوئی ایسی جادوئی شکتی نہیں تھی کہ وہ لوگوں کے دیکھتے دیکھتے غائب ہو سکتے۔

مگر یہ سوچنا بھی شاید صحیح نہیں تھا۔ وہ غائب تو ہوئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے منتر پاٹھ کرنے والے اور گانے بجانے کے لیے معروف نندلال اس کوتاہ گردنیا شخص کی بات ختم ہوتے ہوتے سیٹی بجاتے ہوئے آسمان تک جانے والی آتش بازی کی ڈبی کی طرح اوپر گئے اور خالی ہو کر نیچے گرے۔ اب وہاں صرف نندلال نائی بچ گیا تھا۔

ان کے منھ میں کھانا بے حد کڑوا اور روکھا ہو گیا تھا۔ اس دن وہ ایک ایسی مشین کی طرح گھر لوٹے تھے جو ٹوٹ پھوٹ کر کباڑ میں تبدیل ہو چکی ہو۔ اور اسی کے بعد انھوں نے محسوس کیا تھا کہ وہ

Scanned with CamScanner

جہاں پیشاب کرتے تھے وہاں چیونٹے لگنے لگتے تھے۔

بہت کوشش کے باوجود، اب وہ دوبارہ وہ نہیں ہو پائے جو ہونے کے بعد وہ خاصے مطمئن رہنے لگے تھے۔ ایک بار انھوں نے گاؤں لوٹنے کا بھی فیصلہ کرلیا تھا۔ بوکھلا کر بچوں نے پوچھا تھا، ''وہاں کیا کریں گے؟''

''وہی جو پشت در پشت کرتے آئے ہیں،'' انھوں نے بڑی گمبھیرتا کے ساتھ کہا۔ پر گھر والے ہی نہیں، خود ان کی قوتِ ارادی نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اب ان کے اندر کی کوئی چیز ان کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھی۔ کبھی انھوں نے آئینے میں دیکھ کر بچوں سے کہا تھا، ''ابھی پچاس سال کی عمر تک میرے بال پکیں گے نہیں۔'' پر انھوں نے دیکھا، بال اچانک پکنے لگے تھے۔ طبلے پر انھوں نے کبھی مشق کی ہی نہیں تھی۔ وہ اس جوش میں خرید لائے تھے کہ آریہ سماج کے بھجن گانے والے کی سنگت وہ ڈھولک نہیں، طبلے سے کریں گے۔ پر ذیابیطس کے لیے طبلے میں رات بھر رکھا پانی پینے کے لیے انھوں نے دایاں بے جھجک کھول ڈالا تھا۔ اب انھیں بہت اُتساہ تو نہیں محسوس ہوتا تھا، لیکن جامن کے تنے کی چھال وہ لے ہی آتے تھے۔ آج بھی وہ جامن کے درخت کی وہی چھال لے کر لوٹ رہے تھے۔ اسے چندن کی طرح سل پر رگڑنے میں بھی تو وقت لگتا تھا۔ پر کہاں ہے ان کا گھر؟

اچانک انھیں کچھ یاد آیا۔ اپنے پتا سے جو آسیب ان کے وجود میں نسلی ورثے کی طرح آیا تھا، وہ اتنے دن چپ رہنے کے بعد اس بے گردن شخص کے کچھ جملوں سے ہی جیسے بلبلا کر ان کے اندر دوبارہ جیسے اٹھ پڑا تھا۔ کیا یہ اسی آسیب کی کرتوت تھی کہ وہ اپنا گھر بھول گئے تھے؟ یا سب کچھ چھوڑ کر اپنی آسیبی طاقت سے اس نے صرف ان کا گھر غائب کر دیا تھا؟

اپنی تمام احتیاط کے باوجود وہ حادثہ پھر ہوا۔ اب تھوڑا اندھیرا بھی ہونے لگا تھا۔ انھیں لگا، ان کی گلی کچھ زیادہ ہی لمبی اور گھماؤدار ہوگئی ہے۔ کچھ پہچان کی چیزیں انھوں نے کھوجنے کی کوشش کی، پر اندھیرے میں صاف کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پر وہ ہار نہیں ماننا چاہتے تھے۔ کچھ دیر اور چلنے کے بعد وہ رک گئے۔ جہاں وہ رکے تھے وہاں گلی ختم ہو کر ایک بہت چوڑی اور بے حد کشادہ سڑک میں مل گئی تھی۔ اس سڑک پر کافی تیز اجالا تھا۔ جھنڈے والے چھوٹے چوک سے وہ ٹھیک ہی چلے تھے۔ اُدھر

Scanned with CamScanner

سے تو کوئی گلی کسی چوڑی سڑک پر نہیں کھلتی تھی۔

ٹھیک اسی وقت شاید بتی چلی گئی۔ یا شاید یہ بھی ان کا وہم ہو۔ ان کے اندر ایک گھر گھراہٹ کے ساتھ کوئی چیز گھومی، جیسے کوئی لوہے کا پہیہ، اور پھر اس کی رفتار بڑھنے لگی۔ بڑھتی رفتار کے ساتھ ایک تیکھی، بھیجے میں سوراخ کرنے والی آواز بھی بڑھنے لگی۔ اس نپٹ اندھیرے میں تیز گھومتے پہیے پر ٹکے ہوئے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے، پر وہ کہیں کچھ بھی چھو نہیں پا رہے تھے۔

❄❄

Scanned with CamScanner

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

ایک بندر کی موت

دور سے سننے والے کو وہ رونے کی آواز بھی لگ سکتی ہے۔ یہ جستجو اس گلی میں رہنے والا کوئی نہیں کرتا کہ وہ گانے کی آواز ہے یا رونے کی۔ گلی میں رات کوئی ایک بجے سے خاموشی ہوتی ہے، تب وہ آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ ویسے وہ آواز رونے کی نہیں، گانے کی ہے۔ ایک بوڑھی، بے حد دبلی عورت گاتی ہے۔ گلی کے تیسرے ادھ گرے مکان کی اوپری منزل پر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے آگے ٹین کا سائبان۔ ٹین روکنے والی لکڑیوں کو ایک لمبے عرصے سے کیڑوں نے کھایا ہے اور ان میں سے ایک کسی ممی کی ٹانگ کی طرح لٹک آئی ہے۔ سائبان کے بیچوں بیچ فرش پر ایک بڑا سا سوراخ ہے جس سے نیچے کے کمرے کے اندر جھانکا جا سکتا ہے۔ اسی سوراخ کے پاس بیٹھ کر وہ گاتی ہے۔

وہ کیا بناتی ہے، کیا کھاتی ہے، کوئی نہیں جانتا۔ گو کہ اس میں رہنے والے ہر کسی کا ہر کسی سے واسطہ ہے، پھر بھی اس بوڑھی عورت سے ہر کوئی بے خبر ہے۔ خود اس کا بیٹا مجّو بھی۔ شاید ہی کبھی کسی نے مجّو کو اوپر جاتے دیکھا ہو۔

صرف ایک بار لوگوں کا دھیان اس عورت کی طرف گیا تھا۔ پر وہ بہت پرانی بات ہے، شاید تیس بتیس یا اس سے بھی زیادہ۔ وہ چھوٹا سا دومنزلہ مکان اس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ نیچے کے کمرے میں کھلنے والا چھت کا وہ دو بالشت دائرے کا سوراخ بھی ایسا ہی تھا۔ پر اس وقت اس میں ایک الگ ہی قسم کی زندگی ہوا کرتی تھی۔ کچھ مزدور صبح شام آتے تھے۔ یہ صبح بھری ہوئی بوری لاتے تھے اور

شام کو لے جاتے تھے۔ بورے میں ثابت ارہر کے دانے ہوتے تھے۔ شام کو جب وہ لے جاتے تھے تو اسی بوری میں ارہر کی دال ہوتی تھی۔ ایک بڑی بوری میں ارہر کے دانوں کے چھلکے ہوتے تھے، جنھیں کوئی اور لے جاتا تھا، اور ایک چھوٹے تھیلے میں دانوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے تھے۔

دراصل اوپر کی منزل پر اس عورت نے ایک پتھر کی چکی لگا رکھی تھی۔ اسی میں وہ سارا دن ارہر کے دانے مٹھی بھر بھر کر ڈالتی تھی اور چکی کے چاروں اور دال اور چھلکوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔ اسے وہ فرش پر بنے اس بڑے سے سوراخ سے نیچے گراتی جاتی تھی۔ گرنے پر دال سے چھلکے الگ ہو جائیں، اس کے لیے لگاتار کسی انگوچھے کو دو بچے ہلاتے تھے۔ پر بچے دو کے بجائے کچھ زیادہ ہی جمع ہو جاتے تھے۔

عورت چکی چلاتے وقت بڑے انہماک سے پرانے گیت گاتی تھی۔ میں کتنے من اناج کوٹوں، کتنے من پیسوں میرے بھیا، کتنے من کی رسوئی پکاؤں۔ ساس مانجھنے کے لیے برتنوں کا اونچا ڈھیر دے دیتی ہے...

اس وقت آس پاس کے سب لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ عورت گاتی ہے۔ پر اس کے بعد ایک دن وہاں ایک بھاری ہنگامہ ہو گیا۔ پڑوس کے کچھ بچے اس عورت کے اپنے بچے کے ساتھ مل کر چھت کے چھید سے نیچے فرش پر گرتی دال پر ہوا ہی نہیں کرتے تھے، کھیلتے بھی تھے۔ اسی کھیل میں ایک بچے نے چکی کے اس چھید میں ایک لوٹا پانی ڈال دیا۔ ظاہر ہے، اس عورت کے لیے یہ کوئی خوش ہونے والا واقعہ نہیں تھا، کیونکہ نہ صرف بہت ساری دال کا نقصان ہوا تھا بلکہ چکی بھی بغیر سُکھائے، صاف کیے، کام کے لائق نہیں رہ گئی تھی۔ عورت کا چہرہ بہت تیزی سے بگڑا۔ اس کے دانت دکھائی دینے لگے اور بال جیسے اپنی جڑوں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ شرارت کرنے والا بچہ ابھی تک ہنس رہا تھا، پر اب رونے لگا۔ عورت نے غصے سے بھر کر اس کے کانوں کے پاس ایک زوردار تھپڑ مارا۔

تھپڑ مارنے کے بعد عورت سمجھ نہیں پائی کہ یکایک کیا ہوا؟ وہ دبلا ننھا بچہ بے تحاشا چیختا ہوا دال گرائے جانے والے سوراخ میں اٹکا، پھر ایک دم غائب ہو گیا۔

عورت سہم کر زینے تک آئی، پھر ٹھٹک گئی۔ گلی میں اس طرح شور برپا تھا جیسے کسی نے بہت

سے جنگلی جانور ایک ساتھ چھوڑ دیے ہوں۔ محلے کی گلیوں کی ایک خاص صفت ہوتی ہے۔ جہاں عام طور پر زیادہ بھیڑ نہیں دکھائی دیتی اور زیادہ تر لوگ اَلسائے، بے جان سے لگتے ہیں، وہیں چھوٹے سے چھوٹے واقعے پر یہ بڑی مستعدی سے اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہی ہوا۔

اس کے بعد پولیس نے تو کوئی خاص کارروائی نہیں کی، پر اس چھت پر چکی کی آواز بھی بند ہو گئی اور گانے کی بھی۔ وہ عورت کہیں چلی گئی۔ اس کے ننھے بیٹے مجڑو کو شاید نہ تو اس کے وہاں ہونے سے کوئی خاص سروکار تھا اور نہ اس کے غائب ہو جانے سے۔ جب سب بچے چھت کے چھید سے گرتی دال پر انگوچھے سے ہوا کرنے کا مزہ لے رہے ہوتے تھے، مجڑو گلی کے موڑ کے دھوبی کی استری میں کوئلے سلگاتا ہوتا تھا یا گلی کے مہانے پر شیام سندر حلوائی کے چبوترے پر بیٹھا، امرتیوں کے لیے اُڑد کا آٹا گھوٹتا رہتا تھا۔ مجڑو کے لیے وہ سب کام اس سے بہتر تھے جو اس کی ماں کیا کرتی تھی۔ ماں کا کھانا بھی کچھ عجیب سا تھا جو مجڑو کو کبھی پسند نہیں آیا۔ ماں جس ارہر سے چکی پر دال تیار کرتی تھی، اسی کا ایک حصہ اسے محنتانے میں مل جاتا تھا۔ وہ یہی دال ایک برتن میں چڑھا دیتی تھی اور پکتے وقت اس میں آٹے کی ٹکیاں بنا کر ڈالتی جاتی تھی۔ باسی ہونے پر اسے یہ کھانا اور لذیذ لگتا تھا۔

پر مجڑو نے شاید ہی کبھی وہ کھایا ہو۔ اس کی ماں کو بھی اس بات کا ملال کبھی نہیں ہوا۔ کبھی کبھی بہت پڑھی لکھی اور کھاتی پیتی دنیا کے خاندانوں میں بھی یہ ہوتا ہے؛ والدین کی دنیا سے بیٹے کی دنیا کٹ کر رہ جاتی ہے، پر ایسا کچھ عمر زیادہ بڑھنے پر ہی ہوتا ہے۔ مجڑو اور اس کی ماں کی دنیا اس وقت سے الگ ہو گئی تھی جب سے مجڑو نے تھوڑا سا چلنا بولنا سیکھا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ماں کا کام بھی گھٹیا قسم کا ہے اور اس کا بنایا کھانا بھی۔ وہ گاتی ہے یا روتی ہے، اس پر بھی اس نے کبھی دھیان نہیں دیا۔

ماں غائب ہو گئی تب بھی مجڑو کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ اور جب وہ اسی طرح بغیر آہٹ واپس لوٹ آئی تب بھی مجڑو پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ مجڑو کی عمر میں ضرور اضافہ ہو گیا تھا اور جو گھٹنا اپنے ننگے بدن پر وہ پہنتا تھا اس سے باہر اس کے جسم کے حصے کچھ بڑھ گئے تھے۔ اتنے برسوں میں مکان بھی کچھ زیادہ پرانے ہو گئے تھے اور گلی بھی۔ گلی میں جڑی ہوئی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ کر گڑھے بن گئے تھے۔ پر سب سے بڑی تبدیلی کچھ دور سے ہی دکھائی دے جاتی تھی۔ گھروں میں اب بجلی کا استعمال زیادہ تھا اور ہر باشندے نے پانی کے اپنے نل الگ لگوا لیے تھے۔

Scanned with CamScanner

سرکاری زبان میں اس 'ترقی' نے گلی کی شکل کچھ عجیب ہی کر دی تھی۔ گلی کے سرے پر جو بجلی کا کھمبا تھا اس پر سرکاری تار صرف پانچ تھے، پر گھروں میں جو تار بتی جلانے کے لیے تھے ان کا گچھا بہت بھاری ہو گیا تھا۔ دور سے دیکھنے پر لگتا تھا وہ بجلی کا کھمبا نہیں، مکڑی کا جالا اتارنے والا ایک بانس ہو جس پر بری طرح مکڑی کا جالا لپٹ گیا ہو۔ اتنی ہی عجیب شکل مکانوں کے چبوتروں کے پاس پانی کے نلوں کی تھی۔ وہاں اتنے زیادہ نل تھے کہ وہ مکان نہیں کسی کارخانے کے بوائلر لگتے تھے۔

انھی میں سے ایک میں اب ایک زنجیر سے ننھے بندھا رہتا تھا۔ یعنی ایک بندر۔ یہ بندر عتیق آٹھ روپے دے کر خرید لایا تھا۔ بندر بالکل بندر جیسا ہی لگتا تھا، پر عتیق نے پیار سے اس کا نام رکھا ذہین الدولہ۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ننھا بندر بے حد سمجھدار ہے۔ پر یہ نام زیادہ چلا نہیں۔

ان دنوں کچھ لوگ ایک تحریک چلا رہے تھے۔ اسے وہ 'ہندو جاگرن ابھیان' کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سارے ہندو سو رہے تھے اور مسلمان جاگ رہے تھے۔ مسلمان جاگ رہے تھے اس لیے مزے لوٹ رہے تھے۔ اس تحریک کے چلتے پاس کی کالونی کے لڑکے بہت پر جوش تھے۔ یہ کالونی شہر کے بیچ ایک بڑے راجہ کے باغیچے میں بسائی گئی تھی جو شہر کی گھنی آبادی کے بیچ ایک خوبصورت نخلستان تھا۔ اس میں منگت رام جوہری کی بھی کوٹھی تھی اور بجلی کا سامان بیچنے والے اننت مشر کی بھی۔ اس میں کچھ ریٹائرڈ افسر بھی رہتے تھے اور بین الاقوامی ہندی تحریک چلانے والے ٹھاکر سرودمن کا مکان بھی یہیں تھا۔ ان لوگوں کی لڑکیاں شادی سے پہلے پڑھائی اور پوشیدہ پریم میں مگن رہتی تھیں اور لڑکے بیچ کے چھوٹے پارک میں لکڑی کی مہنگی تھاپیوں سے ایک قسم کی ٹھوس گیند کھیلتے رہتے تھے۔ یہ لڑکے ایسے جلوسوں میں کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے جن سے انھیں اپنے دھرم کا سمبندھ دکھائی دے جائے۔ 'ہندو جاگرن ابھیان' میں بھی وہ حصہ لے رہے تھے۔ اس کالونی سے بڑی سڑک کی طرف نکلنے کے لیے ایک بڑا پھاٹک تھا اور ایک پتلی سی گلی۔ اس گلی کے دونوں طرف کبھی راجہ صاحب کے نوکروں کی کوٹھریوں کی قطار تھی۔ وہی کوٹھریاں اب کوئی آدھی صدی کے عرصے میں چھوٹے چھوٹے دو منزلہ مکانوں میں تبدیل ہو چکی تھیں جن میں سے کسی کسی میں چار یا پانچ خاندان بھی رہتے تھے۔ جس سے کبھی راجہ کے ہاتھی اندر آتے تھے اس شاندار اور وسیع پھاٹک کے دونوں پایوں میں درزی، حلوائی، پرچونی اور انڈے مکھن بیچنے والوں کی دکانیں تھیں اور اوپر کی منزل میں

Scanned with CamScanner

راجہ صاحب کے خاندان کی رہائش تھی اور ایک بڑی سی تختی، جس پر لکھا تھا: 'مہاراج ادھیراج گوبو رائے ہاؤس'۔

'ہندو جاگرن ابھیان' کا چھوٹا سا جلوس لے کر گلی سے گزرتے ہوئے مہاراج ادھیراج کا پوتا، سنجے کمار سنگھ عرف منّو، عتیق کے بندر کو دیکھ کر ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس نے سینہ پھلا کر پان مسالے کی پیک تھوکتے ہوئے زوردار آواز میں للکارا، ''ابے او عتیق کے بچے، باہر نکل!''

عتیق باہر ہی کھڑا تھا۔ دبی آواز میں اس نے پوچھا، ''کیا بات ہوگئی راجہ بھیا؟ میں نے تو آپ کی جھنڈی لگا رکھی ہے۔''

''ابے بھگوا لگا کر کون سا احسان کیا تو نے، ایں؟ بھگوا نہیں لگائے گا تو کیا پاکستانی جھنڈا لگائے گا؟ یہ بندر تیرا ہے؟'' سنجے کمار سنگھ عرف منّو نے پوچھا۔

''میرا ہے راجہ بھیا، کیوں؟''

''کیا نام رکھا ہے اس کا؟''

''اس کا؟ اس حرامی کا نام کیا ہوتا! پر میں نے اس کا نام ذہین الدولہ رکھا ہے۔'' کہہ کر عتیق ہنسا۔ ''سالا بندر ہو کر خاصا ذہین ہے۔''

تب تک اس 'راجہ بھیا' کے لقب سے مخاطب کیے گئے تگڑے لڑکے نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ تین چار بہت بھدی گالیاں دے کر اپنے ساتھیوں سے بولا، ''حرامی، شری رام بھکت ہنومان کو بندر بتا رہا ہے؟ ابے، یہ بندر ہے؟''

دیکھتے ہی دیکھتے وہ تھوڑا سا پٹا، زیادہ نہیں۔ ان لوگوں کی دلچسپی پیٹنے سے زیادہ اپنی بات کا وزن ثابت کرنے میں تھی۔ اچانک راجہ بھیا کو یاد آیا، ''اور ہاں، یہ ذہین الدولہ کیا نام ہوا؟ یہ بندر مسلمان ہے؟''

گلی میں جمع بھیڑ بھی اس دلیل پر حیران ہوئی۔ خود عتیق بھی بہت جلدی سمجھ گیا کہ بندر مسلمان نہیں ہے۔

اس حادثے کے بعد عتیق نے بندر کا نام بدل دیا۔ اب اس نے اس کا سیدھا سا نام 'ننھے' رکھ دیا۔ لیکن اس 'ننھے' نام کے ساتھ ایک مصیبت بھی کھڑی ہوگئی۔ ایک دن بہت صبح پورے شہر میں اتھل

پتھل مچ گئی۔ ہر کوئی آس پاس کے بندروں کی مورتیوں کو دودھ پلانے بھاگا جا رہا تھا — عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے بھی۔ راجہ کے باغیچے کی کالونی میں بنے ایک مندر میں بھی یہی ہو رہا تھا۔ لوگ خوشی سے اچھل رہے تھے — بھگوان دودھ پی رہے تھے، سچ مچ۔ لوگ مورتی کے منھ کے پاس چمچہ لگاتے تھے اور دودھ دھیرے دھیرے غائب ہو رہا تھا۔ سنجے کمار سنگھ عرف مکو عرف راجہ بھیا سب بندوبست دیکھ رہا تھا اور دودھ کا انتظام بھی۔ سارے شہر میں ہی نہیں، سارے دیش میں یہ ہو رہا تھا، یا کیا جا رہا تھا۔

پر اس سے نہ عتیق کا کوئی تعلق تھا نہ ہی اس کے بندر ننھے کا۔ عتیق اپنے بندر کو ہر صبح سرکاری ڈیری سے ملنے والا سستے دودھ کا ڈیڑھ روپے والا ایک پیکٹ دیتا تھا۔ جلدی ہی بندر دانت سے اس میں سوراخ کر کے سیدھے اسی سے دودھ پینا سیکھ گیا تھا۔ کبھی کبھی یہ پیکٹ عتیق اس کے لیے پجّو سے بھی منگا لیتا تھا۔ پجّو پیکٹ بندر کی طرف اچھال دیتا تھا اور بندر ہوا میں کسی نٹ کی طرح قلابازی کھا کر اسے تھام لیتا تھا۔

جس دن مندروں میں مورتیاں دودھ پی رہی تھیں اس دن سارے شہر سے دودھ غائب ہو گیا تھا۔ دودھ پلانے کے لیے بے حال لوگوں کی کافی مدد راجہ بھیا نے کی تھی۔ جہاں کہیں بھی دودھ ہو سکتا تھا، وہاں سے وہ جٹا رہا تھا۔ اسی بیچ اس نے دیکھا، عتیق دودھ کا ایک ننھا پیکٹ لیے جا رہا ہے۔ راجہ بھیا نے کسی باز کی طرح اسے جا دبوچا۔ ''ابے تو یہ دودھ کہاں لیے جا رہا ہے؟ کالا بازاری کرے گا؟''

''کیا بات کرتے ہیں راجہ بھیا!'' عتیق گھبرا کر بولا، ''میں تو یہ ننھے کے لیے لے جا رہا ہوں۔''

''ننھے؟ ننھے کون ہے بے؟''

''ننھے، وہی اپنا بندر۔''

''بندر! یہ سالا بندروں کو دودھ پلائے گا!''

اس دن عتیق کو کسی اور پر نہیں، اس بندر کے بچے پر غصہ آیا۔ وہ گلی میں پہنچا تو بندر نے خوش ہو کر قلابازی لگائی۔ عتیق کا دل چاہا کہ وہ اس کے سر پر ایک اینٹ دے مارے۔ بندر شاید اس کی اندرونی کیفیت سمجھ گیا۔ وہ پانی کے نلوں میں سے ایک میں بندھا رہتا تھا۔ انھی نلوں پر وہ اداس ہو کر

Scanned with CamScanner

دبک گیا تھا۔ عتیق اس کے بعد اس سے اتنا کھنچ گیا تھا کہ اس نے اسے ننھے نام سے بھی پکارنا بند کر دیا تھا۔ پہلے اسے اپنی دکان کے کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ بندر سے بھی لگاؤ تھا، پر اب اس کی دلچسپی کمپیوٹر تک ہی رہ گئی تھی۔

کمپیوٹر بجلی سے کام کرنے والی ایک خاصی ترقی یافتہ مشین ہے۔ عتیق کسی وقت گلی کے اپنے اسی تنگ سے گھر میں چھاپے خانے کے لیے چھوٹی موٹی کمپوزنگ کیا کرتا تھا۔ ایک بار سعودی عرب سے لوٹے اس کے کسی دوست نے اسے یہ مشین دکھائی۔ کچھ نقد کچھ ادھار رقم جٹا کر عتیق لے آیا۔ اس کے ذریعے وہ کمپوزنگ سے زیادہ کچھ بھی کر لیتا تھا۔ اس مشین نے مجڑو کو بھی اپنی طرف کھینچا۔ کچھ دن وہ بڑی لگن سے اس کی صفائی کرتا رہا، پھر ایک دن اس نے ہمت کر کے اس پر انگلیاں بھی چلائیں۔ دھیرے دھیرے عتیق سے زیادہ اچھا کام وہ خود کرنے لگا، خاص طور سے تصویریں بنانے والا کام۔ چونکہ پڑھا لکھا کچھ نہیں تھا، اس لیے عبارت میں مار کھا جاتا تھا۔

مجڑو کمپیوٹر پر کام کرتا تھا، پر مزدوری یا نوکری نہیں۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ صبح وہ تھوڑا سا کام بجلی کی اس مشین پر کرے، پھر دوپہر کو تھوڑا کام کسی حلوائی کی بھٹی پر کرے اور شام کو منگت کی مسالہ پیسنے والی مشین کی صفائی کر آئے۔ ایک اور بہت بڑا کام اسے بغیر کسی دوڑ دھوپ کے مل گیا تھا۔ گلی کے اسی بجلی کے کھمبے کے تاروں سے الجھ کر ایک مرتبہ ایک بندر مر کر نیچے آگرا تھا۔ اگلے روز لوگوں نے دیکھا، گلی جہاں بڑی سڑک سے ملتی ہے وہیں پر مجڑو ایک نئے سرخ کپڑے کے ٹکڑے پر بندر کی لاش لے کر بیٹھا ہے۔ لاش پر اس نے گیندے کے پھولوں کا ہار ڈال دیا تھا۔

شام تک اس کا وہ لال کپڑے کا ٹکڑا سکوں سے بھر گیا تھا۔ بندر کی لاش کے لیے گلی کے ہی اکرم نے وِمان (جہاز) بنانے کا سامان دے دیا۔ اکرم پتنگیں بناتا تھا۔ اکرم کے دیے پتلے لال پیلے کاغذ اور بانس کی پھاڑی ہوئی چھڑیوں سے ناؤ جیسا ایک وِمان بنایا گیا اور آس پاس کے لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ بندر کی وہ لاش ندی کے کنارے گاڑ آئے۔ تب وہاں راجہ بھیا نے کیرتن بھی کرایا تھا۔

مجڑو کی ماں ایسے ہی دنوں میں واپس آئی تھی۔ زیادہ لوگوں نے اسے نہیں دیکھا تھا، پر چرچا بہت دور تک ہوا۔ گپ چپ۔ کسی نے اسے اس کے بعد نیچے اترتے نہیں دیکھا۔ کوئی اوپر بھی نہیں

گیا، کوئی بچہ بھی نہیں۔ اتنے برسوں میں ار ہر سے دال بنانے کا کام بھی بند ہو گیا تھا۔ مجرو کی ماں اب چکی کا گیت نہیں گاتی تھی۔ بہت زیادہ رات بیت جانے پر جو سنائی دیتا تھا وہ ایک دوسرا ہی گانا تھا، بہت کچھ ایک سیاپے جیسا۔ کبھی کبھی بہت دھیان دینے پر پتا لگتا تھا وہ گا رہی ہے — ''پیٹھ دیکھو رے مائی! میری پیٹھ دیکھو، جیسے دھوبی کا پاٹ، اس طرح مارا ہے۔''

مجرو کو جلد ہی ایک بار پھر لوگوں نے ایک مرا ہوا بندر لے کر بیٹھے دیکھا۔ اسی طرح لال کپڑے پر سجائے۔ اس بندر کو لوگوں نے گلی میں مرتے نہیں دیکھا تھا۔

''یہ کیسے مرا؟'' گلی کے ایک لڑکے نے پوچھا۔

''گر کر۔''

''کہاں گرا تھا؟''

''وہاں، امانی گنج میں۔''

''ابے یہ تیرے بدن کو کیا ہوا؟ کیا بندر کے ساتھ تو بھی گرا تھا؟''

مجرو ناراض ہو کر چپ ہو گیا۔ اس کے کندھے اور پیٹھ پر کھرونچیں اور چوٹیں تھیں۔ اس کے لال کپڑے پر اس بار اور زیادہ پیسے جمع ہو گئے، کیونکہ یہ منگل کا دن تھا، جب لوگ ہنومان کی پوجا کرتے ہیں۔ اگلے روز با قاعدہ جلوس کے ساتھ لے جا کر اس بندر کو بھی زمین میں دبا دیا گیا۔ مجرو پھر اپنے انھی کاموں میں لگ گیا — حلوائی کے یہاں بھٹی تیار کرنا اور کمپیوٹر کی دم سے بندھے چوہے کی مدد سے تصویریں تیار کرنا۔ اس کے علاوہ ایک اور کام بھی اس کا تھا۔ وہ خاص وقت میں عتیق کے بندر کو چھیڑتا تھا اور اس طرح اسی کو نہیں، دوسرے لوگوں کو بھی مزہ آتا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیسے مجرو کے اسی کام میں گڑبڑی پیدا ہو گئی۔ عتیق کا بندر اس سے چڑنے لگا۔ بہت زیادہ ہی۔

اس کے چڑنے پر مجرو کو جھنجلاہٹ ہوتی۔ ایک دن اس نے سوچا کہ وہ اس بندر کو ایک تھپڑ رسید کرے۔ نزدیک جاتے ہی وہ ننھا بندر زور سے چیخا اور اچھلا۔ پھر اچھل اچھل کر چیختا ہی گیا۔

مجرو کے نزدیک جانے پر بندر کے اس طرح اچھلنے اور چیخنے پر اوروں کا بھی دھیان گیا۔

مجرو عتیق کے لیے کسی گراہک سے چیک لینے گیا تھا۔ گراہک نے چیک تو نہیں ہی دیا، پرچے پر بنائی ہوئی تصویروں میں بھی جم کر نقص نکالے۔ تصویریں مجرو ہی نے بنائی تھیں اور بری تو نہیں ہی

تھیں۔ وہ خاصا ہی کھسیا ہوا تھا۔ عتیق کی دکان کے پاس پہنچنے پر اس نے دیکھا نل سے بندھا بندر بری طرح چیختا ہوا اچھلے جا رہا تھا۔

عتیق کی دکان کے سامنے والے مکان کے چبوترے پر پان مسالے کے چھوٹے چھوٹے پیکٹوں کی لڑیوں اور سگریٹ بیڑی کی ایک ننھی سی دکان تھی۔ یہ دکان گنگا رام بڑھئی کے مرنے کے بعد اس کی بیوی نے کھول لی تھی۔ دکان پر بہت چھوٹے بچوں کی پسند کی بھی کچھ چیزیں ملتی تھیں۔ چبوترے کی اس دکان کے آس پاس خالی چبوترے پر گلی کے کئی جوان لڑکے آ بیٹھتے تھے۔ چونکہ ان کے پاس بہت زیادہ خالی وقت ہوتا تھا، اس لیے ایک دوسرے کو گالیاں دینے کے علاوہ وہ عتیق کے بندر سے چھیڑ خانیاں بھی کرتے تھے۔ انھیں بھی مجڑو کے ساتھ بندر کے اس بدلے تیور پر تعجب ہوا۔

''ابے سالے نے کسی نے بندریا کو چھیڑا ہوگا،'' ان میں سے ایک نے کہا اور اس بے تکے مذاق پر بھی ہنسے۔

آج مجڑو نے بندر کو بالکل نہیں چھیڑا تھا، بلکہ اس کی طرف دیکھے بغیر دکان پر آ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ وہ بندر اس کی بے توجہی کے باوجود اسی طرح چیخا تھا۔

''تعجب ہی ہے،'' عتیق ادھ جلی سگریٹ جیب سے نکال کر سلگاتا ہوا بولا، ''آخر تو نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''میں کسی دن اس کی گردن مروڑ دوں گا،'' چڑ کر مجڑو نے کہا۔

''ہاں۔ اس کی گردن مروڑ دے، پھر لال کپڑے پر اس کی لاش لے کر بیٹھ جا!'' عتیق نے طنز کیا۔

عتیق کے اس طنز پر مجڑو کو جیسے کپکپی چڑھ گئی۔ اس نے کمپیوٹر کے چوہے پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابے کیا ہوا؟''

مجڑو نے عتیق کو جواب نہیں دیا۔ دکان سے نیچے اترا اور ایک طرف چل دیا۔

''ابے، حد ہوگئی! سالا بنا کوئی جواب دیے ہی سرک لیا۔''

''عتیق میاں! اس مجڑو کے بچے کو بھی اسی بندر کے ساتھ بیٹھا دو۔ اچھا تماشا رہے گا۔'' لڑکے

Scanned with CamScanner

اپنے اس بھونڈے سے مذاق پر پھر ہنسنے لگے۔ عتیق نے بڑبڑاتے ہوئے سگریٹ بجھادی اور خود کمپیوٹر پر آبیٹھا۔ پردے کے بیچ گنیش کی ایک تصویر تھی اور کونے پر ایک تکونا جھنڈا تھا۔ کمپیوٹر پر ایک مذہبی جشن کا پرچہ تیار ہو رہا تھا۔ پرچے کے کونے میں جھنڈا بنا تھا اور جھنڈے کے بیچ گنیش کی تصویر۔ مجّو نے گنیش کے پیر کے پاس ایک چوہا بھی بنادیا تھا۔

عتیق کھیج گیا۔ ''اس گدھے کو دیکھو۔ سالی اپنی تصویر بھی بنادی ہے۔''

لڑکے جوش میں آئے۔ ''اپنی تصویر؟ کمپیوٹر میں؟ سالے کمپیوٹر کو کیمرا سمجھ لیا!''

''ابے چوہا بنایا ہے!'' عتیق جھلا کر بولا۔ ''پرچے پر ایک انچ کا تو جھنڈا ہوگا۔ اس کے بیچ ناخن کے برابر گنیش جی کی تصویر ہوگی۔ چوہا تو سالا رائی برابر بھی نہیں ہوگا۔ چھپنے پر دکھائی دے گا؟ سالا کاریگری دکھائے گا، عقل دھیلے کی نہیں۔''

عتیق نے چوہا اسکرین سے ہٹایا اور جھنڈے کے بیچ گنیش کی تصویر بٹھانے لگا۔ مگر جلدی ہی اس کا دھیان پھر مجّو کی طرف چلا گیا۔ اسے لگا، مجّو سے چائے منگانا اور پینا ضروری ہے۔ یا چائے نہ بھی سہی، مجّو گیا کہاں؟ وہ کمپیوٹر چھوڑ کر چبوترے پر آ کھڑا ہوا۔ مجّو کا کہیں پتا نہیں تھا۔

دراصل اپنے غصے کے باوجود گلی کے آگے کی سڑک پر تھوڑا سا آگے جا کر ہی مجّو سہج ہو گیا۔ کسی کی لاش جارہی تھی۔ جیسی سج دھج والے لوگ تھے، انھیں دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ شو یاترا کسی مالدار کی ہے۔ ایسی شو یاترا کے ساتھ وہ عام طور پر کافی دیر تک چلتا تھا، کیونکہ لاش پر اس کے سمبندھی لوگ بتاشوں اور مکھانوں کے ساتھ ساتھ پیسے بھی اچھالتے چلتے تھے۔ آج جس جنازے کی کشش میں وہ آگے بڑھا اس پر بھی بتاشوں اور مکھانوں کے ساتھ پھول اچھالے جارہے تھے، پر ان کے ساتھ سکے نہیں تھے۔

یہ کیسی لاش ہے؟ کس کی ہے؟ اچھالے گئے سکّے بچے بھی اٹھاتے تھے، پر اس کام میں مجّو زیادہ کامیاب ہوتا تھا، کیونکہ وہ بڑا تھا، بچوں کو ڈھکیل بھی سکتا تھا۔ اعتراض کوئی اس لیے نہیں کرتا تھا کہ وہ بھی ان بچوں جیسا ہی پھٹے حال تھا۔ پر اس لاش پر سکّے نہیں اچھالے جارہے تھے۔ ایسی موت سے اسے کیا سروکار ہو سکتا تھا بھلا؟ وہ پھر ٹھٹکا، پھر مڑ کر الٹی سمت میں بڑھتا چلا گیا۔

جب وہ گلی کی طرف لوٹا، اس وقت خاصی رات بیت چکی تھی۔ بہت رات تک جاگنے والی

Scanned with CamScanner

عورتیں بھی سو گئی تھیں یا خاموش تھیں۔ اس سناٹے میں پہلی بار اس نے پتلی، مری مری آواز میں گایا جاتا اپنی ماں کا وہ گانا سنا— ''پیٹھ دیکھو رے مائی! میری پیٹھ دیکھو، جیسے دھوبی کا پاٹ اس طرح مارا ہے...''

مجڑو کے جسم پر اس دن جو چوٹیں آئی تھیں اور جن کے بارے میں اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا تھا، وہ چوٹیں کچھ اس طرح چیخنے لگیں جیسے ان کی پپڑیوں کے نیچے کچھ بڑھنے یا پھولنے لگ گیا ہو، جیسے چوٹوں کے پھیپھڑوں میں سانس بھر رہی ہو۔ ان میں جلن ہونے لگی۔ جلن صرف وہیں نہیں، جسم کے اندر تک۔

ایک بار مجڑو نے گلی کے آر پار دیکھا۔ گلی میں زیادہ اندھیرا نہیں تھا۔ عتیق کے بندر کی نیند ٹوٹ گئی تھی اور وہ بہت خاموشی سے آنکھیں پھاڑ کر مجڑو کو دیکھ رہا تھا۔ مجڑو نے بھی اسے دیکھا۔ بندر کچھ زیادہ چوکنا ہو گیا۔ مجڑو کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ یکساں رفتار سے آگے بڑھتا گیا۔ قریب آتے ہی بندر چیخا اور اچھلا۔ مجڑو بے حد پھرتی سے بندر کی زنجیر کی طرف جھپٹا۔ بندر چیخ چیخ کر اچھلنے لگا۔

بند دروازوں کے اندر سے عتیق کی جھلائی، اُنیندی آواز آئی، ''ابے کیا ہے؟ سالا کتوں کو دیکھ کر نوٹنکی کر رہا ہے۔''

باقی کوئی کچھ نہیں بولا۔ کوئی باہر بھی نہیں آیا۔ مجڑو نے بندر کی زنجیر کھول لی اور اسی طرح گھسیٹتا ہوا تیزی سے اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اوپر کی منزل پر ٹین کے سائبان کے نیچے کے فرش پر بنے سوراخ کے پاس بیٹھا اس کی ماں اسی طرح گاتی رہی— ''میری پیٹھ دیکھو رے مائی!''

چیختے اچھلتے بندر کو زنجیر سے لگ بھگ ٹانگے ہوئے مجڑو کنارے کی دیوار پر پنجہ پھنسا کر ٹین کے اوپر چڑھا اور اوپر کی بنا منڈیر کی چھت پر چلا گیا۔ اگلی دو چھتیں پھلانگنے میں اسے دشواری نہیں ہوئی۔ اور اب وہ ٹھیک وہاں پہنچ گیا تھا جہاں بجلی کے کھمبے کا وہ سرا تھا جس میں مکڑی کے جالے کی طرح سینکڑوں تار الجھے ہوئے تھے۔

اب اسے صرف بندر کے گلے سے زنجیر کھولنی تھی۔ بندر نے اچانک چیخنا بند کر دیا۔ مجڑو کو اطمینان ہوا کہ بندر شاید تھک گیا ہے۔ اس کی زنجیر کھول کر اسے کھمبے کے تاروں کی اس گنجلک پر اچھال بھر دینا ہے۔ باقی کام خود ہو جائے گا۔ اسے سرخ کپڑے پر پڑی بندر کی لاش اور سکّے دکھائی

دیے۔ ٹھیک اسی لمحے اس بندر نے اچھال ماری اور اس کے کندھے کے پاس چپٹ گیا۔ دانتوں او
ناخنوں سے ہوئے اس حملے سے بچنے کے لیے اس نے اپنا سر پیچھے کھینچا اور اس کے بعد جو کچھ بھی مچو
میں پچھلے کچھ گھنٹوں میں پیدا ہوا تھا، اسے لیے دیے وہ تاروں کی اسی گنجلک پر گرا۔ کافی دیر تک بجلی
کے تار پٹاخوں کی سی آواز کر کے آتش بازی جیسی چھوڑتے رہے۔ ہاتھ میں پھنسی زنجیر کے ساتھ بندر
لیے ہوئے مچھو جیسے ایک لمحے کے کچھ حصے تک ان تاروں کی آتش بازی میں تیرا، پھر چیختا ہوا گلی میں
جا گرا۔ گلی میں کچھ دیر ویسا کا ویسا ہی سناٹا چھایا رہا، پھر بھیڑ ایک ساتھ چاروں طرف سے اکٹھی
ہونے لگی۔

❁❁

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

جلے مکان کے قیدی

کسی جلی ہوئی عمارت میں قیدی ہونا ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے۔ ہم لوگ ایسی ہی عمارت میں تھے۔ اس کے مالک کو میں جانتا تھا— م نسیم۔

1975 میں اندرا گاندھی نے جب اس ملک میں ایمرجنسی نافذ کی تھی ان دنوں انھیں اس بری طرح ذلیل کیا گیا تھا کہ دوبارہ انھیں کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ ایک افواہ اڑی کہ انھوں نے خودکشی کرلی ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ زیارت کو نکلے تھے اور آج بھی درگاہوں میں سے کسی میں نظر آجاتے ہیں۔ جنھوں نے انھیں درگاہوں میں بھٹکتے دیکھا تھا، انھوں نے ان کی صورت کو بھی کافی بدل دیا تھا۔ بہترین ترشی ہوئی صاف چمکیلی کالی ڈاڑھی کی جگہ الجھی ہوئی بے ترتیب اور سن سفید ڈاڑھی مونچھیں، پتلون، کوٹ، ویسٹ کوٹ اور عمدہ ٹائی کی جگہ کالا چوغہ، وغیرہ۔

پر یہ سب بہت پہلے کی بات ہے۔ دھیرے دھیرے م نسیم بالکل بھلا دیے گئے۔

اسی عمارت میں ان کا چکن کے کپڑوں کا کافی بڑا کاروبار تھا۔ کام کچھ دن ان کی بیوی اور ان کے نوکر دیکھتے رہے، بس اتنا اب لوگ جانتے تھے۔

نسیم یونیورسٹی میں کلاس فیلو تھے۔ انگریزی اور فلسفہ ہم لوگ ساتھ پڑھتے تھے، پر دوستی زیادہ گہری نہیں تھی۔

اس جلی ہوئی عمارت میں داخل ہوتے ہی م نسیم کی یاد آئی تھی— بہت چپ۔ چہرے پر نہ

Scanned with CamScanner

مسکراہٹ نہ غصہ۔ بہت گورا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں۔ نہ تجسس نہ بے حسی۔ بہت ملائم آواز، جیسے شہد میں لپٹے ہوئے کانچ کے پاردرشی کھلونے ہوں۔

یہ سب کوئی بہت ترتیب سے یاد نہیں آیا تھا۔ اس وقت ہم سب کے چہروں پر ایک زبردست تناؤ تھا۔ میری ایک بانہہ چوٹ سے لگ بھگ جھول گئی تھی اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں، جو جوتے سے دبا کر مسلی گئی تھیں، اس طرح جل رہی تھیں کہ دوسرے کی حالت کا صحیح اندازہ لگا پانا ہی مشکل تھا۔ یہاں قید کیے جانے سے پہلے ہم لوگ ایک برباد کیے کارخانے کے گودام میں رکھے گئے تھے، جہاں سانس لینا بھی مشکل تھا۔ اس سے یہ جگہ بہتر تھی۔ م نسیم کے اس مکان کو میں نے پہچان لیا تھا۔ شاید کچھ اچھا بھی لگا کہ یہ لوگ ایک جانے پہچانے مکان میں لے آئے۔

مکان کے آس پاس کی چہار دیواری بہت اونچی تھی۔ اس میں رہنا زیادہ تکلیف دہ نہ ہوتا اگر ہم لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہوتی۔ کمروں سے گھرا کافی بڑا ایک آنگن بھی تھا، لیکن اس کا استعمال مشکل تھا، کیونکہ موسم بارش کا تھا۔

بارش تھم جانے پر تھوڑی ہی دیر بعد اتنی زیادہ اُمس ہو جاتی تھی کہ ہم لوگ پسینے سے تر ہو جاتے تھے۔

ان لوگوں نے چونکہ کھڑکیوں کی جلی ہوئی چوکھٹوں پر مضبوط کیلوں سے موٹے موٹے تختے جڑ دیے تھے، اس لیے اندر بے پناہ بدبو بھرنے لگی تھی۔ چھت پر پنکھے تھے، مگر جو آگ لگائی گئی ہوگی وہ اتنی بھیانک تھی کہ پنکھے پگھل گئے تھے اور ڈینے لٹک آئے تھے۔ چھت تک گئی سیڑھیوں کا دروازہ بھی تختے جڑ کر بند کر دیا گیا تھا۔

یوں تو ان کمروں میں اجالا آنے کی گنجائش بچی ہی نہیں تھی، پر رات ہوتے ہوتے کمرے اور کالے پڑ گئے تھے، کیونکہ دیواروں پر دھواں جما ہوا تھا۔ ایسے میں لگتا تھا جیسے چھت پر بدمعاش کِدھ آبیٹھے ہوں، ہم میں سے کسی کو بھی بے خبر پا کر حملہ کرنے کو تیار۔

یہاں لا کر قید کیے جانے کے بعد کچھ دیر ہم لوگ چاروں طرف اَٹے پڑے جلے سامان کا کوڑا ادھر سے ادھر الٹتے پلٹتے رہے۔ جلے کاغذ، کوئلے اور کپڑوں کے بیچ سے کوئی ٹکڑا ایسا بھی نکل آتا تھا جو جلنے سے بچ گیا ہو۔ اسی کالے کوڑے میں ایک کتاب بھی ملی، کافی جلی ہوئی۔ دراصل وہ

Scanned with CamScanner

کتاب نہیں، جلد بندھا ہوا مسودہ تھا۔ سرخ اور کالی سیاہی سے ناگری لپی میں لکھی وہ جیوتش کی ایک کتاب تھی، جو ضرور م نسیم کے ذخیرے کی باقیات ہوگی۔

ہمیں زیادہ چلنا نہیں پڑا تھا، پر ہم سب بری طرح تھکے ہوے تھے، اس لیے بھی کہ پچھلی رات میں ہم میں سے شاید ہی کسی کو بیٹھنے کا موقع ملا ہو۔ اس بیچ کھانا بھی شاید ہی کسی نے کھایا ہو۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اندھیرے میں ہی گھروں سے اٹھا لیے گئے تھے۔ چونکہ آگ کی وجہ سے وہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو کالا نہ ہو گیا ہو اس لیے اندھیرا اترتے ہی ایسا لگا جیسے رات بہت تیزی سے گہری ہو گئی۔

اس اندھیرے میں ایک دہشت بھی جڑ گئی تھی۔ ہمیں اندر ڈھکیلنے کے بعد جب بہت پھرتی سے دروازے پر بھی بہت موٹے موٹے تختے جڑے جانے لگے تو ہم نے دیکھا، ان لوگوں میں سے ایک لوہے کا ایک ٹین چہار دیواری کے پاس پٹک گیا تھا۔ ٹین میں مٹی کا تیل ہے، یہ ہمیں جلدی ہی پتا لگ گیا تھا، کیونکہ اس کی گندھ تیزی سے چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

اس ٹین کو ہم لوگ بہت دیر تک گھورتے رہے تھے، بلکہ جب دروازہ ان تختوں سے پوری طرح بند ہو گیا تو بھی ہم لوگ سناٹے میں آئے دیر تک کھڑے رہے تھے۔

دراصل بنا کچھ بولے ہم لوگوں میں سے ہر کسی نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم لوگوں کے باہر نکلنے کا راستہ پوری طرح بند ہو جانے کے بعد وہ لوگ ٹین کا یہ تیل چاروں طرف چھڑک کر ایک بار پھر آگ لگا دیں گے۔ دروازے کے قریب کھڑے لگ بھگ سبھی لوگوں نے یہ تصور کیا ہوگا، کیونکہ تھوڑی دیر میں اس بدبو کے اور بڑھتے ہی وہاں ایک ہلچل ہوئی۔ سبھی لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔

میں نے تصور کیا کہ اس طرح آگ لگا دیے جانے پر مجھے کیا کرنا ہوگا۔

م نسیم کا مکان میں نے کبھی اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ کیا اس میں کوئی چور دروازہ بھی ہوگا؟ کیا چھت سے بچ نکلنے کا کوئی دروازہ بھی ہوگا؟

میں نے سوچا، اگر مٹی کا تیل دروازے سے اندر نہیں آتا تو اندر تھوڑی دیر زندہ رہنے کا موقع ضرور ملے گا۔

لوگ دہشت کے پہلے دھکے میں پیچھے ہٹے ضرور، لیکن پھر ٹھٹک گئے تھے۔ ایک تو اس لیے

بھی کہ پیچھے ہٹ سکنے کی زیادہ گنجائش نہیں تھی اور کچھ اس لیے بھی کہ اب تک جو کچھ ہو چکا تھا، اس نے ہمارے ڈر کو بھی کسی قدر تھکا دیا تھا۔ بہت زیادہ لمبے محسوس ہونے والے کچھ منٹوں کے بعد ہی ہمیں پتا لگا کہ صورتِ حال کچھ اور تھی۔ آس پاس کہیں بھی روشنی نہیں تھی اور وہ لوگ کہیں سے مٹی کے تیل کی لالٹینیں لے آئے تھے۔

باہر کسی کی آواز بھی سنائی دی تھی، ''اب اتنے بڑے مکان میں آٹھ لالٹینوں سے کیا ہوگا؟''

کسی نے دور سے جواب دیا، ''اتنی ہی ملی ہیں۔ اور جگہ بھی تو ضرورت ہے۔''

''سالے اتنی بڑی تعداد میں سوَر بھرے ہیں اس میں۔''

''کوئی حرامزادہ ٹانگ بھی باہر نکالے تو کاٹ کر پھینک دینا،'' دوسرے نے اس طرح کہا جیسے اپنے ساتھیوں سے زیادہ ہمیں سنانا چاہ رہا ہو۔ ''ویسے صبح تک اور انتظام ہو جائے گا، اس وقت کام چلا لو۔''

''کام تو چل ہی جائے گا،'' پہلا پھر بولا۔ ''یہ لالٹینیں بھی نہ ہوتیں تو بھی کام چلا لیتے۔ تیندوے کی آنکھیں ہیں، اندھیرے میں بھی دیکھ لیں گے۔''

کوئی تیسرا تھوڑی اور دور سے ایک فحش ہنسی ہنس کر بولا، ''ان حرامیوں کو تو ہم سونگھ کر بھی جان لیتے ہیں۔ سیکولر سالا دور سے ہی مُسلّے کی ڈاڑھی کی طرح مہکتا ہے۔''

اس بات پر باہر بہت سے لوگ ہنسے، پھر انھیں میں سے کسی نے ٹکڑا لگایا، ''ڈاڑھی! کہاں کی ڈاڑھی؟''

اس پر بھی وہ لوگ اس طرح ہنسے جیسے کوئی بہت ہی عمدہ قسم کا مذاق کیا گیا ہو۔

اب تک اتنا کچھ ہو چکا تھا کہ لفظ ہمیں تکلیف پہنچانے میں بالکل ہی ناکام ہو رہے تھے، بلکہ اس بیچ چونکہ ہمیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ فی الحال ہمیں زندہ جلانے نہیں جا رہے تھے، اس لیے ہمارا گھبراہوتا تناؤ پھر تھم گیا تھا۔

اتنی عجیب سی جیل میں ہمیں کب تک رہنا ہوگا؟

لالٹینیں جلتے وقت تک کافی شور ہوتا رہا، پھر یکا یک وہ تھم گیا جیسے کسی نے کوئی حکم دیا ہو۔

کچھ دیر قدموں کی دھمک سنائی دیتی رہی، پھر کوئی اونچی آواز میں بولا، ''پہرے میں کوئی

Scanned with CamScanner

ڈھیل نہ آنے پائے۔"

اس کے بعد ایک عجیب قسم کی پرارتھنا انھوں نے شروع کر دی۔ پتا نہیں کہاں سے ایسے وقتوں کے لیے ان لوگوں نے نہ صرف پرارتھنا لکھی تھی، بلکہ اس کی دھن بھی یاد کر رکھی تھی۔ گو کہ وہ پرارتھنا کسی فلم کے گانے کی نقل تھی، پر اس کے بول الگ تھے۔

تھوڑی دیر میں ہمیں یہ احساس ہو گیا کہ وہ پرارتھنا صرف م نسیم کی عمارت میں نہیں گائی جا رہی تھی بلکہ وہ لوگ شہر میں جہاں کہیں بھی تھے، یہی پرارتھنا دہرا رہے تھے۔ پرارتھنا کے بعد انھوں نے اپنے وہ پانچ عہد بھی دہرائے جن کا کسی وقت ہم لوگ خاصا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اس پرارتھنا اور عہد سے ہم پر ایک اثر ضرور ہوا۔ انھیں سن کر ہمارے اندر ان کے لیے جو نفرت پیدا ہوئی اس نے ہمارے صدمے کو تھوڑا کم کر دیا اور اس جلی ہوئی اندھیری اور تنگ جگہ میں ہم ایک ٹھکانا کھوجنے لگے۔

اصل بھیڑ کا احساس ہمیں اب ہوا تھا۔

آدمی کی ایک عجیب عادت ہوتی ہے۔ چاہے جس حال میں بھی وہ کیوں نہ ہو، ایک ایسا ٹھکانا سب سے پہلے کھوجتا ہے جسے وہ اپنا مان سکے، بھلے ہی اسے اپنا کہنے یا ماننے کی اس کے پاس کوئی وجہ نہ ہو۔ یہ کام وہ سب سے پہلے کرتا ہے۔ عام حالات میں تو لوگ اس کا تجربہ کرتے ہی ہیں مگر غیر معمولی حالات میں یہ میلان نہ صرف زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ایک طرح کا سفاک تشدد بھی آ جاتا ہے۔

گلی محلوں میں رہنے والے لوگوں میں تو یہ میلان بہت عام ہوتا ہے۔ اکثر وہ یہ بھی برداشت نہیں کرتے کہ آپ کی بیوی ان کی طرف کی منڈیر پر اپنا تولیہ پھیلا دے۔ عوامی تحریکوں تک میں یہ مسابقت میں نے دیکھی ہے۔

ایک بار ہم لوگ بمبئی جا رہے تھے۔ مرکز کی کانگریسی سرکار نے بڑی مقدار میں گیہوں برآمد کر دیا تھا۔ ہم لوگ اس برآمد کے خلاف بندرگاہوں پر دھرنا دینے جا رہے تھے۔ ریل گاڑی بمبئی کے اسٹیشن پر تقریباً گیارہ بجے رات کو پہنچی۔ ہمارے پورے جتھے کو چوپاٹی نام کی جگہ پہنچ کر رات بتانی تھی۔

ٹھہرنے کی اس جگہ کو دیکھ کر ہم گھبرا گئے۔ بالو کے اوپر کافی دوری تک تمبو تان دیے گئے تھے۔ بالو کے اوپرنا کافی سی دریاں ڈال دی گئی تھیں جو نیچے کی بالو سے اٹی پڑی تھیں۔ جولوگ پہلے پہنچ گئے تھے، انھوں نے اپنے اپنے بستر کھول لیے تھے۔

بری طرح تھکے ہونے کے باوجود ایک متوقع صاف دری کے سرے پر جگہ پانے کے لیے آنند موہن سراؤگی اپنی بوڑھی عمر لیے تیزی سے لپکے۔ ایسا کرنے میں ان کی ایک چپل الجھ کر پیچھے چھوٹ گئی۔ اپنا بستر اور تھیلا چنی ہوئی جگہ رکھ کر وہ چپل کے لیے واپس لوٹے۔ چپل جلدی نہیں ملی۔ پیچھے آرہے لوگوں کے پیروں سے دب کر وہ بالو میں چھپ گئی تھی۔

چپل جھاڑتے ہوئے جب سراؤگی واپس لوٹے تو انھوں نے پایا کہ ان کا تھیلا اور بستر تھوڑا سا کھسکا کر ہٹا کتا چرن گوسائیں اپنی چادر بچھا رہا تھا۔

آنند موہن سراؤگی اس پر بری طرح ناراض ہوئے۔ زبردستی انھوں نے گوسائیں کی چادر کو جھٹکا دے کر کھینچ لیا۔

جہاں چادر بچھی تھی اس جگہ کے مقابلے میں اس کے پاس کی جگہ کوئی خاص بری نہیں تھی، بلکہ دونوں جگہیں ایک سی ہی تھیں۔ دونوں ہی جگہ دھول اور بالو میں جسم کو لتھڑنا تھا اور دونوں ہی جگہ گزرنے والوں کے پیروں کی ٹھوکر لگنی ہی تھی۔ مگر ایک تصوراتی بہتری کا اندازہ لگا کر پہلی جگہ سے قبضہ کوئی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ بلکہ واپسی میں جب ہم لوگ حق جتانے کے اس موہ کا مذاق اُڑا رہے تھے تو سراؤگی نے بہت جھینپ کر بتایا کہ اس جگہ قبضہ پا جانے کے بعد وہ رات بھر پیشاب روکے لیٹے رہے تھے، کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ ان کے اٹھتے ہی گوسائیں پھر اسی جگہ آجائے گا۔

اندھیرا چونکہ بہت زیادہ تھا، اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم میں سے کس کے پاس لیٹنے کے لیے بہتر جگہ تھی۔ لیٹتے لیٹتے باہر سے ''ہوشیار، خبردار'' کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ شاید وہ لوگ گھوم گھوم کر پہرہ دے رہے تھے۔

داہنے ہاتھ کی کہنی پر چونکہ بہت زیادہ چوٹ تھی، اس لیے میں بائیں کروٹ سویا۔ چت لیٹنے پر پیر کسی دوسرے سے جا ٹکرائے تھے۔ کنپٹی فرش پر ٹکاتے ہی جلی ہوئی چیزوں کی بدبو زیادہ نزدیک سے محسوس ہوئی تھی۔

Scanned with CamScanner

آگ بجھ جانے کے بعد جلی ہوئی چیزوں میں ایک عجیب بو آتی ہے۔ بو بہت دیر تک جلائے جانے کا اُلاہنا دیتی رہی۔ پتا نہیں کہاں کیا جل کر گرا ہوگا، جو اس وقت میری کنپٹی سے سٹا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ کی کہنی اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں تکلیف نہ ہوتی تو شاید میں چہرے کے پاس سے وہ کوڑا ہٹانے کی کوشش کرتا۔

یہ عجیب بات تھی کہ ہم میں سے ہر کوئی بہت زیادہ خاموش تھا۔ صرف جگہ بنا کر لیٹنے کی کوشش کی آواز یا کسی کی کھانسی کو چھوڑ کر وہاں سناٹا تھا۔

گہرے اندھیرے میں بھیڑ بھی ہو تو بھی آدمی کافی تنہا ہو جاتا ہے، بشرطے کہ سب چپ ہوں۔ اس خاموشی میں سب سے پہلے مجھے بیوی کا خیال آیا۔

جس وقت وہ لوگ مجھے گھسیٹ کر دھکے دیتے ہوئے باہر لا رہے تھے، وہ ان سے چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا ممکن نہیں ہوا۔

وہ لوگ تعداد میں کافی تھے۔ رات کے اندھیرے میں اور وہ بھی اتنے تیز حملے میں انھیں گن پانا ممکن بھی نہیں تھا۔

حالانکہ ہمیں کئی دن سے لگ رہا تھا کہ ان لوگوں کی طرف سے کوئی ایسا حملہ ہوگا، پر ہمیں یہ نہیں پتا تھا کہ اچانک اس طرح سب کچھ ہوگا۔ کچھ دنوں سے دو تین موٹر سائیکلوں پر کچھ لوگ ادھر سے اس طرح گزرتے تھے گویا میرے گھر کی ٹوہ لے رہے ہوں۔ ان میں سے بہت تندرست اور مضبوط ایک آدمی سادھوؤں کی طرح پیلے کپڑے پہنے ہوتا تھا۔

اس کے بعد جب ایک دن میں اپنے کتے کو گھمانے نکلا، میں نے دیکھا، باہر کے پھاٹک کے دونوں کھمبوں پر گیرو میں ڈبائے ہوئے ہاتھ کے پنجے چھپے تھے۔

اس کے ٹھیک اگلی صبح گھر پر بھاری پتھراؤ ہوا تھا۔ پتھراؤ سے بیوی بری طرح گھائل ہوئی تھی۔ اس کے سر سے ٹپکا خون بہت دنوں تک چہار دیواری کے اندر کے فرش پر چھترایا رہا تھا اور ہمارے کتوں نے باہر نکلتے ہی اسے سونگھنا شروع کر دیا تھا۔

اس طرح گھائل ہونے میں کافی کچھ غلطی میری بیوی کی ہی تھی۔ میں اس وقت سب سے پچھلے کمرے میں سو رہا تھا۔ نیند میں ہی میں نے سنا، وہ کہہ رہی تھی، ”جلدی اٹھیے، میرا سر پھٹ گیا ہے۔“

جاگنے پر بھی دو پل میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ جو شلوار قمیص اس نے پہن رکھی تھی، اس کا کافی حصہ تازے خون سے بھیگا ہوا تھا اور خون سے سنے دو پٹے کو اس نے سر کے اوپر دبا رکھا تھا۔

دراصل بہت صبح ان لوگوں نے گھر پر پتھراؤ کیا تھا۔ کتے بہت زور سے بھونکنے لگے تھے۔ بیوی نے دروازہ کھول کر دیکھنا چاہا کہ بات کیا ہے۔ اس بیچ ذرا سی درز سے ہی اس کا پیارا چھوٹا کتا باہر نکل گیا۔ اسے وہ دروازے سے باہر کبھی نہیں جانے دیتی تھی، کیونکہ ایک تو وہ کچھ بھوندو قسم کا تھا اور دوسرے بالوں کی وجہ سے اس کی آنکھیں پوری طرح ڈھکی رہتی تھیں۔ ایک بار سڑک پر نکل جانے کے بعد اس کا لوٹ پانا مشکل ہو جاتا۔

جیسے ہی کتے کو پکڑنے کے لیے وہ دروازے سے باہر آئی، پھینکی گئی اینٹ کا ٹکڑا اس کے سر سے ٹکرایا۔ کتے کو پکڑتے پکڑتے وہ خون میں لت پت ہو چکی تھی۔

مجھے جلے ہوئے کوڑے پر لیٹے لیٹے لگا، اس میں ایک عجب طرح کی ہمت ہے۔ یقیناً ان لوگوں نے اسے بھی پکڑا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے لڑی ہو۔ وہ لڑ سکتی تھی۔ کسی بھی قیمت پر سنگھرش کر سکتی تھی۔ جس بدتمیزی سے وہ لوگ عورتوں کے ساتھ پیش آتے تھے اسے دیکھتے ہوئے ان کی متشدد بھیڑ کے سامنے بھی وہ دبنے والی نہیں تھی، یہ میں جانتا ہوں؛ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کے نہ دبنے سے متشدد بھیڑ زیادہ جارح ہو گئی ہوگی۔

پتھراؤ والے واقعے کو قریب ایک سال ہو چکا تھا۔ یا کچھ زیادہ ہی۔ ان دنوں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور اس کی ساتھی جماعتیں ایک عجیب تحریک چلا رہی تھیں، جسے وہ 'للکار' کہتی تھیں۔ ایک جھنڈ بنا کر وہ لوگ نکلتے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں تو پیلے رنگ کی جھنڈیاں ہوتی تھیں، لیکن باقی ہاکیاں یا ڈنڈے لیے ہوتے تھے۔ کسی بھی گلی محلے سے گزرتے ہوئے وہ بری طرح شور کرتے تھے۔ کسی مسلمان کا مکان دیکھ کر وہ اس کے دروازے پر ہاکیاں پٹکتے تھے، جس سے ایک دہشت پھیل جاتی تھی۔

ان لوگوں کا نشانہ مسلمان تو ہوتے ہی تھے، وہ ہندو بھی اسی طرح دہشت زدہ کیے جاتے تھے جن کے بارے میں انھیں پتا ہوتا تھا کہ وہ 'للکار' والوں سے متفق نہیں ہیں۔ کئی بار اپنی نفرت دکھانے کے لیے وہ ان کے دروازوں پر تھوکتے تھے یا کھلے عام پیشاب کر دیتے تھے۔

Scanned with CamScanner

ایک بار ایسی ہی حرکت کرنے پر آمادہ لڑکوں کو بیوی نے بری طرح ڈانٹا تھا، بلکہ غصے میں اس نے بڑے والے کتے کو ان پر چھوڑ دینے کی دھمکی بھی دے ڈالی تھی۔

لڑکے بے شرمی کے ساتھ ہنستے اور چلّاتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

بیوی کے ساتھ ہوئے اس حادثے کے بعد ایک شام میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ پانچ لمبے تڑنگے نوجوان دکھائی دیے۔ وہ شاید اسی لمحے گھنٹی بجانے والے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی ان میں سے ایک تھوڑی تلخ آواز میں بولا، ''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''مگر، ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ آپ لوگ پھر کبھی آئیں،'' میں نے کہا۔

آدھا قدم اور آگے بڑھ کر انھوں نے کہا، ''ہمیں ابھی بات کرنی ہے۔''

''کیا بات کرنی ہے؟''

تھوڑا سا پیچھے کھڑا نوجوان آگے آیا۔ ''کل آپ نے جو چھپوایا ہے، ہمیں اس کے بارے میں بات کرنی ہے۔''

کمرے میں آ کر ان میں سے صرف دو ہی بیٹھے، باقی آس پاس کھڑے رہے اور لگ بھگ ایک ساتھ غصہ ظاہر کرتے رہے۔ وہ بے حد ہیجان میں تھے اور کوئی بھی دلیل قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ کو پتا ہے آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟'' اچانک میری بیوی وہاں آ کھڑی ہوئی۔ ''یہ کوئی بات چیت کا طریقہ ہے؟ اتنے بڑے آدمی سے اس طرح بات کی جاتی ہے؟ بڑے بڑے لوگ ان کے پیر چھوتے ہیں۔''

میری اہمیت کے بارے میں کبھی کبھی میری بیوی ایسا کچھ کہنے لگ جاتی تھی کہ مجھے بھی تعجب ہو آئے، مگر حیران کن بات تھی کہ ان نوجوانوں کی آواز میں اتنی تیزی نہیں رہ گئی تھی۔

بیٹھے ہوئے نوجوان بھی کھڑے ہو گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے دھمکی بھی دی۔ صاف تو نہیں، پر انھوں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ اگر میں نے اپنے خیالات نہیں بدلے تو وہ بم سے اڑا دیں گے۔

ان کی اس دھمکی نے نہیں، بلکہ اس بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا کہ وہ کوئی بھی دلیل سننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ان پڑھ نہیں تھے، پر ایسے لوگ اب اکثر مل جاتے تھے جو دستانوں میں بنالی

Scanned with CamScanner

گئی کٹھ پتلیوں کی طرح عمل کرتے تھے۔ کسی بھی دلیل کو وہ رد کر دیتے تھے۔ کسی بھی سوال کا ایک ہی جواب ان کے پاس ہوتا تھا: ''آپ لوگ ہندو مخالف ہیں۔''

صرف اپنے دبنگ سبھاؤ کی وجہ سے ان لوگوں پر میری بیوی کے حاوی ہو جانے کا ایک قصہ بہت دلچسپ ہے۔

ایودھیا میں شام تک بابری مسجد پوری طرح مسمار ہو چکی تھی۔ ہندوستانی میڈیا پر اس وقت کسی غیر ملک میں کھیلا جا رہا کوئی کرکٹ میچ نشر کیا جا رہا تھا۔ ہمیں مسجد مسمار ہونے کی خبر برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن سے ملی۔ اوروں کو بھی وہیں سے خبر ملی ہوگی۔

ہمارے مکان سے تھوڑے فاصلے پر ایک مکان میں کسی نے 'ست سنگ بھون' کی بڑی سی تختی لگا کر مذہبی تقریروں کا اہتمام شروع کر دیا تھا۔ صبح شام لاؤڈ سپیکر بہت تیز آواز میں کھول کر بے حد بے سری آواز میں کیرتن گائے جاتے تھے یا پھر غلط تلفظ کے ساتھ بڑے جوش سے دھرم گرنتھوں کا پاٹھ ہوتا تھا۔

بابری مسجد ٹوٹنے پر وہاں کیرتن بند ہو گیا اور وہ سارے لوگ سڑک پر نکل کر دیر تک نعرے لگاتے رہے تھے۔

اسی بیچ لگاتار کئی فون آئے۔ فون پر کچھ لوگ لمبی بات چیت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک طرح کی مایوسی بھی۔ تبھی میں نے سنا، میری بیوی باہر کسی سے اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

پچھلے حادثوں سے اندیشے بڑھ چکے تھے۔ فون بیچ میں ہی رکھ کر میں باہر کی طرف لپکا۔

باہر کی چہار دیواری پر چڑھے دو لڑکے ہاتھوں میں پیلی جھنڈیاں لیے ہوئے تھے۔ ایک نیچے کھڑا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر دیوار پر لگی اس پیتل کی چھڑی پر جھنڈی باندھنا چاہتے تھے جس میں بجلی کا بلب لگا ہوا تھا۔

بیوی زور زور سے بول رہی تھی، ''نیچے اترو۔ چلو، نیچے جاؤ۔ کس سے پوچھ کر چڑھے ہو؟ اسی طرح گھر میں چوریاں ہوتی ہیں۔ اس دن تم لوگ کیلے کا گچھا چپ چاپ کاٹ کر لے گئے۔ کتنی چیزیں گھر میں پڑی رہتی ہیں۔ ایک ہتھوڑی غائب ہے۔ کہاں چلی گئی آخر؟''

Scanned with CamScanner

مذہبی جنونیت کو ایسا داؤ لگا کر میں بھی پٹخنی نہیں دے سکتا تھا۔

سکتے میں آئے لڑکے کچھ بھنبھنائے۔ نیچے کھڑے لڑکے نے کہا، ''اتر آؤ۔''

وہ لوگ نیچے اتر آئے اور پلٹ پلٹ کر ہمیں گھورتے اور بڑبڑاتے ایک طرف چلے گئے۔

بیوی نے ایک عجیب وغریب ہتھیار کا استعمال کیا تھا — چوری، وہ بھی کیلے کے گچھے کی اور ایک عدد معمولی سی ہتھوڑی کی۔ شاید چوری کے اس سچے الزام سے ہی وہ لاجواب ہوئے ہوں گے۔ ڈکیتی کے الزام سے وہ اشتعال میں آ سکتے تھے، اور شاید جواب بھی دیتے۔

گہرے تناؤ کے باوجود مجھے ہنسی آ گئی، ''یار، یہ گھٹیا سی ہتھوڑی کی چوری!''

''آپ نہیں جانتے، یہ چور ہوتے ہیں۔ اور پھر ہتھوڑی کام کے وقت نہ ملے تو کتنی پریشانی ہوتی ہے۔'' کہہ کر وہ اندر آ گئی۔ میرے مکان پر فتح کا جھنڈا نہیں لہرایا جا سکا تو صرف اس وجہ سے کہ ایک عدد ہتھوڑی کہیں گم ہو گئی تھی!

لیکن اس بار صورت حال ویسی نہیں تھی۔ میں مانتا ہوں کہ اس بار حملہ کرنے والوں کو نہ تو کیلوں اور ہتھوڑی کی چوری پست کر سکتی تھی نہ میرے اتنے اہم شخص ہونے کا میری بیوی کا اعلان۔

انتہائی غصے میں وہ کس حد تک آگے جا سکتی ہے، میں اس کا تصور کرنے لگا۔ کیا کسی چیز سے اس نے حملہ کیا ہوگا؟ مگر کس چیز سے؟ ہمارے سونے کے کمرے میں کوئی چیز ایسی مشکل ہی سے ملتی جس سے چوٹ کی جا سکے۔ ہتھیار کے نام پر ہمارے گھر میں صرف باورچی خانے کا سامان ہی تھا۔

بہت پہلے اپنے پتا کی یادگار کے طور پر ان کے کچھ اوزار اٹھا لایا تھا۔ ہتھیار کے طور پر وہ خاصے ازمنۂ وسطیٰ کے تھے۔ مثلاً دو بھالے، ایک زنگ لگی کٹار، ایک کھانڈا نما ہتھیار اور طبلے۔ طبلے ایک مرتبہ منڈھوانے کے لیے دیے اور بھول گیا تھا۔ باقی اوزار سجانے لائق تھے نہیں، اس لیے اِدھر اُدھر پڑے زنگ کھاتے رہے اور مکان کی ہر پٹائی کے بعد ان میں سے کوئی نہ کوئی غائب ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہمارے یہاں کوئی ڈنڈے جیسی چیز بھی نہیں بچی۔ بھالے کافی دن احتیاط سے لپیٹے رکھے رہے، پھر وہ بھی جانے کہاں غائب ہو گئے۔

اوزار ہوتے تو بھی ان کا کوئی استعمال ہم لوگ کر پاتے، اس کا تصور مشکل تھا۔ اوزاروں کے بارے میں اپنے پتا کی جانکاری اور مہارت سے تھوڑا بہت میں بھی آشنا تھا، پر ان کی طرح ہتھیاروں

کے استعمال میں ماہر کبھی نہیں ہو پایا۔ وہ تو شِواجی والے بگھنکھے سے لے کر لکھنؤ کے بانکے استادوں والی بانک تک کبھی کا استعمال جانتے تھے۔ کچھ دن، جب میں بہت چھوٹا تھا، انھوں نے محلے کے کچھ نوجوانوں کو ہتھیار چلانا سکھایا بھی تھا۔ وہ پورے قواعد کے ساتھ ہتھیاروں کا استعمال سکھاتے تھے اور ایک، دو، تین، چار بولتے جاتے تھے۔ مجھے بھی چاقو، بھالا، تلوار، لاٹھی وغیرہ چلانا کچھ دن سکھایا تھا، لیکن بعد میں چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ میں بہت پڑھ لکھ کر یونیورسٹی کی ڈگریاں لوں اور وکیل یا جج بن جاؤں۔

یہ بھی حیران کن بات ہے کہ ان دنوں اور آج کے حالات میں کافی کچھ یکسانیت تھی۔ یہی نہیں، اگر آج میرے پتا زندہ ہوتے تو یقیناً کہیں نہیں بگھنکھا لے کر مسلمانوں اور ہم جیسے لوگوں کے دروازوں پر دہشت پیدا کر رہے ہوتے۔

پتا کے اوزار گھر سے غائب ہو جانے کے بعد اکثر ہم فکرمند رہا کرتے کہ اگر اچانک چور آ گئے تو ہم کیا کریں گے؟

ایک بار پڑوس میں چوری ہو جانے کے بعد ہمیں لگا تھا کہ اپنی حفاظت کا کوئی انتظام ضرور کرنا چاہیے۔ چوروں سے حفاظت کا بندوبست ایک شام ہم نے بہت ہی شاندار طریقے سے کیا۔ پورے برآمدے میں فرش سے کوئی تین فٹ اونچائی پر ہم نے تانبے کا ایک تار جڑ دیا۔ میں سوتے وقت اس تار میں کرنٹ دوڑا دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ چور اس تار سے چپک کر مر جائے گا۔

دورات وہ تار وہاں لگا رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ہٹا دیا تھا، کیونکہ اس تار سے ایسی حالت میں مجھے بھی زبردست خطرہ تھا، جب میں کرنٹ بند کیے بنا خود اس سے ٹکرا جاؤں۔

میں بہت دیر تک لیٹے لیٹے یہ سوچتا رہا کہ میری بیوی نے اس حملے کے وقت کیا کیا ہوگا؟ حملہ آور اس بار ویسے نہیں تھے جو ہتھوڑی یا کیلے کی چوری کا الزام سن کر شرمندہ ہو جاتے۔

چھ دسمبر کو بابری مسجد ٹوٹنے کے بعد ملک کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرتے وقت ہندو دھرم اندھوں کی جو تصویر مجھے ملی تھی وہ خاصی ہی ڈراونی تھی۔ ایک جگہ تو انھوں نے باقاعدہ کچھ عورتوں کے سارے کپڑے اتار لینے کے بعد انھیں پیٹتے ہوئے سڑکوں پر دوڑایا تھا اور بڑے اطمینان سے اس منظر کی فلم بھی تیار کی تھی۔

Scanned with CamScanner

باہر شاید پانی برسنا شروع ہو گیا تھا۔ وہاں بند کیے گئے لوگوں میں سے کچھ تازی ہوا کے لیے برآمدوں میں لیٹ گئے ہوں گے۔ اب چونکہ پانی برسنے لگا تھا اس لیے وہ دوسروں کو کھسکاتے ہوئے پیچھے کھسک رہے تھے۔

بارش کی وجہ سے دھیان بٹ گیا۔ میں یہ امید بھی کرنے لگا کہ پانی تھوڑا زیادہ برسنے پر گرمی سے کچھ راحت ملے گی۔ یہ سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔ اور تب میں نے ایک بار پھر وہی خواب دیکھا جسے میں نہ جانے کتنے برسوں سے دیکھتا آ رہا تھا۔ یہ خواب سال دو سال میں ضرور دکھائی دیتا رہا ہے۔ کبھی کبھی کچھ جلدی بھی۔

خواب لگ بھگ اپنے مکمل بھیانک انجام تک دکھائی دیتا رہا ہے۔ یہ اتنا حقیقی ہوتا ہے کہ جاگ جانے کے بعد بھی جیسے چھاتی پر بیٹھا رہتا ہے، کبھی کبھی تو کئی دن تک۔

خواب ختم ہو جانے پر ایسا لگتا ہے جیسے ایک بہت لمبا زہریلا سانپ سرکتا ہوا گردن کے اوپر سے نکل گیا ہو۔ نیند ٹوٹ جانے پر بھی دیر تک ہلنے کی خواہش نہیں ہوتی۔

ٹھیک ہمیشہ کی طرح خواب مجھے مَن، لیکن جاگا ہوا چھوڑ کر میری گردن سے سرکتا ہوا نکل گیا۔ وہ سانپ کا لمس، اس کا ٹھنڈا خوف اور اس کی خاموش گھٹن میں پوری طرح آنکھ کھولے پڑا ہوا دیر تک محسوس کرتا رہا۔

اندھیرا کچھ کم ہو گیا تھا اور باہر سے ان لوگوں میں سے ایک بہت اونچی آواز میں اس سُرتال سے منتر پڑھنے لگا جیسے اذان دے رہا ہو۔ ایسے ڈھنگ سے منتر پاٹھ میں نے زندگی میں پہلی بار سنا۔ اذان کی یہ نقل ختم ہونے کے بعد رات والی پرارتھنا پھر دہرائی جانے لگی۔

اب تک میری نیند پوری طرح ٹوٹ چکی تھی، مگر زیادہ تر لوگ مجھ سے پہلے ہی جاگ چکے تھے۔ وجہ کچھ دیر سے ہی پتا چلی۔ دراصل ہر کوئی صبح کی حاجت کے لیے فکر مند تھا۔ اس بڑی عمارت میں سات غسل خانوں میں ایک ساتھ صرف سات لوگ ہی فارغ ہو سکتے تھے۔ یہ غنیمت ہے کہ ہم میں سے ہر کسی کا دھیان ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر بٹ گیا۔ اس مکان کے ہر کمرے، ہر کونے میں پھیلے جس کالے ملبے میں لوٹ کر ہم لوگوں نے رات بتائی تھی اس نے ہم سب پر بری طرح کالک پوت دی تھی۔ اگر ہم لوگ ہل ڈل نہ رہے ہوتے تو ہم لوگوں کی حالت ایسی ہو چکی تھی جیسے ہم لوگ جلی

لکڑیوں کا ڈھیر ہوں۔ تکلیف اور دہشت کے اس ماحول میں بھی ہم لوگوں میں سے بہت سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسے۔

اس جلے مکان کی لابی کے سامنے جس صدر دروازے پر تختے جڑ دیے گئے تھے، وہاں کسی کی اونچی آواز سنائی دی: ''ارے مورکھو، منتر شُدھ تو پڑھو! مورکھ ان پڑھو، ارے منتر بھی شدھ نہیں پڑھ سکتے تم لوگ!''

تبھی ایک تھوڑی دبی ہوئی آواز آئی، ''چھوڑیے بھی مہاشے جی، ہمیں کیا کرنا — شدھ منتر پاٹھ کریں یا نہ کریں۔''

''ارے واہ، کوئی بات ہوتی ہے!'' روکنے والے نے آواز اور اونچی کر دی۔ ''ان کو منتروں کے بگاڑنے کا حق دیا کس نے؟ جاہلو، بند کرو یہ منتر پاٹھ کا تماشا۔''

باہر کا وہ منتر پاٹھ اس آواز سے نہیں، پر تھوڑی دیر میں خود ہی بند ہو گیا۔ اور تبھی باہر کوئی دہاڑتی آواز میں بولا: ''یہ کون سالا بکواس کر رہا ہے؟''

آواز دبا کر بولنے والے نے پھر کہا، ''چھوڑیے بھی مہاشے جی! آیئے ادھر آیئے۔ کرنے دیجیے جو کرتے ہیں۔''

باہر سے وہی دہاڑتی آواز پھر سنائی دی: ''تھوڑا ٹھہر جاؤ، تمھاری یہ نندا (نکتہ چینی) تمھارے حلق میں نہ گھسیڑ دی ہو تو ہم کاہے کے...''

آواز دبا کر بولنے والا اشدھ منتر پاٹھ پر تنقید کرنے والے مہاشے جی کو شاید اندر کی طرف گھسیٹ رہا تھا۔ ''چلیے، چلیے۔ میں کہتا ہوں، کیوں ان لوگوں کے منہ لگتے ہیں، چلیے۔''

کچھ دوسری بھی آوازیں آئیں۔ ''جانے دیجیے مہاشے جی!''

کچھ دشواری سے لوگ جنھیں لابی سے برآمدے میں لائے، انھیں ان کے اوپر لپٹی کالک کے باوجود میں پہچان گیا۔ وہ مہاشے سدانند شاستری تھے، شہر کی آریہ سماج نام کی تنظیم کے سیکرٹری۔ مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے: ''ارے بھائی صاحب، آپ بھی؟''

''یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے تھا آپ سے۔ آپ یہاں کیسے؟''

اچانک شاستری جی ہنسے۔ ''کمال دیکھیے بھائی صاحب، کالک ہم لوگوں پر پتی ہے، اور وہ

بدمعاش جو شدھ منتر پاٹھ نہیں کر سکتے، صاف دھلے گھوم رہے ہیں۔''

اس بات پر ایک دو اور لوگ بھی ایک پھیکی سی ہنسی ہنسے، پر جو صاحب انھیں گھسیٹ کر لا رہے تھے، وہ خاصے گمبھیر ہو گئے۔ جو حالات تھے انھیں دیکھتے ہوئے لوگ کسی ہلکی بات کے لیے جگہ بنانے کو تیار نہیں تھے۔ وہاں زیادہ تر لوگ پانی یا غسل خانے جیسی چیزوں کو لے کر پریشان تھے۔ انھی ضرورتوں تک وہ محدود بھی رہنا چاہتے تھے، پر یہی مسئلہ سب سے زیادہ خوفناک ہوا۔ نلوں میں آنے والے جس پانی کی وجہ سے وہ بے فکر تھے وہ جلدی ہی ختم ہو گیا اور تب لوگوں کو لگا کہ جنھوں نے اس کا استعمال نہانے کے لیے کیا تھا انھوں نے اپنے جوش میں باقی سب کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ابھی کافی لوگ فارغ ہونے کے انتظار میں تھے۔ تکلف کے باعث انھیں حاجت کے لیے پہل کرنے میں تھوڑا لحاظ ہوا تھا، پر پانی ختم ہونے کے اعلان پر وہ لحاظ یکایک ختم ہو گیا۔ پاخانے میں جھانک کر بدبو کے کارن پیچھے ہٹ آئے کسی نے اونچی جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا، ''آخر ابھی نہانا کون سا ضروری ہو گیا تھا، ایں؟''

جو نہا چکے تھے وہ دھیرے سے کھلے آنگن کی طرف جا کھڑے ہوئے۔ وہاں ایک شور اٹھ کھڑا ہوا۔ کئی لوگ غصہ ظاہر کرنے لگے۔

تبھی ایک آواز آئی، ''دیکھیے، اب جو ہوا سو ہوا۔ سوال یہ ہے کہ پانی کا مسئلہ حل ہو تو کیسے؟''

''یہ اچھی رہی۔ جب یہاں ایسے عقلمند لوگ موجود ہیں جو حالات جانتے ہوئے بھی پانی نہانے میں خرچ کرنے کی عیاشی نہیں بھولتے تو مسئلے کا حل کیا ہو گا؟'' کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

پہلا شخص ہی پھر بولا، ''حل نکلے گا کیوں نہیں؟ جنھوں نے ہمیں یہاں اس طرح قید کیا ہے ان کی بھی تو کوئی ذمے داری ہے۔''

اس بیچ کسی نے رفع حاجت کا حل نکال لیا۔ اسے اپنی کھوج پر آرشمیدس سے کم خوشی نہیں ہوئی۔ جب تک لوگ اس حل کو سمجھ پائے وہ بے حد جوشیلا شخص کچھ کھوجنے لگا۔ وہاں کسی کا بھی نام جاننے کی کسی کو نہ فرصت تھی نہ ضرورت، پر اس آدمی کو بہت لوگ پہچاننے لگے تھے۔ جب تب وہ کسی کو بھی پکڑ لیتا تھا اور سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کی بیوی اور بچیوں پر بڑا ظلم ڈھایا گیا۔ یہ وہی شخص تھا۔ جلدی ہی اسے باغبانی کا ایک اوزار مل گیا۔ آنگن کے دو طرف اونچی دیوار سے لگی کافی چوڑی

کیاریاں تھیں، جن میں کچھ جھلسے ہوئے پودے لگے تھے۔ دیوار پر چڑھی بیلیں بھی خاصی جل چکی تھیں۔ وہ آدمی کچی زمین کھودنے لگا۔ کھودتے ہوئے بولا، ''کھڈی کی طرح استعمال کرو اور اسی مٹی سے ڈھک دو، بات ختم۔ کچی زمین بہت کافی ہے۔ اب سہنا تو پڑے گا ہی۔ کیا بتاؤں، میری بیوی اور بچوں کے ساتھ جو ہوا...''

نہانے کی وجہ سے بھڑکا جھگڑا ایک تھم گیا۔ لوگ پر جوش ہو کر اس آدمی کو دیکھنے لگے۔

تبھی کسی نے کہا، ''کھڈی تو ٹھیک ہے، پر پانی کا کیا ہوگا؟''

ایک بار پھر وہاں سناٹا ہو گیا۔

یہاں مشکلیں صرف اتنی ہی نہیں تھیں بلکہ یہ شروعات تھی۔ شاید بہت معمولی شروعات۔ ہم میں سے بہت سے لوگ بات کرتے تھے کہ اگر اُن کا راج آ گیا تو سب سے پہلے ہم پر چوٹ کی جائے گی۔ جس طرح ہمارے گھروں پر حملہ ہوا تھا، ہم سمجھ رہے تھے کہ آگے کے واقعات اسی کے آس پاس کے ہوں گے، یعنی دھکا مکی، کچھ پٹائی، گالیاں اور بے عزت کرنے کے کچھ دوسرے طریقے اپنائے جائیں گے اور پھر شاید ان لوگوں کا دل بھر جائے۔ ویسے بہت سے لوگوں کو تو یہ سب کچھ ہونے کی بھی توقع نہیں تھی۔ مہاشے جی جیسے لوگ باقاعدہ کہتے تھے کہ حکومت میں آنے کے بعد حکمرانی کی آسائشوں میں یہ لوگ اتنے مشغول ہو جائیں گے کہ یہ سب انھیں یاد بھی نہیں رہ جائے گا۔

پر یہ سب شاید انھیں یاد رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ یاد رکھا ان لوگوں نے جن کی طرف سے وہ حکومت میں آئے تھے۔ جو سرکار چلا رہے تھے، وہ سچ مچ اس معاملے میں بڑے معصوم تھے۔ انھوں نے فوراً بیان بھی دے دیا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ ان کے ایجنڈے میں نہیں تھا۔ لیکن پارٹی نے کہا کہ اس کے ایجنڈے میں یہ سب ہے اور بھرپور ہے۔ پہلے دور میں ان لوگوں نے کچھ ادارے اپنے ہاتھ میں لے لیے، جیسے ریڈیو، ٹی وی، یونیورسٹیاں، اکادمیاں وغیرہ۔ ان میں مار پیٹ یا زور زبردستی کوئی نہیں ہوئی، بس وہ جگہیں پارٹی کے لوگوں نے لے لیں۔ بڑے 'انکسار' سے۔ اس پر ہم لوگوں نے خاصی بڑی تکرار کی۔ کچھ مظاہرے ہوئے، دھرنے دیے گئے، بھاشن ہوئے۔ بہت جگہ بہت سے لوگوں نے اس صورت حال کے خلاف لکھا بھی۔

اور پھر یکایک اندھیرا ہو گیا۔ اخباروں میں اس طرح کا کچھ بھی چھپنا بند ہو گیا۔ اس کے

ساتھ ہی سڑکوں، گلیوں، محلوں میں ایک خاص طرح کی ہلچل شروع ہوگئی۔ کچھ لڑکوں کا گروہ کسی بھی محلے سے خاصی اونچی آواز میں ٹھہاکے لگاتا ہوا گزرجاتا۔ چوراہوں پر اونچی آواز والے لاؤڈ سپیکر لگ گئے تھے۔ ان پر یکا یک بھجن شروع ہوتا اور مذہبی نعرے لگنے لگتے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ آوازیں کہاں سے آتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی گھبرائے اکیلے شخص کو گھیر کر لڑکے کچھ دیر تک شور غل کرتے تھے اور پھر اس کی لنگی یا پاجامہ اتروا لیتے تھے۔ اس کے ننگے ہو جانے پر شور مچاتے ہوئے وہ اسے وہاں سے دوڑا دیتے تھے۔ یہ ایک طرح کی کوشش تھی کہ کوئی جوابی کارروائی ہو۔ وہ ہوئی۔ کسی نے اس طرح گھرنے کے پہلے ہی ان لڑکوں کی طرف ایک سستا سا ہتھ گولہ اچھال دیا۔

یہ تھا وہ واقعہ جس کا انھیں انتظار تھا۔ چھت سے ہم لوگوں نے کئی روز دیکھا، رات کے گہرے نیلے آسمان پر تھوڑی دیر جیسے کالک سی پُت جاتی تھی اور پھر کالک کے بیچ سے سرخ، پیلی روشنی ابھر آتی تھی۔ گھر اسی طرح جلتے تھے۔ ظاہر ہے، نسیم صاحب کا مکان بھی ایسے ہی جلا ہوگا۔

ہر کسی کو امید تھی کہ اس قید میں دیر سے ہی سہی، وہ لوگ پانی اور کھانے کا کچھ انتظام ضرور کریں گے، پر ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آیا۔ بہت زیادہ گرمی اور ٹھہری ہوئی ہوا سے بے حال لوگوں نے دیکھا، دوپہر کے بعد آسمان پر بادل آئے اور ٹھہر گئے۔ ہمیں لگا، شاید بارش ہو۔ گرمی سے راحت تو ملتی ہی، شاید وہ بارش کا پانی کسی طرح پینے کے کام بھی آجاتا۔ پر بادل جوں کے توں ٹھہرے رہے، جیسے کسی کھانے کی چیز پر پھپھوند جم گئی ہو، چکنی زہریلی۔

یونیورسٹی کے پروفیسروں کے لیڈر موہن لال نے پھر وہی بات دہرائی، ''ہم جنگی قیدی ہیں آخر۔ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیسے کیا جاسکتا ہے؟''

صبح سے وہ بہت بار یہ بات دہرا چکے تھے۔ سب جانتے تھے کہ جو ہو رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ پر اس پر احتجاج کیا جائے تو کیسے، اس بات کا فیصلہ ابھی کوئی نہیں کر پایا تھا۔

دھندلکا ہونے لگا تھا اور اندر تک ابال دینے والی اُمس بھری گرمی کو گھیر کر کھڑی ہوا بالکل ساکت ہوگئی تھی۔ بھوک اور پیاس سے پریشان لوگ ایک بار پھر بیٹھ جانے یا لیٹ جانے کے لیے جگہ کھوجنے لگے، لیکن ایک دوسرے سے بچتے ہوئے۔ لگ بھگ سب لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ وہ لوگ جنگی قیدی تو نہیں ہی ہیں۔ اس سناٹے میں ایک آواز ابھری، ''لعنت ہے! شرم کی بات ہے! ہم لوگ

Scanned with CamScanner

اس طرح یہاں بھیڑ بکریوں کی طرح بند کر دیے گئے ہیں۔ ارے کچھ تو کر سکتے تھے ہم لوگ، کچھ ہاتھ پیر تو چلا سکتے تھے۔''

یہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر منی سنگھ تھے، پر ان کی اس آواز میں ایک عجیب کھوکھلا پن تھا۔ لوگوں نے بغیر کسی ردعمل کے یہ بات سن لی۔ صرف مہاشے جی نے دھیرے سے چہرہ گھما کر صدر دروازے پر جڑے تختوں کی طرف دیکھا، جیسے انھیں اُس پار سے کسی ردعمل کی امید ہو۔ پر باہر سے کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ اور اب میں نے غور کیا، وہاں بھی بالکل سناٹا تھا۔ شام کی وہ پرارتھنا بھی نہیں سنائی دی تھی۔ کیا اب اس کے بعد ویسے ہی ٹھہا کے سنائی دیں گے جیسے پچھلے دنوں ہم لوگ سنتے تھے؟ گلی یا سڑک شام سے ہی خاموش ہو جایا کرتی تھی اور پھر اندھیرا بڑھ جانے پر بہت سے لوگ بے حد گھناؤنی، لگ بھگ بھوت پریتوں والی ہنسی ہنستے ہوئے گزر جاتے تھے۔ ہر دروازے اور کھڑکی کی درزوں سے ایک سنسنی خاموش گھروں کے اندر دیر تک گھستی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں پر میری بیوی جان بوجھ کر تھوڑا پیر پٹک کر چلتی تھی اور کوئی برتن زور سے آواز کرتے ہوئے رکھتی تھی تا کہ اپنی طرف سے مجھے تھوڑی تسلی دے دے۔

اچانک مجھے اس کی یاد آگئی۔ کہاں، کس حالت میں ہوگی وہ؟ عورتوں کے ساتھ ان لوگوں کی بربریت کے بہت سے قصے سن چکا تھا۔ جس غیر انسانی طریقے سے ان لوگوں نے ہمارے گھروں پر حملہ کیا تھا، اسے دیکھتے ہوئے ان سے کسی طرح کی انسانیت کی امید تو نہیں ہی کی جا سکتی تھی۔ پر کیا ہوا ہوگا اس کا؟ کیا اسے بھی اسی طرح رکھا گیا ہوگا؟

باہر کی خاموشی کو ایک خوفناک شدت سے توڑتا ہوا نعرہ کسی ایک آدمی کی آواز میں سنائی پڑا: ''وندے ماترم!'' اس کے جواب میں کئی آوازیں آئیں: ''وندے ماترم!'' بابری مسجد کے خلاف مہم کے ساتھ یہ نعرہ بڑے پیمانے پر لگنے لگا تھا، کیونکہ جس کتاب آنند مٹھ سے ان لوگوں نے یہ نعرہ سیکھا تھا، وہاں اسے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

اس نعرے کے بعد عمارت کے اندر کی سیاہی جیسے چمگادڑوں کے گروہ کی طرح اڑی اور گہری ہوتی رات کے کندھوں پر جہاں تہاں لٹک گئی۔ ایک لمحے کے لیے لوگوں کے خون کے بہاؤ میں ایک اچھال آیا اور ہم لوگوں نے سنا، باہر کوئی کڑکتی آواز میں حکم دے رہا تھا، ویسا حکم جو ان لوگوں کی صبح کی

Scanned with CamScanner

قواعد میں دیا جاتا تھا۔ایک ساتھ کئی لوگوں کے پیر پٹک کرتے تال سے چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ساری آوازیں بند ہو گئیں۔اس سناٹے میں دور سے کوئی ٹرک جیسا آتا سنائی دیا۔وہ شاید وہیں آرہا تھا۔عمارت کے قریب آکر تھوڑی دیر وہ ٹرک غراتا رہا، پھر بتیاں بھی بند ہو گئیں اور انجن بھی۔

اندر اندھیرے میں کسی نے کہا،'' لگتا ہے یہ لوگ ہم لوگوں کو کہیں اور لے جانے کی تیاری میں ہیں۔'' اس بات کو لوگوں نے خاموشی سے سنا۔تبھی کچھ لوگ دوڑتے ہوئے اس دروازے تک آئے جس سے ہمیں اندر ٹھونسا گیا تھا اور بعد میں کیلوں سے مضبوط تختے جڑ دیے گئے تھے۔لوہے کی کوئی وزنی چیز ڈھکیل کر وہاں اڑادی گئی اور بیلچوں سے تختے اکھاڑے جانے لگے۔کسی نے چیخ کر کہا،'' باہر نکالتے وقت یہ بدمعاش کوئی غلط حرکت نہ کرنے پائیں، دھیان رکھنا۔''

تھوڑی دور سے کوئی اور آواز آئی،'' دو دو کر کے لائے جائیں گے۔''

کئی روز سے گلی محلوں کے سناٹے کو روندتی عفریتی ہنسی کی طرح ہی اس ہلچل نے ہماری نسوں میں ایک سنسنی بھر دی۔ تختے جلدی ہی اکھڑ گئے، پر سارے نہیں۔ نیچے سے کچھ تختے اکھاڑنے کے بعد وہ وزنی لوہے کی چیز ڈھکیل کر وہاں اڑادی گئی۔دراصل وہ لوہے کی جنگلے دار ایسی مضبوط دیوار تھی جسے پولیس سڑکوں پر رکاوٹ کے لیے رکھ دیتی تھی۔باہر سے کسی نے چیخ کر کہا،'' ایک ایک کر کے باہر آؤ۔دو لوگ۔''

اندر لوگ سناٹے میں آئے کھڑے رہے۔تختے اکھڑنے سے بنی جگہ پر اڑی روک کے بیچ سے باہر کی ہلکی سی جھلک ملتی تھی۔باہر کئی لوگ مشعلیں لیے کھڑے تھے۔ٹرک کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ضرور تھوڑا ہٹ کر کھڑا کیا گیا ہوگا۔

'' ہم کہہ رہے ہیں، ایک ایک کر کے باہر آؤ۔'' کسی نے پھر کہا۔

تھوڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ مہاشے جی نے اونچی آواز میں کہا،'' لیکن کیوں؟''

'' ہم لوگ تمھیں رہا کرنے جا رہے ہیں۔''

یہ بات کسی کو بھی قابلِ یقین نہیں لگی۔

'' تو اس طرح باہر نکالنے کا کیا مطلب ہے؟'' پروفیسر منی سنگھ نے ہم لوگوں سے کہا۔ان کی

Scanned with CamScanner

آواز شاید باہر والوں نے بھی سنی۔ باہر آنے کے لیے للکارنے والا بولا،''ہم لوگ کچھ لکھا پڑھی کریں گے، پھر چلے جانا جہاں مرضی آئے۔''

''لیکن اس وقت؟''

''ہاں اسی وقت،'' باہر سے کسی نے ہنسی دبا کر کہا۔''چلو اب چپ چاپ باہر آ جاؤ۔''

اندھیرے میں اندر خاموش کھڑے لوگوں میں سے کوئی بولا،''چلو نا، کھڑے کیوں ہو؟''

وہ آدمی لوگوں کو ہٹا کر دروازے کے کھلے حصے کی طرف جانے لگا۔ تبھی پیچھے سے مہاشے جی چیخے،''خبردار! کوئی باہر نہیں جائے گا۔ کوئی نہیں نکلے گا۔''

''جب وہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ اور پھر یہاں کب تک رہیں گے؟'' دروازے کے پاس سے ایک اور آواز آئی۔

''نہیں، بالکل نہیں، خبردار!'' شاید مہاشے جی ہی تھے جو لوگوں کو دھکیلتے ہوئے دروازے تک گئے اور پلٹ کر کھڑے ہو گئے۔''میں جانتا ہوں، تم لوگ نہیں جانتے۔ دھوکا دیا جا رہا ہے تم لوگوں کو۔ میں کہتا ہوں، کوئی باہر نہیں جائے گا۔''

باہر کہیں دور سے کسی نے للکارا،''پنڈت، ذرا دیکھنا تو، کون ہے۔'' جسے پنڈت سے مخاطب کیا گیا تھا، شاید وہی بولا،''ابھی دیکھتا ہوں اس چوہے کو۔ ذرا روشنی اندر دکھانا۔''

دو تین لوگ مشعلیں دروازے کے کھلے حصے کے پاس لے آئے۔ اسی وقت جھک کر ایک بہت لحیم شحیم آدمی اندر وارد ہوا۔ اس کے اندر گھسنے پر دروازے کی طرف مڑ کر پیٹھ کیے مہاشے جی دھکا کھا کر سامنے کھڑے لوگوں سے ٹکرائے۔ پیچھے مڑ کر دھکیلنے والے کو دیکھ کر وہ بولے،''یہ کیا ہے؟''

''اچھا تو تم ہو! تمھاری تو...''

لوگوں کے دیکھتے دیکھتے اس گرانڈیل آدمی نے مہاشے جی کو اٹھایا اور کسی کھل گئے بستر بند کی طرح انھیں دروازے کے کھلے حصے سے باہر اچھال دیا۔

باہر کچھ آوازیں آئیں،''مارو سالے کو!''

وہ گرانڈیل آدمی اپنے ننگے بدن پر جنیؤ سنبھالتا ہوا بھیڑ کی طرف گھور کر بولا،''تم لوگوں کو بھی دیکھتا ہوں۔''

Scanned with CamScanner

تبھی اس بھیڑ میں ہلچل ہوئی۔ جس شخص نے کچی زمین میں گڑھے بنا کر حاجت کے مسئلے کو حل کرنے کی ترکیب بجھائی تھی، وہ جیسے لوگوں کے اوپر تیرتا ہوا آیا اور ''مارو!'' کی آواز کے ساتھ اس نے زمین کھودنے میں استعمال کی گئی چیز سیدھے اس گرانڈیل آدمی کے پیٹ میں دھنسا دی۔ وہ جھاڑیوں کو کترنے والی ایک بھاری بھرکم قینچی تھی۔ قینچی اس پہلوان نما آدمی نے دونوں ہاتھ سے پکڑی اور لگا اسے کھینچ کر باہر نکالنے۔ پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بے حد دہشت زدہ نگاہیں جھکا کر اس نے اپنے پیٹ میں دھنسی بڑی قینچی کی دونوں موٹھیں دیکھیں اور گھٹنے کے بل بیٹھ گیا۔ اس کا منھ تھوڑا سا پھیل گیا، پر آواز کوئی نہیں نکلی۔ اس کے بہت آہستہ سے ایک طرف لڑھک جانے کے بعد سب سے پہلے باہر کھڑے مشعل والے چیخے۔

کسی نے کہا نہیں، پر راکھ سے کالے ہوئے ہر شخص نے سمجھ لیا کہ فیصلہ کن لڑائی شروع ہو چکی ہے۔

❁❁

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

جنگ

''ابھی نہیں آئے!'' شوہر نے کھڑکی سے الگ ہٹتے ہوئے اکتا کر کہا۔ بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ اپنے بالوں کو سنوارتی رہی، گویا کوئی مہمان آنے والا ہو۔ بال سنوار چکنے کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں کو احتیاط سے رنگا اور انگلی میں بچا ہوا رنگ اپنے نرم گالوں پر رگڑنے لگی۔ شوہر اکتا کر پھر اسی کھڑکی پر جا کھڑا ہوا۔ ایک بار اس نے جھانک کر باہر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن دور کہیں زوردار دھماکا ہوا اور اس نے گردن کھڑکی کے اندر کر لی۔ بیوی ہنس پڑی۔ شوہر نے ہنسی سنی لیکن اندر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

''آئیں گے ضرور!'' بیوی نے اسے جیسے تسلی دی۔ شوہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آئیں گے ہی، جب سارے شہر کے لوگ کہہ رہے ہیں تو صحیح ہوگا۔ شہر خالی بھی ہو چکا ہے۔ جنھیں بھاگنے کا موقع نہیں ملا وہ کہیں نہ کہیں چھپنے کی کوشش میں تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اب چھپنا بیکار تھا۔ بھاگنا بھی بیکار ہی تھا۔

اچانک ایک ساتھ کئی دھماکے ہوئے اور کمرے کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر نیچے آ رہا۔ شوہر کھڑکی سے الگ ہوا اور ایک کرسی پر پیر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

کیا اتنے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے ہیں لوگ؟ ایک دھماکا اور ہوا اور اس مرتبہ اس کا سارا مکان ہل گیا۔ کمرے میں بری طرح دھول بھر گئی۔ اس قدر دھول بھر گئی کہ اسے دیر تک کچھ دکھائی نہ

Scanned with CamScanner

دیا۔ وہ خود کرسی سے نیچے آ گرا تھا۔ دھیرے دھیرے اٹھ کر اس نے دھول جھاڑی اور کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ اس کی بیوی اسی طرح آئینہ ہاتھ میں لیے اپنا چہرہ سنوار رہی تھی۔ شوہر نے اُدھر سے نگاہ ہٹا لی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو، اس طرح وہ باہر کی طرف بھاگا۔ تھوڑی دیر میں وہ لوٹا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ جب اِدھر سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا رہا ہے تو پھر وہ لوگ اس طرح گولہ باری کیوں کر رہے ہیں؟''

وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھا۔

''ان کی مرضی،'' بیوی نے لاپروائی سے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ صرف یہ بتانے کے لیے ہی گولے چلا رہے ہوں کہ وہ آ رہے ہیں۔ آخر وہ یہاں باجے بجاتے ہوئے تو نہیں آ سکتے!''

''لیکن پھر وہ آتے کیوں نہیں؟'' شوہر نے چڑ کر کہا۔

''شاید وہ بہت چپ چاپ، دھیرے دھیرے آ رہے ہوں، یا پھر ڈر کر آگے بڑھ رہے ہوں۔''

کئی گھنٹے انتظار کے بعد باہر کی طرف کچھ آہٹیں ہوئیں۔ ''وہ آ گئے!'' شوہر نے کہا۔

اس بار اس نے دیکھا کہ بیوی کے جسم میں ایک عجیب کپکپی ہوئی جیسے کسی نے اس کی پیٹھ پر پنجے گاڑ دیے ہوں۔ میک اپ کے نیچے اس کے چہرے کی کھال جیسے سفید پڑ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا، لیکن کہہ نہ سکی۔ وہ کمزوری لگنے لگی اور پھر دھیرے سے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔

''کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟'' شوہر نے پوچھا۔

''نہیں!'' بیوی نے کہا لیکن فوراً ہی اس کے پیلے چہرے پر ایک کھنچاؤ کی کیفیت طاری ہوئی اور ایک ہاتھ سے پیٹ مروڑتے ہوئے اس نے فرش کی دھول پر قے کر دی۔ اس کے بعد وہ تھوڑا سنبھلی، چہرے کا پیلا پن بھی کم ہو گیا۔

شوہر نے اٹھ کر وہاں جہاں قے کی گئی تھی، دروازے کے پاس کی مٹی ڈال دی۔ مٹی ڈال کر وہ پلٹا ہی تھا کہ دروازے پر ایک ساتھ کئی سائے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔ شوہر لمحے بھر کے لیے ساکت ہو گیا، لیکن پھر دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف کھسکنے لگا۔ کمرے کے منظر کی عادی ہوتی آنکھوں نے اب بیوی کو بھی دیکھ لیا۔ باوردی لوگوں میں سے ایک

Scanned with CamScanner

بڑے جوش وخروش سے چیخا۔ سامنے والے آدمی نے سخت آنکھوں سے چیخنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

سامنے والا آدمی تھوڑا سا آگے آیا اور شوہر سے بولا، ''ڈرنے یا بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ میں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اگر ہماری مدد تم نے اچھی طرح کی تو ہم تمھیں کچھ انعام بھی دیں گے۔''

اسی درمیان پیچھے کے کچھ فوجیوں میں ہلچل ہوئی۔ شاید اور زیادہ لوگ آ گئے تھے۔

''بیبی، عورت! عورت!'' وہ چلائے۔

بیوی تھوڑی گھبرائی، لیکن پھر سنبھل گئی۔ سدھی آواز میں سامنے والے افسر جیسے آدمی سے بولی، ''یہ لوگ تمھارے ہی سپاہی ہیں؟''

''ہاں!'' افسر نے جواب دیا۔

''تم انھیں ڈسپلن میں نہیں رکھ سکتے؟'' وہ بولی۔

فوجی جیسے غصے میں بھرے آگے لپکے۔ سامنے کے دو تین سپاہیوں نے موٹی سی گالی بھی دی۔ افسر اچانک ان کی طرف گھوما اور انھیں اپنے کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا۔

فوجیوں میں وحشیانہ فطرت جاگی۔ وہ ایک ساتھ چلائے، ''یہ لوٹ کا مال ہے، ہم اسے لیں گے!''

''باہر نکل جاؤ!'' افسر دہاڑا۔

فوجی دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتے ہوئے باہر نکل گئے۔ باہر پہنچ کر کسی نے افسر اور اس عورت کو بھونڈی سی گالی دی۔ کھسیانا افسر غصے میں باہر نکلا، لیکن جب تک وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ افسر اس عورت کی طرف لوٹا، اور اب اسے اچانک یہ لگا کہ وہ ایک فاتح فوجی افسر ہے اور کمرے میں کوئی عورت ہے۔ عورت کی طرف اس نے دھیان سے دیکھا۔ عورت کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ ڈر بھی نہیں تھا وہاں، ذلت اور شرمندگی بھی نہیں تھی۔ صرف ایک جذبات سے عاری چہرہ تھا، سپاٹ۔ اس بیچ پلکیں بھی جھپکتی نہیں دکھائی دیں اسے۔ عورت کے سنورے ہوئے بالوں پر گرد کی ایک تہہ جم گئی تھی، کپڑوں پر بھی گرد تھی، پھر بھی عورت کم خوبصورت نہیں تھی۔

افسر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کپڑوں کی گرد

Scanned with CamScanner

جھاڑنی شروع کردی۔ عورت کے چہرے سے لے کر اس کے جسم تک کہیں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ افسر ٹھہر گیا۔ پھر ایک بار اس نے بالوں کی گرد کو پھونک مار کر اڑایا۔ گرد اس کی آنکھوں میں بھر گئی۔ آنکھیں ملتا ہوا وہ الگ ہٹ گیا۔ اب اس کی نگاہ عورت کے شوہر پر پڑی۔

''گدھے، میری صورت کیا دیکھ رہا ہے؟ گھر میں کھانے کا جو سامان ہے، لے کر آ!'' وہ اس کے شوہر پر گرجا۔ شوہر تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ تبھی اس نے پھر کہا، ''اور دیکھو، بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ سارے شہر میں میری فوج ہے، گولی ماردی جائے گی۔ اور ہاں، کھانے کے بارے میں زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔''

شوہر حکم لے کر پھر اُدھر ہی لوٹ چلا۔ اس کے جاتے ہی جیسے وہ مورت کی طرح کھڑی عورت ہلی۔ افسر نے دیکھا اسے ہلتے۔ وہ اور زیادہ ہلی اور پھر اچانک باہر کی طرف بھاگی۔ پلک جھپکتے ہی وہ اس کی طرف جھپٹا اور اسے کمر سے اس طرح پکڑ لیا گویا کسی بھاگتی ہوئی ناگن کو پکڑ لیا ہو۔ عورت نے بل کھایا اور اس نے ٹھیک کسی ناگن کی طرح ہی اس کی کلائی میں اپنے دانت گڑا دیے۔ افسر کی بانہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ لیکن اس نے عورت کی کمر پر ایک گھونسا مارا۔ عورت چیخی نہیں، کراہی بھی نہیں، بلکہ اس نے دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے اس کے چہرے کو کھرونچ دیا۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔ جلد ہی لمبے چوڑے افسر نے اسے قابو میں کرلیا۔ عورت ہانپتی رہی اور تیکھی نگاہوں سے افسر کو گھورتی رہی۔ افسر طنزیہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ ابھی سمٹی بھی نہیں تھی کہ عورت نے اس پر تھوک دیا۔ ٹھیک چہرے پر، ناک کے بیچوں بیچ۔ بہت سا تھوک افسر کے چہرے پر چپک گیا اور عورت ہنسنے لگی۔

افسر نے تھوک کو پونچھا نہیں، جوں کا توں رہنے دیا۔ عورت کے ہانپنے سے اور ہاتھ پیچھے کی طرف جکڑے ہونے کی وجہ سے اس کی چھاتیوں کا ابھار افسر کو اور وحشی بنا گیا۔ تبھی اس نے اپنا ہاتھ آزاد کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے عورت کے بدن کے کپڑے نوچ دیے۔ سامنے کی طرف کے نچے کپڑوں سے اس کی بھری ہوئی سفید چھاتیاں دکھائی دینے لگیں — کانپتی ہوئی۔ وہ ایک ایک کر اس کے کپڑے اس طرح چیرتا گیا جیسے اس کی کھال اتار رہا ہو۔ ایک ایک دھجی اس نے چیر کر الگ پھینک دی اور پھر جذبات سے مغلوب ہاتھوں سے بھینچ کر اس کے ہونٹوں پر بے تحاشا پیار کرنے لگا جس میں غصے کا عنصر بھی شامل تھا۔ اس کے بعد عورت نے دوبارہ اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ افسر آپے سے

باہر تھا۔ اس نے عورت کو اٹھالیا اور قریب ہی کرسی کی طرف بڑھا۔

کرسی پر بیٹھے افسر کے سینے سے چپکی عورت کی ادھ کھلی آنکھوں میں پیچھے کے دروازے سے ایک سایہ ابھرا۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ عورت نے آنکھیں بند کر لیں۔ شوہر کے دونوں ہاتھوں میں پلیٹیں تھیں۔ تھوڑی دیر تک وہ وہیں دروازہ پر ٹھٹکا کھڑا رہا۔

افسر نے عورت کے ننگے بدن کو دو تین بار زور زور سے بھینچنے کے بعد جھٹکے سے الگ کیا اور نیچے لڑھکا دیا۔ گری ہوئی عورت دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھ گئی —— وہیں، فرش پر، جوں کی توں۔

شوہر پلیٹوں کے ساتھ اندر آ گیا۔ افسر نے اپنی اسٹین گن اٹھائی اور اپنی گود میں رکھ لی۔ اس کے بعد وہ پلیٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ کھاتا رہا، کسی بہت بھوکے وحشی جانور کی طرح، اور شوہر پانی کا گلاس لیے اس کے کھا چکنے کا انتظار کرتا رہا اور بیوی جوں کی توں، بے لباس، ان میں سے کسی کو بھی دیکھے بغیر دیکھتی رہی۔ افسر کھا چکنے کے بعد ابھی پانی پی ہی رہا تھا کہ دروازے پر پھر شور ابھرا۔ وہی تمام فوجی پھر آ دھمکے تھے۔

''باہر جاؤ!'' افسر چیخا۔

''سر...''

''سر...''

''ہمیں پورے شہر میں صرف چار عورتیں ملیں، جو اس قدر بوڑھی ہو چکی ہیں کہ کتا بھی انھیں نہ کھائے!'' ایک فوجی نے ہمت کر کے کہا۔

''آپ کا کام ہو چکا ہے، اس عورت کو ہم چاہتے ہیں!'' دوسرے نے پیچھے سے چلّا کر کہا۔

عورت اسی طرح، بغیر کسی جھجک کے، اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

اس کی بانہہ پکڑ کر افسر نے بیٹھاتے ہوئے کہا، ''میں کہہ رہا ہوں، یہاں سے چلے جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا!''

''سر!''

''سر، ہمیں یہ عورت دے دیجیے، ہم چلے جائیں گے۔''

افسر غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن وہ بول کچھ بھی نہیں سکا۔ پُتلی کی طرح خوبصورت وہ عورت

Scanned with CamScanner

دھیرے دھیرے اس بھیڑ کی طرف بڑھی۔ ان کے قریب جا کر وہ رکی۔ فوجی دو پل کے لیے خاموش، اس کے ننگے جسم کو دیکھتے رہے۔ پھر جیسے ان میں طوفان مچ گیا۔ وہ سارے کے سارے ایک ساتھ اس پر ٹوٹ پڑے۔ کتنی ہی بانہوں میں ہوتا ہوا عورت کا سنہرا، گلابی جسم ان کے بیچ کبھی اس طرح چمک جاتا تھا جیسے باڑھ کے گدلے پانی میں کسی بچے کا کھلونا ڈوبتا اُتراتا سا بہہ رہا ہو۔

افسر تھوڑی دیر بھیڑ کی بے باک ترنگیں دیکھتا رہا اور پھر اپنی اسٹین گن ہاتھ میں لے کر فوجیوں سے کتراتا ہوا باہر نکل گیا۔ بھیڑ میں دیر تک معلوم نہ ہو سکا کہ عورت کہاں ہے۔ شوہر چپ چاپ ایک طرف، دیوار سے کسی کاکروچ کی طرح چپکا کھڑا رہا۔ دھیرے دھیرے شور شرابا ختم ہونے لگا اور ایک ایک کر فوجی ایک کنارے آ کر اپنی پتلونیں باندھنے لگے۔ کسی کی نگاہ اس کے خوفزدہ شوہر کی طرف گئی۔ دیکھے جانے کے بعد کسی شک کی بنا پر وہ تیز قدم بڑھاتا اندر کے کمرے کی طرف بھاگ گیا۔

ایک اندھیرے کونے میں سمٹا ہوا وہ باہر کے کمرے کا شور شرابا سنتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد شور کم ہونے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب دو چار لوگ ہی وہاں ہوں۔ ان کی فحش گالیاں بھی اسے اب سنائی دے رہی تھیں۔ اور کچھ دیر بعد جیسے سبھی کچھ خاموش ہو گیا۔

تھوڑا سا ٹھہر کر وہ دھیرے دھیرے باہر کی طرف چلا، بہت چپ چاپ۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ بس فرش پر بیوی کا اُجلا جسم بکھرا ہوا تھا۔ وہ شاید بیہوش تھی۔ اس نے اس کے جسم کو ہلایا۔ بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک بار اس نے آس پاس دیکھا اور پھر اٹھنے لگی۔ شوہر نے سہارا دینا چاہا، لیکن اس نے سہارا نہیں لیا۔ کسی لکڑی کے جسم کی طرح وہ اٹھی اور کرسی پر آ بیٹھی۔ ساکت۔ مُن۔ شوہر نے اس کے جسم کو قریب سے ایک بار دیکھا اور پھر لپکتا ہوا اندر چلا گیا۔ اندر سے وہ ایک چادر اور ایک تولیہ لے آیا۔ دونوں چیزیں اس نے بیوی کی بانہوں میں ڈال دیں اور کھڑکی پر جا کھڑا ہوا۔

باہر بے حد ویرانی تھی۔ کہیں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کھڑکی کے باہر دیکھتے دیکھتے ہی جیسے وہ اپنے آپ سے، لیکن اونچی آواز میں بولا، ''کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ ابھی ہم لوگ چپ چاپ باہر نکل جائیں؟''

''کس لیے؟'' بیوی نے کہا۔

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

Scanned with CamScanner

شہر میں روشنی نہیں تھی۔ بیوی نے کپڑے پہن لیے تھے۔ شوہر تب سے اب تک اس کھڑکی سے ہٹا نہیں تھا۔ وہ ہٹا تب، جب اسے کمرے کے اندر بھاری بھاری بوٹوں کی روند سنائی دی۔

وہی افسر تھا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ کچھ ایسے آدمی تھے جو بالکل روبوٹ کی طرح کام کر رہے تھے۔ اور ان کے بھی پیچھے ایک آدمی تھا جس نے عام شہریوں جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ انھوں نے بڑے احترام سے عورت کا استقبال کیا۔ افسر انتہائی مہذب طریقے سے آگے آیا اور بولا، ''ہم آپ کو تھوڑی سی زحمت دینا چاہتے ہیں، اور ہمیں امید ہے کہ آپ ہمیں معاف کریں گی!''

افسر نے اپنے ساتھ کے اس شہری لباس والے شخص سے پوچھا، ''یہیں ٹھیک رہے گا یا باہر؟ باہر ابھی تھوڑی سی چاندنی ہے۔''

''باہر ہی بلا لیجیے،'' اس آدمی نے کہا۔

''آپ کو تکلیف تو ہوگی، لیکن آپ ذرا سی دیر کے لیے باہر آجائیے،'' افسر نے انکسار سے کہا۔

عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی کرسی ایک سپاہی نے اٹھالی اور اسے باہر لے آیا۔ دو کرسیاں اور آ گئیں۔ ایک پر عورت بیٹھ گئی اور باقی دونوں پر افسر اور وہ شہری لباس والا آدمی۔

افسر نے کہا، ''دیکھیے، میرے ساتھ یہ آئے ہیں، ہمارے یہاں کے ایک مشہور صحافی۔ یہ آپ کا بیان لینا چاہتے ہیں۔ اس بیان کو ہم دنیا کے تمام اخباروں میں چھپوائیں گے۔ ریڈیو سے بھی براڈ کاسٹ کرائیں گے۔ آپ کو صرف یہ بتانا ہے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں جو حکومت تھی وہ کتنی ظالم تھی اور اس نے آپ کے ساتھ کیا کیا ظلم کیا۔ اس میں آپ یہ بھی کہہ سکتی ہیں کہ یہاں کی پولیس نے آپ کے ساتھ زیادتی بھی کی۔''

''ہمیں کوئی بیان نہیں دینا ہے۔ آپ جو چاہیں اپنی طرف سے لکھ کر چھاپ دیجیے،'' عورت نے سیدھی آواز میں کہا۔

شہری لباس والا آدمی بھڑ اٹھا۔ بولا، ''دیکھو لڑکی، میں یہاں تمھارا مشورہ لینے نہیں آیا ہوں۔ فوج کا معاملہ ہے۔ زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی سی بات اگر تمھارے دماغ میں آجاتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ہم دوسرا راستہ اپنائیں گے۔''

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی، اس کے بعد دھیمی آواز میں عورت نے پوچھا، ''میں یہ بھی کہہ

Scanned with CamScanner

سکتی ہوں کہ تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟''

''نہیں، قطعی نہیں!''

ٹیپ ریکارڈر چلنے لگا۔ دھیرے دھیرے گھومتی چرخیوں کے پار دیکھتی ہوئی عورت بڑی احتیاط سے ایک ایک بات، جیسی کہی گئی تھی اسی طرح بولتی چلی گئی۔ طوطے کی طرح سبھی باتیں، ساری ہی باتیں اس نے کہیں۔ جو بھی ضروری تھا۔ آخر میں اس نے یہ اور جوڑ دیا کہ اس کے ساتھ دشمن کے ان سپاہیوں نے جتنا اچھا سلوک کیا اس کے لیے وہ ان کی شکر گذار ہے۔

ٹیپ ریکارڈر چلا گیا۔ اور لوگ بھی چلے گئے۔ صرف ایک پہریدار اسٹین گن لیے ان لوگوں سے تھوڑی دور کھڑا رہا۔ افسر عورت کے قریب آیا۔ عورت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ افسر نے مسکراہٹ کو ہونٹوں پر پھیلاتے ہوئے کہا، ''شکریہ!''

عورت بھی خفیف سا مسکرائی۔ پھر اس نے کہا، ''اب آپ جانا چاہیں گے، یا پھر میں یہاں سے جاؤں؟''

''میرا خیال ہے کہ ہم دونوں یہاں سے چلیں،'' افسر نے کہا اور عورت کی بانہہ پکڑ کر بڑے احترام سے مکان کی طرف چل پڑا۔

''وہ سو رہا ہے؟'' شوہر نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں، جاگ تو چکا ہے، لیکن تھکن اتار رہا ہے،'' بیوی نے کہا اور میز پر پیالے سجانے لگی۔

''تم کافی دیکھ لو، میں میز ٹھیک کرتا ہوں،'' شوہر نے کہا۔ لیکن بیوی اپنا کام کرتی رہی۔ شوہر وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دیر تک کوئی نہیں بولا۔ پھر نہ جانے کیسے شوہر اپنے آپ سے بول پڑا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہماری فوجیں ضرور واپس لوٹیں گی اور ہمیں آزاد کریں گی۔''

''کس سے آزاد کریں گی؟'' بیوی نے پوچھا۔

''اس بدقسمتی سے۔''

''کون سی بدقسمتی؟''

''یہی، ان دشمن فوجیوں کے ظلم کی بدقسمتی سے۔''

''اس میں ایسی کیا بات ہے جو ویسے نہیں ہوتی ہے؟ کون سا ایسا ناجائز کام کیا ہے ان لوگوں نے؟'' عورت نے ایک طنزیہ انداز میں کہا۔

''یہ تم کہہ رہی ہو؟ تم، جس کے ساتھ دشمنوں کی ایک پوری فوج نے زیادتی کی؟'' شوہر دکھ اور غصے کے ملے جلے احساس سے بولا۔

''زیادتی! لیکن انھوں نے ہمیں گولی تو نہیں ماری! زیادتی... زیادتی تم نہیں کرتے؟ بولو، تم نے نہیں کی زیادتی... ؟ اور اجڑے شہر میں کون نہیں کرتا یہ؟''

''تو تم سمجھتی ہو کہ یہ اچھا ہوا؟'' شوہر نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

''برا کیا ہوا؟ اس سے اچھا ہوتا کیا؟''

''چلو ٹھیک ہے۔ دیکھو شاید کافی بن گئی ہو،'' شوہر نے کہا، اور پھر جیسے بغیر کسی احتجاج کے بولا، ''آج بھی شاید وہ رہے گا۔ آج رات بھی وہ یہیں سوئے گا نا؟''

بیوی نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کر کافی لانے چلی گئی۔

شوہر جوں کا توں بیٹھا رہا۔ بیوی کافی کی کیتلی لے کر لوٹی۔ جانے کیوں، اس کے واپس آنے پر شوہر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ بیوی نہیں مسکرائی۔ وہ مایوس ہوا۔ سر جھکا کر بولا، ''میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں مسکرانا بھی کیوں نہیں چاہیے۔''

''کسی نے منع تو نہیں ہی کیا ہے! ہاں سنو، کل یہ فوجی یہاں سے اگلے شہر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ افسر بھی چلا جائے گا۔ پھر تو ہم شاید...''

دروازے پر افسر انگڑائی لیتا ہوا کھڑا دکھائی دیا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ افسر مسکرا کر بولا، ''گڈ مارننگ!''

بیوی مسکرائی۔ شوہر نے جواب میں سر ہلا دیا۔

افسر میز پر عورت کی قریب والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کافی اور ناشتے کے سامان کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا، ''دوست، میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں۔ یہ اچھا کھانا... اچھا... میرا مطلب ہے... آپ کی یہ خوبصورت بیوی... ہاں...''

اچانک اتنا بھیانک دھماکا ہوا کہ مکان ایک بار ہل گیا اور سامنے کے گرے ہوئے حصے کی بچی

کبھی دیوار بھی ڈھے گئی۔ افسر نے جھٹکے سے عورت کو کھینچ کر میز کے نیچے کر دیا۔ دھماکے رُکے نہیں۔ ایک پر ایک گولے آتے رہے اور ایسا لگنے لگا جیسے سموچے شہر کو روئی کی طرح دُھنا جا رہا ہو۔ افسر تیزی سے نکل کر بھاگا۔ شوہر ایک کونے میں بھُس بھرے جانور کی طرح ٹکا رہا اور بیوی میز کے نیچے چھپی رہی۔ ان کے مکان پر گولے نہیں آئے۔ لیکن نیچے کی پوری زمین اس طرح ہل رہی تھی گویا بار بار بھونچال آ رہا ہو۔ دھواں، بارود، دھول، اور دیواروں کے بیچ گھرے دو ساکت لوگ۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ کسی کو یہ نہیں پتا تھا کہ دھول کے اس اندھیرے میں دوسرا کیسا ہے۔ شاید سارے دن اسی طرح گولہ باری ہوتی رہی ہو، یا بیچ میں رک بھی گئی ہو۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ دونوں ہی تقریباً اس انتظار میں رہے کہ کوئی گولہ سیدھے انھی پر آئے گا اور ان کی دھجیاں اڑا دے گا۔ پر ایسا ہوا نہیں۔ ہاں، دھماکوں سے پیدا ہوا جمود... اور انتظار... کسی بھی واقعے کے انتظار سے ان کی پلکوں میں بھاری پن آیا اور پھر وہ دونوں سو گئے۔

اندھیرا بہت زیادہ تھا۔ ممکن ہے کہ دھویں اور دھول کی وجہ سے اتنا اندھیرا ہو، یا پھر رات ہی اتنی گھر آئی ہو۔ گولہ باری بالکل تھم چکی تھی۔ شوہر جاگ کر بالکل جوں کا توں بیٹھا رہا۔ پھر جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ رات ہو چکی ہے، لیکن وہ؟

کیا وہ افسر لوٹ آیا ہوگا؟ یا اس نیند کے بیچ کسی گولے نے اس کی جان لے لی ہوگی؟ وہ دھیرے دھیرے رینگا۔ اسے تھوڑی ہی دور رینگنا پڑا۔ اس کی ہتھیلیوں کے نیچے ایک گرم، ملائم جسم محسوس ہوا۔ وہی تھی۔ اسی کا جسم تھا۔ لیکن اس کے کپڑے؟ اس حالت میں تو نہیں تھی وہ، جب صبح گولہ باری شروع ہوئی تھی۔ کیا وہ افسر بھی یہیں تھا؟

وہ بیوی کے جسم کو چھوڑ کر اندھیرے میں ہی اور آگے تک کسی اور کا جسم ٹٹولنے لگا۔ پیچھے سے اسے ایک ہنسی سنائی دی۔ اس کی بیوی ہی ہنسی تھی۔

''کسے کھوج رہے ہو؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا، ''اس افسر کو؟''

''آں... ؟ نہیں، نہیں تو...''

''کوئی نہیں ہے یہاں۔ کوئی آیا بھی نہیں،'' بیوی نے اندھیرے میں اٹھتے ہوئے کہا۔ ''بات

یہ ہے کہ مجھے ڈر لگ رہا تھا اس گولہ باری سے۔ بہت ڈری ہوئی تھی۔ لیکن سنو، عجیب ہی بات ہے کہ جیسے ہی میں نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کیے، میرا ڈر بھی کم ہو گیا۔''

شوہر کو اب ڈر لگنے لگا تھا۔ وہ سرک کر بیوی کے قریب آ گیا۔ اس نے دبی آواز میں کہا، ''میرا خیال ہے کہ آج اب کوئی نہیں آئے گا۔ آج تو صرف...''

یکا یک باہر مشین گنوں سے گولیاں چلنے لگیں — بہت تیزی سے اور چاروں طرف سے۔ ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے گولے بھی پھٹ رہے تھے۔

''یہ صورت حال بہت ہی خطرناک ہے،'' شوہر نے کہا، ''جلدی کرو، ہم لوگ پیچھے کے کمرے کے تہہ خانے میں اتر چلتے ہیں۔ جلدی آؤ...''

بیوی ہنسی۔ ''میں جانتی ہوں، مجھے معلوم ہے۔ تم ڈر رہے ہو کہ شاید پھر موقع نہ ملے۔ خیر، تم بھی اپنے کپڑے اتار دو۔ ڈر نہیں لگے گا۔ اور پھر تہہ خانے میں چل کر لیٹتے ہیں۔''

شوہر نے ابھی کپڑے اتارنے کی کوشش ہی کی تھی کہ باہر آسمان پر اس طرح کی روشنی پھیلنے لگی جیسے ایک ساتھ بجلی چمک رہی ہو۔ اور پھر اسے لوگوں کا شور بھی سنائی دینے لگا۔

شوہر کے ہاتھ جہاں کے تہاں رک گئے۔ پھر وہ مایوس ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔

اس بار زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا انھیں۔ دشمن کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے ان کے اپنی طرف کے فوجی شہر میں آ پہنچے تھے۔ ایک ایک مکان کی کھڑکی اور دروازے پر مشین گنوں سے گولیاں مارتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک ایک مکان کے اندر سے دشمنوں کا صفایا کرنا تھا انھیں۔ مکانوں کے اندر فوجیوں کو بھوک بھی لگ آتی تھی، اور جو کچھ بھی ہاتھ آتا تھا اسے اپنے لیے چن لیتے تھے، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ انھیں کئی روز یہاں بتانے ہوں گے۔

اور تبھی انھیں ملے یہ بدقسمت لوگ۔ افسر کوئی بھی ساتھ نہیں تھا۔ تعداد ان کی بہت تھوڑی تھی۔ دشمنوں کا ڈر بھی تھا۔ اس لیے ان میں سے ایک آدمی دروازے کی طرف کھڑا ہو گیا اپنی اسٹین گن لے کر اور باقی جلدی جلدی اچانک، خلافِ امید مل گئی اس عورت پر ٹوٹ پڑے۔ کسی نے دھکا دے کر شوہر کو ایک طرف ڈھکیل دیا۔ ملبے کی وجہ سے لیٹنے یا بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ شاید فرصت بھی نہیں تھی۔

دیر تک یہ گرم ناچ ہوتا رہا اور پھر جیسے سبھی سہم کر تھم گئے، کیونکہ ان کا کوئی افسر آ چکا تھا۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں وہ آگے بڑھا۔ عورت کو گھیرے کھڑے ادھ ننگے لوگوں کو اس نے دونوں کہنیوں سے ایک طرف ڈھکیلا اور ہانپتی ہوئی ننگی عورت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دھیرے دھیرے لوگ باہر نکل گئے۔

صبح پھر وہیں اسی جگہ، ٹھیک اسی طرح، اس افسر کے ساتھ کچھ لوگ آئے — سادی پوشاک میں، کیمروں اور ٹیپ ریکارڈروں سے لدے پھندے۔ عورت نے ابھی کپڑے نہیں پہنے تھے۔ افسر کے اشارہ کرنے پر دو سپاہی اندر سے ایک چادر جیسی چیز لے آئے، جو اسے اڑھا دی گئی۔ وہ سر جھکا کر نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔ ایک ساتھ کیمرے کوندنے لگے۔ ایک پر ایک، جلدی جلدی، فوٹو لیے جانے لگے۔ ایک آدمی نے ریکارڈر کو چالو کر دیا۔ افسر بتا رہا تھا کہ جب وہ یہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ یہ بیہوش عورت باہر سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ دشمن نے اس کا مکان لوٹ لیا اور اس کے ساتھ زیادتی بھی کی ہے۔ ہم اسے اسپتال بھیج رہے ہیں۔

''اندازاً کتنے لوگوں نے زیادتی کی ہوگی؟'' کسی نے پوچھا

''کہا نہیں جا سکتا۔ میرا خیال ہے کم سے کم... یعنی بہت سے لوگ رہے ہوں گے۔ سینکڑوں بھی رہے ہو سکتے ہیں۔ آپ حالت دیکھیے ان کی...''

افسر نے کہا اور آگے بڑھ کر اس نے عورت کی جانگھوں پر سے چادر ہٹا دی۔ لالچی، وحشی نظروں سے بھیڑ آگے بڑھی اور پھر جیسے خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ چادر دوبارہ وہیں لوٹا دی گئی۔

اس کے بعد عورت کا بیان ریکارڈ کیا جانے لگا۔ صحافیوں میں سے کسی نے پوچھا، ''آپ کا نام؟''

عورت نے آہستہ سے نام بتایا۔ سن کوئی بھی نہیں سکا، لیکن دوبارہ نہیں ہی پوچھا گیا، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جو بولا گیا ہے وہ ریکارڈ ہو چکا ہوگا۔

بیان ریکارڈ کر لیا گیا اور لوگ بھی رخصت ہو گئے۔ پھر اس بھیانک ویرانی میں وہی دو بچ رہے۔

بہت لمبی خاموشی کے بعد کونے میں سمٹے شوہر نے آہستہ سے پوچھا: ''کیا تمھیں بہت تکلیف ہو رہی ہے؟ بہت درد ہے؟''

عورت بغیر کچھ بولے ہنسی۔ چند لمحوں بعد بولی: ''اس میں میرا کیا بگڑتا تھا کہ میں ایسا ظاہر کرتی گویا مجھے سخت چوٹیں آئی ہوں!''

دونوں پھر چپ ہو گئے۔ ایک وقفے کے بعد بیوی نے کہا: ''تمھاری خواہش تھی کہ ہم لوگ نیچے تہہ خانے میں لیٹیں، چاہو گے کیا؟''

''نہیں!''

''کیوں؟''

شوہر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیوی اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنی چادر اتار دی۔ شوہر نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں۔

''چلو... اٹھو...''

شوہر سر نیچے جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ بیوی گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ شوہر کے چہرے کو اس نے اپنی ہتھیلیوں میں بڑی آہستگی کے ساتھ تھام کر اوپر اٹھایا۔ کافی دیر کے بعد ہی شوہر کی آنکھیں اٹھیں۔ ٹھیک اسی وقت پوری قوت کے ساتھ بیوی نے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ ڈھیر سا تھوک ٹھیک ناک کے بیچوں بیچ چپک گیا۔

لیکن بس، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ شوہر نے اپنا سر اور نیچے جھکا لیا۔ بیوی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ عجیب نگاہوں سے اس نے باہر کی طرف دیکھا، گویا تیسری مرتبہ دھماکے شروع ہونے کا انتظار ہو!

❁❁

Scanned with CamScanner

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

ماتم پُرسی

ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسیاں اس قدر احتیاط سے کیوں چلاتے ہیں؟ ٹیکسی... لڑکیوں کی اناؤں کی طرح انھیں بھی یہ خطرہ رہتا ہے کہ کوئی ٹرک انھیں روند نہ دے یا چوراہے پر الٹ نہ جائیں۔ اتنی دیر سے دوڑ رہی ٹیکسی نے ایک بھی جھٹکا ایسا نہیں کھایا کہ یہ لڑکی میرے اوپر آ گرے۔

ایک غیر ضروری اکتاہٹ دبانے کے لیے میں ایک بار اپنے گھٹنوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ سیٹ سے چپکے ہوئے گھٹنے، پتلون کے کالے تھیلوں میں مری کتیوں کی طرح پڑے، بہت ہی بیہودہ لگتے ہیں۔

ویسے یہ اتفاق ہے کہ میری پتلون کالی ہے اور میں ایک ماتم میں شریک ہونے جا رہا ہوں۔ کالی پتلون کی ایک اور خاصیت میرے ذہن میں آ رہی ہے۔ لگاتار تھرّاتے انجن کے ہلکے جھٹکوں سے وہ رہ رہ کر مشتعل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کالی سلوٹوں کے ساتھ آگے کی طرف ابھرا پتلون کا حصہ دکھتا نہیں۔ لیکن ٹیکسی دس منٹ میں پہنچ جائے گی، اور اگر یہ جوں کا توں رہا تو؟ کسی کی ماتم پرسی کے وقت ابھری ہوئی پتلون کی فلائی سچ مچ بے ہودی لگے گی۔ یکا یک مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ ٹیکسی رکوائی۔ بائیں طرف فٹ پاتھ پر کچھ کتابیں بچھی ہوئی تھیں — جاسوسی، کوک شاستر اور دوسری جنسی کتابیں، اور مذہبی۔ سب سے موٹی جلد بدقسمتی سے ایک مذہبی کتاب کی تھی۔

اب ٹھیک ہے۔ سامنے جانگھوں کے بیچ کتاب کی جلد رکھ لینے سے بالکل کچھ پتا نہیں چلے گا۔ ٹیکسی پھر چل پڑی۔

Scanned with CamScanner

ماتم جیسا کچھ لگا نہیں۔ ہاسٹل کے سب سے کنارے والے برآمدے میں سیڑھیوں کی ریلنگ کی آڑ سے دو تین ہاتھ ابھرے۔ تینوں پہلے ہی آ چکے تھے۔ کونے میں چار پانچ کرسیوں پر تینوں بے حال بیٹھے تھے۔ ساتھ کی لڑکی پر ایک اسٹنٹ بھری نگاہ ڈال کر چودھری نے دوسری کرسی سے اپنی ٹانگیں کھینچ لیں۔ جے نے ایک اور کرسی سے اخبار اور سگریٹ کی ڈبی اٹھا کر اپنی ٹانگ پر رکھ لی۔

کیا لاش کو دیکھنا ضروری ہے؟ لیکن لاش کا اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ شخص زندہ تھا اور اُس وقت بھی اپنے تئیں کسی رسمی کارروائی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ شاید پانچ منٹ کے بعد ہی مجھے لگتا ہے کہ ایک اکتاہٹ آس پاس رینگ رہی ہے، اپنی گندی دم پٹکتی ہوئی۔ پھٹ پھٹ... دم کی آواز — لیکن کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی یہ جانتا ہو کہ ماتم پرسی میں آنے کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے ہاتھوں کو بھی اس ڈھنگ سے رکھے ہوئے ہوں جیسے کم سے کم اس وقت نہیں رکھنا چاہیے۔ پر پھر کہاں رکھی جائیں یہ ہتھیلیاں؟ سر پر، کولھوں پر یا پاکٹ میں؟ لگتا ہے، ہتھیلیاں فالتو ہیں — اگر لڑکی ساتھ ہے تب تو یہ ایک دم بیکار ہیں۔

چودھری لڑکی کی طرف ایسے دیکھتا ہے جیسے اسکاٹ لینڈ یارڈ کا کوئی سپاہی گھور رہا ہو۔

لیکن اس گھورنے کا لڑکی پر اثر نہیں ہوا ہوگا، پھر بھی بہت آہستہ سے کان میں جھک کر اس نے باتھ روم پوچھا۔

تھوڑی سی کھوج کے بعد باتھ روم مل گیا۔ جب دروازہ اندر سے بند ہو گیا تو اچانک مجھے پھر وہی دم بنارُ کے پھٹپھٹاتی محسوس ہوئی۔ سوچ نہیں پایا کہ کھڑا رہوں یا لوٹ جاؤں۔ دروازوں کی جھری سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے بہت زیادہ پریشر ہونے پر تھوڑا کھلے نل سے آتی ہے۔ اب شاید کوئی کھاری سی بو بھی جھری سے رینگتی نکلے گی — یہ اندازہ لگاتے ہی میں کرسیوں کی طرف لوٹ آیا۔ چودھری نے پھر اسی نگاہ سے دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا، ''کہاں؟''

جواب دینا اچھا نہ لگا۔ نسیم ہم سب میں شاید سب سے زیادہ ماتمی موڈ میں تھا۔ ایسے لوگ اچھے ہوتے ہیں جنھیں موڈ کے لیے کوئی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ اس نے کرسی کے تکیے سے گردن اٹھا کر پوچھا، ''یہ لڑکی کون ہے؟''

''عورت!'' چترویدی نے بے دلی کی ترمیم کے بعد چشمہ صاف کرنا شروع کر دیا۔ جواب اور سوال دونوں کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا۔

ہاں، چہرے پر ایک ہنسی ابھرنا چاہتی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی لاش کا کف ہنسی پر لپٹ گیا ہے۔ برآمدے میں کتنے ہی جوتوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کئی جوتے، فرش سے رگڑتے ہوئے۔ مرے ہوئے آدمی کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے جوتے کچھ خاموش سے ہو جاتے ہیں۔ شاید لوگ ماتم کا خیال کر، چوروں کی طرح چلنا شروع کر دیتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے میں اس وقت بے حد کانشس ہو رہا ہوں۔ لیکن کوئی چارہ نہیں ہے۔

''میں سیلف کانشس ہو رہا ہوں نا؟'' کسی سے بھی میں نے اچانک پوچھا۔

''ہاہا! بیوقوف لگ رہے ہو۔'' چودھری کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ چودھری مجھ سے زیادہ بیوقوف ہے۔ لیکن وہ عقلمند ہونے میں یقین ہی کب کرتا ہے؟

''اگر اب ہم یہاں سے اٹھ لیں؟'' کوئی بھی یہی بات کہنا چاہتا تھا اس لیے یہ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کس نے کہا، لیکن ہر کسی نے اٹھنے کی بات کی حمایت کی۔ ٹھیک بھی ہے، ماتم میں کتنی دیر بیٹھا جا سکتا ہے؟ اگر ایک گھنٹہ بیٹھنے پر بھی ماتم پرسی پوری نہیں ہو سکی تو ایک مہینہ بیٹھے رہنے پر بھی کیسے ہو گی؟

جے ناحق بڑبڑانے لگا۔ ''یہ ماتم کی ٹریڈیشن کس احمق نے شروع کر دی. . . ''

وہ لوٹ آئی۔ کہنیوں تک بہے پانی کی دھار ہتھیلیوں سے رگڑ رہی ہے۔ چودھری اٹھ کر چپ چاپ اسے اپنا رومال دے دیتا ہے اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہتا ہے، ''چلیں؟''

سوال کے جواب میں لوگ چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جے کا فلیٹ خاصا خوبصورت ہے۔ بیویوں کے نہ رہنے پر بڑے فلیٹ میں یہ آسانی پیدا ہو جاتی ہے کہ. . .

چودھری نے بوسیدہ سے سوٹ کیس سے برانڈی کی بوتل نکال لی ہے اور اس طرح گھور رہا ہے گویا اس میں سے الہ دین کا جن نکلنے والا ہو۔

نسیم اور جے کی بے چینی سے لگتا ہے کہ وہ جلدی سے جلدی چاہتے ہیں کہ میں اس لڑکی سے نمٹ لوں۔ ''سوانو،'' جے بڑبڑاتا ہے۔

''آئی ہیٹ!'' چودھری بوتل کو جھنڈے کی طرح اونچا اٹھا کر چلاتا ہے۔ ''مجھے لڑکی کے

Scanned with CamScanner

معاملے میں وقت کی پابندی سے نفرت ہے۔"

اتنی زور سے بولے گئے الفاظ نسیم کے شیشے جیسے کانوں سے ٹکراتے ہیں اور وہ پہلو بدلتا ہے۔

ہم سب اتنے احمق کیوں ہیں؟ لیکن یہ سوال بھی غلط ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے زیادہ احمق کیوں نہیں ہو سکتے؟

"ممیو!" چودھری دوسرے کمرے میں نظر ڈالتا ہے اور ڈک کر کے شراب پینے لگتا ہے۔

لڑکی اپنے اتارے ہوئے کپڑے بڑی احتیاط سے تہہ کر کے اسٹول پر رکھ رہی ہے۔ جھکی ہوئی لڑکی کے چکنے پٹھوں پر سفید روشنی چمک رہی ہے۔ کولہے پر چمکتی روشنی لگتا ہے جیسے کسی اجگر کی سوجی ہوئی آنکھیں چمک رہی ہوں۔

چودھری اتنا شور کیوں کرتا ہے؟

"ماچس، میری ماچس..." وہ ہر ایک کی جیبیں ٹٹول رہا ہے، گو کہ یہ صحیح ہے کہ نہ صرف اپنی بلکہ جے کی ماچس بھی اس نے اپنی ہی پاکٹ میں رکھی ہوئی ہے۔

لیکن اسے چپ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ بہتر ہے کہ دروازے بند کر لیے جائیں۔ بہتر ہے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد گھومنے پر دیکھتا ہوں جیسے کسی نے اجگر کی ان آنکھوں کو چاٹ لیا ہو۔ یا گدھ کھا گیا ہو اور اجگر الٹا پڑا ہو۔

لڑکیاں سامنے سے اتنی بدصورت کیوں ہوتی ہیں؟ پسلیوں پر گوشت کے اگ آئے لوتھڑے اور کالی گھنڈیاں، جیسے کسی پنساری کی دکان میں سپاری، تمباکو کی تھیلیاں پڑی ہوں۔ پیٹ کے بیچ چھید تو اس قدر بے ہودہ ہے گویا کسی نے عورت کو پہلے ہیجڑا بنایا ہو اور پھر کچھ سوچ کر تھوڑا نیچے ایک اور سوراخ بنا دیا ہو۔ مجھے آفٹر تھاٹس بے حد ناپسند ہیں۔ ناف کا بے معنی سوراخ بنانے کے بعد ردوبدل اور ترمیم کیوں؟ ترمیم ہمیشہ بزدلی کی نشانی ہوتی ہے۔ لیکن اس سب سے زیادہ بڑی بے ہودگی ہے ترمیم کی شکل۔ جانگھوں کے بیچ کی جگہ کا اس قدر گندا ہونا کیوں ضروری تھا؟ صرف سوراخ سے کام کیوں نہیں چل سکتا تھا؟ سوراخ پر ہونٹ، ہونٹوں پر بال — لگتا ہے جیسے جانگھ کے اوپر کسی نے بھیڑ کا پچھلا حصہ چپکا دیا ہو، میلا، بھونڈا اور...

اجگر کی وہ آنکھیں کہاں گئیں؟ عورت ان آنکھوں کو پیچھے کیوں رکھتی ہے؟ پیچھے...

Scanned with CamScanner

مجھے ریڑھ میں ایک جھرجھری ہوتی ہے۔ الماری کے پاس... جھٹکے سے دروازہ کھول کر میں نے پوچھا، ''فلِٹ ہے؟''

''فلِٹ!'' چودھری نے بے تحاشا ٹھہاکے لگانے شروع کر دیے۔

ہنستے ہوئے جے نے بتایا کہ لاکر کے اوپر پچکاری رکھی ہے۔ دروازہ جھٹکے سے بند کر کے میں لاکر کی طرف تیزی سے بڑھا۔ لاکر پر فلِٹ کی بھری ہوئی پچکاری رکھی مل گئی۔

لڑکی نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا اور تولیہ جانگھ پر ڈھک لیا۔ لیکن اس کی گھبراہٹ پر مجھے ہنسی نہیں آئی۔ زیادہ موقع نہیں تھا۔ پچکاری لے کر پلنگ پر چڑھتے نہ چڑھتے پچھلی دیوار پر چپکی دونوں چھپکلیاں دوڑ پڑیں۔ پچکاری نئی اور بڑی تھی۔ فلِٹ کے زہریلے بھبکے خاصی دور تک جاتے تھے۔ چھپکلیاں دو پل گیس میں ٹھٹکی رہیں اور پھر بے تحاشا بھاگیں، چھت کی طرف۔ چھت تک بھی پچکاری کا فوارہ آسانی سے پہنچ رہا تھا۔ چھت سے دوبارہ مڑ کر وہ دوسری دیوار کی طرف بھاگیں۔ میرا ہاتھ رکا نہیں۔ لگاتار دھوئیں کے غباروں کی طرح نکلتی زہریلی گیس کمرے میں بھرنے لگی۔ پلنگ سے نیچے اتر کر میں چھپکلیوں کے پیچھے دوڑا۔

لڑکی گیس سے بری طرح کھانسنے لگی۔ فلِٹ کا دھواں کچھ دیر تو اچھا لگتا ہے لیکن اس کے بعد پھیپھڑوں کے اندر کھرچن سی ہونے لگتی ہے۔ گلے میں کانٹوں کی پرتیں بچھتی جاتی ہیں۔ لڑکی کھانستی رہی اور میں لگاتار پچکاری چلاتا ہوا چھپکلیوں کا پیچھا کرتا رہا۔

ان میں سے ایک تلملا کر نیچے گری تو میں بے تحاشا ڈر گیا۔ مجھے لگا کہ اس نے جان بوجھ کر میرے اوپر چھلانگ لگائی ہے۔ اگر ایک لمحے کی چوک ہو جاتی تو وہ میری گردن پر آ چپکتی اور اس کی تھرتھراتی دُم میری ریڑھ کے اندر گھس جاتی۔

یہ بے حد خطرناک ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ کنکھجورے جیسے دہشت ناک کیڑے کو زندہ نگل جاتی ہے۔ میں نے بچپن میں سنا تھا کہ اسی ایک چھپکلی کی وجہ سے چھ بھائیوں کی جانیں گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ دودھ پکانے کو رکھ کر وہ کہیں چلے گئے۔ لوٹ کر باری باری سے انھوں نے گرم دودھ پیا۔ ساتویں نے پینا چاہا تو دیکھا کہ دودھ کے گلاس میں ابلی ہوئی سوجی چھپکلی پڑی ہے۔ اسے فوراً الٹی ہو گئی۔ وہ بچ گیا تھا پر باقی چھ اسی رات مر گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

موت کے ڈر سے کانپ کر میں پلنگ پر چڑھ گیا۔لڑکی نے دونوں ٹخنے اوپر کر لیے۔

میں نے دیکھا، چاروں طرف ہر کھڑکی دروازہ بند ہے۔ گری چھپکلی چپ چاپ فرش پر چپکی ہے، پر دوسری بھاگتی جارہی ہے۔ جائے گی کہاں؟ باہر جا نہیں سکتی۔ دیوار میں کوئی سوراخ نہیں۔ اچانک میں نے لڑکی سے تولیہ چھین کر اس کی اٹھی جانگھوں میں ٹھونس دیا۔

فرش پر پڑی چھپکلی میں حرکت ہوئی۔ میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر ٹیلکم پوڈر کا ڈبا رکھا تھا۔ احتیاط سے اٹھایا اور دھیرے دھیرے دم کو حرکت دیتی چھپکلی کے آس پاس فرش پر چھڑکنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس پوڈر کی وجہ سے چھپکلی تیزی سے نہیں بھاگ پائے گی۔

پوڈر چھڑک کر میں نے پھر پچکاری اٹھائی۔ بھاگ دوڑ کرتے میرے ٹخنوں میں درد ہو گیا تھا۔ کہنی ایک جگہ سے چھل بھی گئی تھی۔ چھپکلی ہلی ضرور لیکن بھاگی نہیں۔ میں لگاتار پچکاری چلاتا رہا۔ وہ زہریلی چھوٹی چھوٹی بوندوں سے نہا کر بھیگ گئی لیکن ہلی نہیں۔ پر مری بھی تو نہیں۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنا جبڑا کھولا۔ سرخ ہونٹوں کے کنارے چمکیلی سوئی کی نوک جیسے دانتوں کی قطار چمکی۔

خوف کی ایک سہرن اور مجھے چاٹ گئی۔ لڑکی نے نہ جانے کیوں اچانک اٹھ کر کپڑے پہننا شروع کر دیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے کپڑے چھینے اور ٹیبل کی طرف پھینک دیے۔

عاجزی کے ساتھ اس نے ظاہر کیا کہ وہ اس حالت میں کب تک چھپکلی کو مرتے دیکھتی رہے گی؟ پون گھنٹہ ہو گیا۔

میں حیرت سے اسے گھورتا رہ گیا۔ لیکن چارہ بھی کیا تھا۔ آخر کار میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بیٹھا دیا۔ بغل میں بیٹھ کر اس کی جانگھوں پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جب کمرے میں ایسی چھپکلی پڑی ہو جو ماری نہ جا سکی ہو اور کسی بھی پل وہاں سے بھاگ سکتی ہو، تب بھلا لڑکی کے ساتھ کیسے لیٹا جا سکتا ہے؟

میں نے دیکھا، دوبارہ چھپکلی کی کمر میں حرکت ہوئی۔ پیٹ کا حصہ پھولا اور پچکا۔ شاید اس نے سانس لی، گویا وہ زندہ تھی۔ لیکن ضرور فلٹ کے زہر کا اس پر اثر ہو رہا ہو گا۔ اس کے پھیپھڑوں کے اندر کھرچن ہو رہی ہو گی۔ گلے میں کانٹے بن رہے ہوں گے۔ پر وہ بھاگ سکتی ہے۔ پلنگ کے پاس

رکھے لکڑی کے وزنی لیمپ کو سرکا کر میں اس کے قریب لے گیا۔ اس نے شاید دھیرے سے آنکھیں گھما کر آئے موت کو نزدیک آتے دیکھا لیکن بھاگی نہیں۔ لیمپ اٹھا کے اس کے نچلے حصے کی دھار میں نے ٹھیک چھپکلی کی کمر پر رکھ دی۔

چنک... ایک بہت ہلکی، لیکن ڈراؤنی آواز آئی۔ وہ بے تحاشا پھڑ پھڑانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے اگلے پنجوں کے پیچھے کے تمام حصے کی کھال لیمپ کے نیچے رہ گئی ہے اور چھلا ہوا گوشت چمک رہا ہے۔ ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب آسانی سے فلٹ ڈالا جا سکتا ہے۔

فلٹ سے دوبارہ نہلا چکنے پر مجھے لگا کہ میں نے کوئی غلطی کی۔ اس پچھلے حصے پر ممکن ہے فلٹ کسی دوا کا کام کرے۔

میں نے دیکھا تھا کہ ایک بار ایک گھوڑے کا سُم ٹوٹ گیا تھا اور ساری سڑک پر گندا خون پھیل گیا تھا۔ لوگ اس کے کٹے پیر پر مٹی کے تیل کی بوتل انڈیل رہے تھے۔ ضرور فلٹ سے اسے فائدہ ہوا ہوگا۔ پر اب ہو بھی کیا سکتا ہے!

کسی لکڑی کی مدد سے چھپکلی مارنا مجھے سخت ناپسند ہے۔ چھڑی ہاتھ میں لیتے ہی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں مشت زنی کرنے جا رہا ہوں۔ بڑا غیر فطری لگتا ہے۔ پھر بھی لگتا ہے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

کمرے میں کھوجنے پر کوئی چھڑی جیسی چیز ہاتھ نہ آ سکی۔ ہاں، ایک چیز پر دھیان گیا۔ سوئچ بورڈ سے پلگ کے ساتھ ایک تار لٹکا ہوا تھا، بجلی کا۔ شاید آئرن کرنے کے لیے۔ نیچے سے اس کے دونوں تار کھینچ کر میں نے الگ کر لیے۔ پلگ لگا دیا۔ چھپکلی سے تھوڑی دور کھڑے ہو کر میں نے دھیرے دھیرے تار اس کے نزدیک کیا۔ چھپکلی کی چمکتی ہوئی آنکھوں نے سانپ کی زبان جیسے تانبے کے تار دیکھے۔ تار آہستہ سے اس کے ماتھے پر ٹِک گیا۔

پھٹ، پھٹ، پھٹ۔ اچانک چھپکلی بری طرح پھڑ پھڑائی۔ پھر تار کا لمس۔ پھر وہی تڑپ۔ مجھے پسینہ چھوٹنے لگا۔ کیا وہ مر نہیں سکتی؟ کیا موت کے یہ وسیلے اتنے بے اثر ہیں؟

پھر... پھر کوشل کیوں مر گیا؟ فلٹ نہیں، بجلی کا تار بھی نہیں، کمر پر گرتے لیمپ کے نچلے حصے کا وزن بھی نہیں — کیسے مر سکا ہوگا کوشل، اتنی آسانی سے؟ موت کے وسیلے اتنے بے اثر کیوں ہیں؟

لاچاری میں میں نے تار پٹک دیے۔ ایک عجیب دھماکا ہوا۔ شاید فیوز اڑ گیا۔ ٹھیک بھی ہے۔

Scanned with CamScanner

یہی صحیح ردعمل ہے۔ بے بسی میں اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟
ہار مان لینے کے آخری لمحے — شاید بالکل نگر پر پہنچ کر میں نے دیکھا، آدھی نکلی چھپکلی ساکت ہے۔ کیا وہ مر چکی ہے؟ سچ؟

لیمپ ہٹایا جا سکتا ہے کیونکہ اس کی کمر ٹوٹ چکی ہوگی۔ وہ بھاگ نہیں سکتی۔

دھیرے سے میں نے لیمپ ہٹایا۔ چھپکلی میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ ایک گہری سانس، نہ جانے کتنی دیر سے پھیپھڑوں میں رندھی ہوئی، باہر آئی۔ کھونٹی سے ایک خالی ہینگر اتار کر میں نے چھپکلی کی لاش احتیاط سے اس کے سرے پر اٹھالی۔ لاش اٹھائے ہوئے میں اس لڑکی کی طرف بڑھا۔

لیکن تھوڑا نزدیک پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ڈر ہے، دہشت... بہت زیادہ دہشت۔

کیا کسی کی آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھی جا سکتی ہے؟ شاید، دیکھی جا سکتی ہے۔ میرے اپنے چہرے کی پرچھائیں اس کے چہرے پر اس طرح تیر رہی تھی جیسے تالاب کے پانی پر جیلی فش تیر رہی ہو اپنے جسم کے لمبے حصوں کو سطح پر پھیلائے ہوئے۔ ٹھیک ویسی ہی پرچھائیں، میرے اپنے چہرے کی۔ پیلی سی۔ سیال۔ لجلجی اور کریہہ۔

لڑکی بے تحاشا چیخی اور دروازے کی طرف بھاگی۔ ننگے کولھے — اجگر کی آنکھیں — ٹھہرو... ٹھہرو...

لڑکی نے ہڑبڑا کر دروازہ کھولا۔ نسیم، چترویدی اور چودھری اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ٹھیک اس دوسری چھپکلی کی طرح ہی دروازے سے باہر نکلی اور تڑپتی ہوئی سامنے کھڑے جے کی بانہوں میں گر گئی۔ چپ چاپ میں اسی طرح ہینگر کے سرے پر چھپکلی کی لاش لیے باہر آیا۔

ہر ایک کے چہرے پر مجھے اپنی وہی جیلی فش جیسی پیلی، چپچپی پرچھائیں تیرتی دکھی۔ دیر تک بھیانک سناٹا چھایا رہا۔

نسیم آگے آ کر عجیب بیزاری سے چھپکلی دیکھنے لگا۔

''جے، اس آدمی کو باہر نکال دو ورنہ میں اس کے جبڑے توڑ دوں گا،'' چودھری نے کہا، اور غٹ غٹ کر کے باقی شراب پی کر بوتل فرش پر توڑ دی۔

میری پرچھائیں اس طرح سوکھ گئی جیسے بالو پر جیلی فش کے سوکھ جانے پر ایک جھلی بچ جاتی ہے۔ ایک نشان بھی بچ جاتا ہے بالو پر۔

میں دھیرے دھیرے فلیٹ سے باہر آ گیا۔ اندھیرے راستے میں سینکڑوں جیلی فشوں کی طرح بچھے روشنی کے دھبوں کو کچلتا، اپنے چہروں پر ہی چلتا، میں آگے اور آگے بڑھتا گیا۔

❁❁

Scanned with CamScanner

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: شہاب الدین گیلانی

نی

صرف ایک ستے سے جاز پر بھی روبی ضرورت سے زیادہ مٹکتی ہے جیسے گھوڑی اپنے اوپر بیٹھنے والی مکھیوں کو اڑانے کے لیے اپنے پٹھوں کو حرکت دے رہی ہو۔ بہت بری لگتی ہے۔ گاتی اچھا ہے، خاص طور پر ایک گیت — سورج کے دیس میں ایک ٹاپو ہے جہاں میں تمھارا انتظار کروں گی...

روبی انتظار نہیں کرے گی، یہ سچ ہے، کیونکہ رات کو وہ بے حد تھک جاتی ہے اور گھر لوٹتے ہی سو جاتی ہے۔ بجھے ماحول میں رنگ لانے کے لیے بیچ بیچ میں اس کا بھائی اٹھ کر اس کے ساتھ ناچتا ہے تاکہ کچھ اور جوڑے اٹھنے کا بہانہ پائیں، لیکن لوگ پیتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ مگر روبی کسی بات کا انتظار اب نہیں کرتی۔ اسی بار میں پہلے وہ اپنے باپ کے ساتھ ناچا کرتی تھی جو گنوریا میں چل بسا۔ دو سال سے وہ اپنے بھائی کے ساتھ ناچتی ہے جو آج کل ایک ہندوستانی اسکول ماسٹرنی کے ساتھ بھاگ نکلنے کے چکر میں رہتا ہے۔ شاید دو مہینے بعد روبی اپنے بیٹے کے ساتھ ناچ کر کام چلانا شروع کر دے گی۔ وہ کسی واقعے کا انتظار نہیں کرتی، پہلو بچا لیتی ہے اور واقعہ اس کی بغل سے گزر جاتا ہے، اسی لیے روبی کسی بات کے معنی کبھی نہیں سمجھتی۔ اپنے گائے گیت کی کڑی کے معنی بھی اسے معلوم نہیں رہتے۔ جیسے کوئی نیند میں بڑبڑائے اور تکیہ کھینچ کر چمٹا لے، اسی طرح روبی گیت گاتی ہے۔ ہم سب سنتے ہیں —

سورج کے دیس میں ایک ٹاپو ہے...

ڈیزی جاپانی پنکھے کی طرح کا اسکرٹ اور بلیرڈ کھیلنے والی چھڑی کی طرح کا بدن لیے گزرتی

Scanned with CamScanner

ہے اور بد بدا کر میری میبل پر روبی کے گیت کی پیروڈی سنا جاتی ہے ۔۔۔ روبی کے کولھے پر ایک بناوٹی گدی ہے ...

روبی کی گدی ایک دن ناچتے ناچتے اسکرٹ سے سرک گری تھی ۔ روبی جھینپی نہیں ۔ اس نے ہال کے کنارے آ کر گدی ٹھیک کرتے ہوئے کہا، ''ڈیزی، اگر تم اپنے بستر پر نقلی لِنگ رکھ کر ہنستی نہیں ہو تو جنت کے نام پر میرے نقلی کولھوں پر ہنسنے سے باز آؤ۔''

روبی کی للکار سن کر ہر مسکرانے والے کی مسکراہٹ سمٹ گئی جیسے لیکو پلاسٹ سے چپکائے زخم کے لب پھیل کر کھنچ گئے ہوں ۔ یہ سچ ہے کہ لوگ نہیں، لوگوں کے زخم مسکرائے تھے ۔

اعجاز نے ادب سے جھک کر سوڈے کی بوتل اٹھائی اور بولا، '' آج سب کے گلاس میں اپنے ہاتھ سے سوڈا ملانے کی خواہش ہو رہی ہے ۔'' میں خوش ہو گیا، ناخوش ہی کیوں ہوتا؟ میں نے اعجاز کو اشارہ کیا کہ وہ میری سکیم کو میری یاد دلائے ۔ اعجاز نے بڑی عاجزی سے کہا کہ وہ بک ہو چکی ہے ۔ کل اسے ایک پارسی بک کرا گیا تھا دو دنوں کے لیے ۔ ابھی آتا ہو گا ۔ میری سکیم ... کہتے ہیں میری سکیم اس 'بار' کی سب سے اچھی آمدنی رہی ہے ۔ وار پیریڈ میں جب سارا کلکتہ خالی ہو گیا تھا، میری سکیم کی وجہ سے ہی یہ بار چلتا رہا ۔ میری سکیم اس وقت تیرہ سال کی تھی جب اس نے فوجی میجروں تک سے ناک رگڑوالی ۔

اس پارسی کو میں جانتا ہوں ۔ ایلیٹ روڈ پر اس نے ایک ہوٹل کھولا ہوا ہے ۔ کل وہ اسی بار کے مالک سے فلوک کی باتیں کر رہا تھا، ایسا اعجاز نے مجھے بتایا ۔ بار کے مالک ایڈگر نے اسے بتایا کہ ڈبل فلوک خطرناک ہے ۔ سنگل فلوک چلایا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں لڑکیاں گاہک لاتی ہیں اور محض پسنجر کی حیثیت سے ٹھہرتی ہیں ۔ اس میں آسانی یہ ہے کہ ایسے ٹھہرنے والوں سے بل لے لیجیے اور اس پر کینسِلڈ لکھ لکھ کر رکھتے جائیے ۔ انکم ٹیکس سے بچت ہو گی ۔ پارسی شروعات کے لیے میری سکیم کو گانٹھنا چاہتا ہے ۔ وہ دس بجے آئے گا، ابھی ساڑھے نو بجے ہیں ۔ روبی ناچ رہی ہے ۔ کیا ناچتی ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بینڈ صرف والٹز کا ہے لیکن روبی اور اس کے بھائی کے قدم فوکس ٹروٹ تک پہنچتے ہیں اور ان کی رفتار شاید ٹینگو سے بھی زیادہ گھماؤ دار ہے ۔ روبی کا ہر ناچ ایک ہلکے پھلکے ایکیکوزمی ناچ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن وہ اتنا ہی بے اثر ہوتا ہے جتنا کسی تھکاوٹ کے لیے گولڈن ایگل کا جھاگ ۔۔۔

صرف جھاگ...

زندگی بھی جھاگ ہے، صرف جھاگ، جس کے بلبلے دوسرے کے گلاس میں پھوٹتے ہیں اور چھینٹیں ہم پر پڑتی ہیں۔ جھاگ کے چھینٹے چڑچڑاہٹ پیدا کرتے ہیں۔ ڈیزی، میری سیکم، روبی — سبھی جھاگ کے ابلتے پھوٹتے بلبلے ہیں جن کی چھینٹوں کا پیاس نہ بجھانے والا مزہ چڑچڑا بنا دیتا ہے۔

پچھلے کئی دنوں سے جھاگ اڑا رہی ہے ایک بری لڑکی۔ اس نے لوگوں کو ہر روز اپنی زندگی کی ایک نئی کہانی سنائی ہے۔ خوبصورتی میں اس کا جوڑ نہیں۔ نارو بجیلن اور برمیز بلڈ۔

مجھے دیکھا، مسکرائی اور اٹھ کر میری ٹیبل پر آبیٹھی۔ اعجاز اچھا آدمی ہے۔ وہی ہے جو کسی لڑکی کو کسی بھی ٹیبل پر پہنچا سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈی سے موہ غلط ہے لیکن یہ جھوٹ ہے کہ رنڈی موہک نہیں ہوتی۔ ایسی جس میں پٹرول کی طرح تیکھی بو ہو اور روئیں دار کیڑے کی طرح چھو کر جلن پیدا کر دینے کا مادّہ ہو۔ ایسی کہ نہ چاہ کر بھی خارش کو ناخن سے کھرچ دینے کا جی چاہے۔ ایسی جیسے ٹوٹی دیوار پر ناگ پھنی اگ آئے اور اچھی لگے۔ جیسے ناخن کے بیچ ایک تیز کانٹا چبھ جائے اور ننھی، چمکیلی، شوخ اور گرم خون کی بوند چمکنے لگے، ایسی...

وہ کمسن، نرم اور رنگین رنڈی، ایک صبح جسم میں بھر گئی حرارت کی طرح۔ جیسے کٹھ پتلی، خوب چمکدار، چیخ وارنش کے رنگوں سے پتی جھلملی۔

اسے دیکھو اور لگے گا کہ اب مجھے نہا لینا چاہیے، نہا کر عبادت کرنی چاہیے، خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ میری آنکھوں کو اندھا کر دے کہ میں دیکھنے کے لائق نہ رہوں، میری زبان کاٹ لے کہ میں گناہوں کے درخت کے پھل کا ذائقہ نہ جان سکوں، میری بانہوں کو کسی لوہے کی شہتیر سے جکڑ دے کہ میں... لیکن میں صرف چڑچڑاتا ہوں جب زندگی، جو جھاگ ہو گئی ہے، اس کے چھینٹے مجھ پر پڑتے ہیں...

اتنی لڑکیوں میں صرف نی ہی ایسی ہے جو سب سے زیادہ خوبصورت ہے اور سب سے زیادہ نامقبول۔ پارسی تیجو بھائی کی گنجی چندیا پر اس نے بھرے ہال کے بیچ اپنی سگریٹ چھوا دی تھی اور وہ تلملا گیا تھا۔ نوجوان مارواڑی چھوکرے شیام لال ڈابڑی وال نے ابھی کچھ دن پہلے اس سے ساتھ

Scanned with CamScanner

ناچنے کی خوش قسمتی کی درخواست کی تونی نے تہذیب کے برخلاف اس سے کہا کہ وہ ہم جنس جوڑا بنا کر ناچنا گوارا نہیں کرتی۔

نی نے میری ٹیبل پر آتے ہی کہا، ''میرا نام تمھیں یاد ہے؟''

''نہیں، میں بھول گیا!'' میں نے ان چاہی شرارت سے کہا۔

''کے سائی! یاد رہے گا؟''

''خاص اچھا نہیں ہے، پھر بھول جائے گا۔''

''پھر یاد دلا دوں گی۔''

''رڈی اور گندی چیزوں کے لیے تمھاری یادداشت اتنی تیز ہے؟''

نی نے مسکرا کر جواب دیا، ''کیونکہ زیادہ تر انھی سے سابقہ پڑا کرتا ہے۔''

''کتنے روپے لوگی؟'' میں نے سیدھی چوٹ کرنی چاہی۔

نی نے میری آنکھوں میں جھانکا، مسکرائی، جیسے نہانے سے پہلے جانگھ پر سرد پانی کی چھینٹیں مار کر ہمت تول رہی ہو، پھر بولی، ''بہتر ہو کہ ایک دور پی لیں!''

''گھبراؤ نہیں، تمھارے پیسے سے شراب خرچ نہیں ہوگی۔''

''بیکار اپنی ایمانداری کا پرانا کوٹ مت دکھاؤ۔ یہ ایمان کسی بھی کباڑی کی دکان پر ملتا ہے۔ چالیس روپے۔'' نی نے پتلی سے پول کی ننھی سگریٹ ہونٹوں میں دبائی، اعجاز نے آگے بڑھ کر اپنے لائٹر سے اسے سلگا دیا۔ نی نے ڈھیر سا دھواں ٹیبل پر اڑا دیا۔

''چالیس روپے، صرف؟ میں نے تو تمھیں اس سے کہیں زیادہ کا سمجھا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔ باقی روپیہ میری طرف سے کسی بھکاری کو دے دینا۔''

''میں بھکاری اور تم میں فرق کرنا چاہتا ہوں۔''

''پر اتفاق سے بھکاری کو دان دے کر پُن کمانے والے اور رنڈی کے پاس جا کر پاپ کرنے والے میں میں فرق نہیں کرنا چاہتی۔''

''تم مانتی ہو کہ تمھارے پاس آنا پاپ ہے؟ کافی حوصلہ مند بے شرمی ہے۔''

''کیونکہ تمھیں اسے پُن کہتے ہوئے بڑی بزدلی بھری شرم محسوس ہوتی ہے!'' نی سگریٹ

Scanned with CamScanner

کے بے انداز لمبے کش کھینچ رہی تھی۔

''ورنہ کیا تم اسے پُن بھی مان لوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر پاپ بھی مان سکنے کی وجوہات تم دکھا سکو تو ضرور!''

''میں اس وقت فلاسفی میں دلچسپی نہیں لینا چاہتا،'' میں نے آخری بات کہی۔

پرنی شاید کچھ زیادہ چڑھی ہے، وہ فوراً بولی، ''میں عشق و محبت میں دلچسپی نہیں رکھتی۔''

لیکن بات میرے ہاتھوں شاید بالکل بے قابو ابھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ''مگر میں چالیس روپے دے سکتا ہوں۔ ایسی حالت میں تمھاری کیا دلچسپی ہوگی؟''

نی مسکرائی، کھل کر۔ سگریٹ کی ڈبیا میز پر سامنے کھسکا دی۔ میز کے شیشے پر انگلی سے ایک دائرہ کھینچا اور بولی، ''میں یہ چالیس روپے بھی چھوڑ سکتی ہوں۔''

''سودا نہ ہو یہ الگ بات ہے، پر قیمت تمھاری چالیس روپے ہی ہے نا؟''

''معاف کرنا پیارے، ٹرین کا کرایہ دیتے ہو تو کیا وہ ٹرین کی قیمت ہو جاتی ہے؟''

میں نے کرسی پر کروٹ بدلی، ہال میں ایک اکھڑی نظر دوڑائی اور نی سے پوچھا، ''کیا پیوگی؟''

وہ بولی، ''تمھاری مجبوری!''

مجھے لگا، نی کو اب زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا، تیکھے گلے سے میں نے ایک آڑا طنز کیا، ''تم مذہبی واعظ اچھی بنتیں!''

نی جیسے بہت بھولے چھوٹے بچے کی طرح چہرہ لٹکا کر بولی، ''مذہب کو طوائف کے اڈے پر لا کر اس کا مذاق نہیں اڑایا کرتے۔''

میں نے جیسے بے طرح آپا کھو کر کہا، ''بہت تیز ہو رہی ہو!''

نی نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دبایا اور بولی، ''میں صرف سننا چاہتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔''

''روز روز ہر آدمی سے یہی ایک بات سن کر بھی تمھارا جی نہیں بھرا؟'' نی چپ چاپ میری بات سن کر مسکراتی رہی۔ پھر پرس سے آئینہ نکال کر لپ اسٹک ٹھیک کیا، ایک بار داہنے بازو پر ہتھیلی رگڑی اور مجھے گھورنے لگی۔

Scanned with CamScanner

میں نے اپنی جیت دیکھ کر پھر کہا، ''اچھا ہو اب کسی عام سطح پر باتیں کرو۔'' سامنے کی ٹیبل پر بیٹھی لڑکیوں کے گچھے کے پاس ایک چھیلے ہوئے انڈے کے رنگ کا آدمی آیا اور ایک لمحہ گھور کر آگے بڑھ گیا۔

نی نے مسکراہٹ سمیٹ کر پوچھا، ''مثلاً؟''

''مثلاً روبی کے بارے میں، جاز کے بارے میں، دلچسپ واقعات کے بارے میں...''

''موسم کے بارے میں، ایک دوسرے کے لباس کے بارے میں...''

''کچھ برا نہ ہوگا،'' میں نے کہا۔

نی پھر مسکرائی۔ لگا، اس بار اس کی مسکراہٹ ہونٹوں کی نہیں، بدن سے کھسکتے ہوئے کپڑوں کی ہے۔ اس نے میرے کپڑوں کی طرف دیکھا — کالی پینٹ، کالے جوتے، کالی ٹائی، سفید شرٹ۔ وہ بولی، ''تم کہیں بٹلر ہو؟''

پہلو بدلتے ہوئے میں نے کہا، ''اوہ، اب یاد آیا... تم اسی ہوٹل میں ویٹرتھیں نا؟''

میرے جواب نے اسے چھوا نہیں، پر وہ ڈھیلی پڑ گئی، تھک گئی، شاید اس لیے بھی کہ جاز تھک گیا تھا اور روبی اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ٹیبلوں کے بیچ آ کھڑی ہوئی تھی۔

میں اعجاز کو بلا کر نی کے لیے جن لانے کو کہنے لگا۔ نی نے ایک بار اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر اچانک اپنا پرس سنبھالا اور اعجاز کو جن لانے سے منع کر دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پھر مسکرائی۔ لگا جیسے اچانک مجھے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس نے میری ہتھیلی اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے گال پر مل کر لوٹا دی اور بولی، ''اب چلنا چاہیے۔''

دائیں ہاتھ کی ٹیبل پر بیٹھی لڑکی اٹھ کر کاؤنٹر پر گئی اور اپنے ساتھ پی گئی شراب کا کمیشن لے کر واپس لوٹنے لگی۔ اس کے ساتھ کا مدراسی، جس کی ایک آنکھ پتھر کی اور ٹانگ لکڑی کی تھی، کھڑا ہو گیا۔

میں نی کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔

نی مجھے گلیوں میں لے چلی۔ لگا، وہ کچھ ضرورت سے زیادہ تیز چلتی ہے اور اس وقت خاموش بھی ہے۔ میں نے پوچھا تو وہ میری طرف بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھ کر صرف مسکرا دی۔ چلتے چلتے

Scanned with CamScanner

وہ رکی اور مجھ سے پوچھا،'' بھیڑ تمھیں کیسی لگتی ہے؟''

میں نے کچھ جواب دینا چاہا پر اسی نے پھر کہا،'' میں سچ سچ ایمانداری سے کہتی ہوں، بھیڑ میں اپنے کو دیکھتی ہوں تو لگتا ہے میں بہت بے بس ہوں۔ اپنے اس اکیلے پن سے مجھے دہشت ہوتی ہے۔'' گلی کے دوسرے چھور پر گیس لیمپ کی سرد روشنی میں کسی ہاتھ والے رکشے کا سایہ دکھا اور دائیں طرف کسی گلی میں مڑ گیا۔ ہماری بغل سے کترا کر ایک موٹا سا کتا ہمیں گھورتا ہوا تیزی سے آگے نکل گیا۔ نی کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ کچھ لڑکھڑائی اور پھر نارمل ہو گئی۔ وہ کہتی رہی،'' جانتے ہو، اکیلا پن مجھے کھلتے نہیں، اسی لیے تو میں بولتی بہت ہوں۔''

میں نے خاموشی توڑ کر کہا،'' وہ بھی اتنی بدتہذیب اور ترش باتیں۔''

نی ہنس پڑی۔ گلی کے دونوں طرف کی اونچی اندھیری دیواروں کی ریڑھ جیسے ابھرے پیشاب خانوں پر لگا، ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے ایک مرد کی طرح میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی،'' تب مہذب اور میٹھی باتیں کروں، یعنی کہوں، میں تمھیں پیار کرتی ہوں اور تم میری زندگی کا سپنا ہو اور تم... تمھیں نہیں جانتی پر مجھے یہ سب سن کر لگتا ہے جیسے یہ لفظ نہیں ہیں بلکہ نہ جانے کن شرابیوں کی بدبودار الٹیاں پڑی ہیں۔'' نی نے بڑے نازک ڈھنگ سے تھوکا، پھر کہنے لگی،'' یہ ترشی اور بدتہذیبی صاف اور تازی تو ہیں کم سے کم...''

گیس کی سرد روشنی اس کے گالوں پر چمکی، پھر ماتھے پر ہو کر پیچھے سنہرے بالوں کی جھالر اتر گئی۔ ہمارے سائے سامنے لمبے ہونے لگے۔ بغل کی کسی گلی میں ٹیکسی یا پرائیویٹ کار کا دروازہ بند کیا گیا اور انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔

اگلے گیس لیمپ کے پاس شاید کسی پان والے کی دکان تھی۔ دکان کی روشنی گلی پر پڑ رہی تھی۔ لیمپ پوسٹ کے سہارے ٹکا شاید کوئی آدمی منھ میں سگریٹ یا بیڑی دبائے ماچس پر ماچس جلاتا جا رہا تھا۔

دکان کے قریب پہنچنے پر اس نے منھ کی بیڑی جلانا چھوڑ کر ہمیں گھورا اور پھر بنا بیڑی سلگائے ہی کھمبے سے الگ ہو کر ڈگمگاتا دوسری طرف چل دیا۔ دکان کے قریب ایک چوڑے ٹوٹے پھاٹک پر نی ٹھٹک گئی۔ گیٹ پر ایک تیکھی نگاہوں والا شاید دربان اسٹول کے اوپر بیٹھا تھا۔ اس نے مونچھ

سمیت چہرہ اونچا کر کے مجھے گھورا۔ نی نے مڑ کر کہا، ''اسے دو روپے دے دو۔''

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، روپے کس کر دبائے اور پھر باہر نکال لیے۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ... پھر دوبارہ گنے اور نکال کر دربان کو دے دیے۔ اندر بائیں طرف ٹین کے سائبان کا ایک برآمدہ تھا، جس میں چار پانچ ادھیڑ مسلمان سوٹ کیس بنانے میں مصروف تھے۔ پچھلی دیوار کی کھونٹی پر دھندلی لالٹین ٹنگی تھی۔ ایک معمولی سے پارٹیشن کا لچر دروازہ کھول کر نی اندر گئی اور پھر باہر جھانک کر مجھے بھی بلایا۔ اندر آ کر مجھے کچن کی جیسی کوئی جگہ لگی۔ نی نے اشارے سے دوسرے دروازے کے اندر بلایا۔ دوسرے کمرے کو پار کر کے ایک آنگن سا آیا اور پھر ایک کمرہ۔ یہ کمرہ صاف ستھرا تھا، اس میں شک نہیں۔ لکڑی کا پلنگ، موٹے جوٹ کے گدے پر ہلکا روئی کا گدا اور اوپر ایک سفید چادر، تکیے، تولیہ...

نی نے تولیہ کھونٹی پر لٹکا دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھ سے معافی مانگ کر باہر چلی گئی۔

اکیلا ہوا تو مجھے لگا جیسے الٹے قلم سے کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بے تکاپن، ایک بے ڈھنگی اکتاہٹ سی جیسے مجھے سونگھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی نی لوٹی۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ایک تام چینی کا بڑا سا تسلا تھا۔ تسلے کو پلنگ کے پائتانے زمین پر رکھ کر وہ میرے نزدیک آئی۔ اب نی مچھلی کی طرح چکنا خوبصورت فراک نہیں، صرف ایک اسکرٹ اور بریزیئر پہنے تھی۔ کیا اس فراک کے ساتھ نی نے اپنے آپ کو بھی تہہ کر کے کسی ہینگر پر لٹکا دیا تھا؟ سفید دھاری دار داغوں سے بدنما بنے اس کے پیٹ کا وہ بے پردہ حصہ... نہیں، نی فراک کی طرح ہینگر پر تہہ کر کے لٹکا دی گئی ہے اور یہ سامنے کھڑی نی نہیں، صرف ایک فالتو پڑی کھونٹی ہے جسے مکھیوں نے چیٹ کر گندا کر دیا ہے۔

نی مسکرا رہی تھی۔ پر مجھے لگا جیسے کھونٹی ہی اپنی گھنڈی ہلا کر مکھیاں اڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔

نی نے کہا، ''آپ کپڑے کیوں نہیں اتارتے؟ کیا شرم آتی ہے؟''

بغل کے ہی کسی کمرے سے کوئی ننھا بچہ چیخ چیخ کر رو اٹھا۔ نی چونکی اور پھر بے سکون ہو اٹھی۔ ایک پل اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سہج ہو کر مجھ سے کپڑے اتارنے کو کہا۔ بچہ دوبارہ چیخا، تیسری بار، اور پھر بری طرح سانس گھونٹ کر لمبی لمبی ہچکیوں میں رونے لگا۔ کسی مرد کی مدھم بڑبڑاہٹ سنائی دی اور ایک تیز جھٹکا لے کر بچہ خاموش ہو گیا۔ پر وہ خاموش نہیں ہوا تھا۔ پھر لمبی خاموشی کے بعد جیسے بڑی دیر

Scanned with CamScanner

سے کھنچی ہوئی چیخ تھرتھرا کر پھوٹی۔ نی نے مجھ سے معافی مانگی، صرف ایک پل کی۔ اندر چلی گئی۔ میں دوبارہ باقی بچ رہی بے تکی اکتاہٹ لپیٹتا اور ادھیڑتا رہا۔

بچہ چپ ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد مرد کی آواز آئی، ''بچہ پھر روئے گا، اور میں چاہتا بھی نہیں کہ وہ چپ رہے۔''

''تب کیا چاہتے ہو؟'' اس بار نی کی آواز صاف سنائی دی۔

''تم بچے کو رکھو!''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''لیکن میں ہر رات بچے کی تیمارداری نہیں کر سکتا!''

''اور کوئی راستہ بھی تو نہیں۔''

''بالکل غلط بات ہے۔ میں گھر کی ملازمہ نہیں ہوں۔ رات کو کھٹولے پر بچے کی دیکھ بھال کی بجائے کسی پلنگ پر عورت کے ساتھ بتانے کی ضرورت مجھے بھی ہوتی ہے۔''

رات کے سناٹے میں اسٹیج کے پیچھے کے کردار کی آواز مجھے ایسی لگی جیسے کسی بہت بڑی مشین کا کوئی پرزہ باغی ہو کر غلط چلنے لگا ہو۔ شاید نی نے کچھ کہا اور مرد کا جواب سنائی دیا، ''نی! تمھارے پیسے لے کر مجھے دوسری عورت کی رات نہیں چاہیے۔ نہیں چاہیے نی، تم میری بیوی ہونی اور تمھاری رات... نہیں! آج اس آدمی کو لوٹا دو نی، آج کی رات مجھے دے دو، میری نی... بے بی کو اٹھا لو، دیکھو، میں سوپ تیار کروں گا نی...''

''مورکھ مت بنو، بچے کو اٹھا لو!'' نی ذرا تیز ہو کر بولی۔ بچہ اچانک پھر چیخنے لگا۔ نی شاید دروازے تک آئی لیکن شاید دروازہ کھولنے سے پہلے ہی مرد نے اسے کھینچ لیا۔

نی نے دبے لیکن بہت تیز گلے سے کہا، ''چھوڑ دو مجھے۔ پاگل مت بنو...''

''نی، میں تمھاری گھروالی نہیں ہوں نی، جاؤ اس آدمی سے کہہ دو، وہ چلا جائے۔ میں تمھارا شوہر ہوں۔ آج رات...''

''ناٹک بند کرو!'' نی اس بار بھرپور چیخی۔

''ناٹک!'' مجھے لگا، شاید مرد غصے سے کانپ رہا ہے۔ اس نے کہا، ''ناٹک ابھی ہوگا! میں اس

آدمی کا خون کر دوں گا اور..."

نی نے شاید خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ بچہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ مرد نے جیسے پاگل ہو کر پھٹی آواز میں کہا: "نی، آسانی سے کام نہ ہو گا تو میں تمھارے ساتھ بلاتکار کروں گا... میں تمھارے ساتھ..."

میں اور سننے کو بیٹھ نہ سکا۔ مجھے لگا، روبی کے گیت والے سورج کے دیس کے اس ٹاپو پر کوئی بھیانک حادثہ ہونے والا ہے۔ کل شام سانتا کلاز جیسی ڈاڑھی والے میرے ایک پڑوسی کہہ رہے تھے کہ یسوع نے ایک پیشین گوئی کی تھی:

Husbands shall rob their wives and wives shall...

میں کل ہی ان کے اس فقرے میں ایک تبدیلی کروں گا: راب نہیں، ریپ۔

Husbands shall rape their wives and wives shall...

❁❁

مدرا راکھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

خرگوش

گولی چلنے کی آواز اتنی تیز نہیں رہی ہوگی جتنی دھمک دکھ کی انجو نے محسوس کی۔ میجر کھیرا ابھی بندوق کو جوں کا توں ہی لیے کھڑے تھے۔ اس کی پتلی نلی سے دھویں کی لکیر پھوٹ رہی تھی۔ دو پل مُن سی کھڑی رہنے کے بعد انجو نے اپنی بانہوں میں اچانک تھرتھرا کر زم ہو گئے سفید جسم کو دیکھا۔ جسم سے نیچے بھی اس کی سرمئی ساڑی کی سلوٹوں کے اوپر کمر سے نیچے تک گہرے سرخ خون کی دھار کھنچ گئی تھی۔

انجو کے حرکت کرنے کے بعد میجر کھیر نے بھی ہاتھوں کو جھٹکے کے ساتھ بندوق سمیت نیچے کیا اور پھونک مار کر اس کی نلی کو صاف کیا۔ پھر بڑی بے باکی کے ساتھ بھاری بھاری قدم رکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آئے۔ نزدیک آ کر انھوں نے رومال سے ایک خالی کرسی کو صاف کیا اور دوسری کرسی پر بندوق ٹکاتے ہوئے آرام سے بیٹھ گئے۔ بڑے ہی اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولے، ''تم شاید ڈر گئی ہو گئی کہ گولی تمھیں ہی نہ لگی ہو۔ بٹ آئی ٹیل یو، درخت پر بیٹھی ہوئی چڑیا کی آنکھ کا بھی نشانہ لگا سکتا ہوں۔ بائی دَوے، آج کھانے میں کیا بنا ہے؟''

انجو نے اچانک ایک گہری سانس لی اور ہاتھ میں گولی سے مرے خرگوش کو کسی تھیلے کی طرح یوں لٹکا لیا جیسے اس چیز سے کبھی اس کو کوئی لگاؤ رہا ہی نہ ہو۔ پھر تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

عجیب بے رحم خاموشی اور شکست خوردگی کے ساتھ انجو میجر کھیر کے ساتھ دوپہر کے کھانے کی میز پر بیٹھی۔ کھیر نے نیپکن اپنے گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے کسی ندیدے کی طرح طشت کے سامان کو

سونگھنا شروع کیا۔ ''بائی گاڈ، کھانے کی خوشبو کا کمال ہے۔''

''یو وِل لائیک ڈکری۔ اِٹس فار یو۔ تمھارے مارے ہوے خرگوش کے گوشت سے بنی ہے،'' انجو نے اتنی سرد آواز میں کہا کہ کھیر کے ٹخنوں کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ غیر ارادی طور پر انھوں نے نیچے میز کے پایوں کے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ انھیں لگا جیسے انجو کی بات کے ساتھ ہی ساتھ کوئی ویسا ہی سفید خرگوش اچھلتا ہوا ان کے نزدیک سے گزر گیا ہو۔ لیکن اتنی بات سننے کے بعد کیا وہ گوشت یوں ہی چھوڑا جا سکتا تھا؟ میجر کھیر نے اسے اس طرح کھایا جیسے اس سے بدلہ لے رہے ہوں۔ انجو نے اسے چھوا بھی نہیں۔ کھیر نے اس سے کھانے کو پوچھا بھی نہیں۔

کھانا ختم ہونے پر انجو نے بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوے پوچھا، ''ہاؤ ڈِڈ یو لائیک اِٹ؟''

''آں...؟ کیا؟''

''میرا مطلب ہے، گوشت کیسا لگا؟''

میجر کھیر نے نل میں دھلتے اپنے ہاتھوں سے نگاہ ہٹا کر سیدھے اس کی طرف دیکھا۔ بیسن سے الگ ہوے اور اس کے سامنے آ کھڑے ہوے۔ اپنے قد سے بہت اونچے میجر کھیر کی طرف انجو نے بھی دیکھا۔ اچانک کھیر نے اپنے چوڑے پنجوں میں اسے دبوچ لیا، جیسے ان کے مضبوط بازو اس کی دھجیاں اڑا دینا چاہتے ہوں۔ اچانک انھوں نے اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ گاڑ دیے۔ انجو نے چہرہ گھمانا چاہا، جسم الگ کرنا چاہا، لیکن پھر وہ بھی اپنی گود میں مارے جانے والے خرگوش کی طرح پرسکون ہو گئی۔ الگ ہو کر میجر کھیر نے اس کی طرف دیکھا نہیں۔ مڑ کر اسٹڈی کی طرف چلے گئے۔

تین دن اور... یا تین بھی کیوں، صرف ڈھائی دن، تیسرا سفر کی تیاری میں بیتے گا۔ پچھلا دن، یا یوں کہا جائے کہ آنے کے بعد پہلی یہ رات اچانک ایسے بیت گئی جیسے ان کے دیکھتے دیکھتے ان کی جیب کٹ گئی ہو۔ اور کیا! نان فیملی ایریا کی اس لمبی پوسٹنگ سے مشکل سے گنے چنے دنوں کے لیے لوٹے میجر کھیر ڈنر کے بعد ذرا دیوان پر لڑھکے تو بس صبح ہی نیند ٹوٹی، جب انجو نہا رہی تھی۔ ڈب ڈب... جھاگ والے ٹب میں مچھلی کی طرح کروٹیں لیتی انجو۔

''انجو پلیز... ایک منٹ، پلیز... ذرا سا کھولو نا دروازہ۔''

Scanned with CamScanner

... میجر کھیر دیر تک باتھ روم کے دروازے چابی والے سوراخ پر بار بار بیتابی سے آنکھیں گڑاتے ہوئے دبی لیکن بے چین آواز میں پکارتے رہے۔ لیکن دروازہ کھلا تو انجو لمبے چوڑے ٹاول میں باقاعدہ لپٹی ہوئی باہر آئی۔ میجر کھیر ایک لمحے کے لیے اس کے جسم پر جھپٹتے جھپٹتے رکے، پھر دھیرے سے واش روم کے اندر چلے گئے۔ بہت دیر تک وہ برش کرتے رہے، پھر انھوں نے شیو بنایا اور پھر اس کے بعد سارے کاموں میں ایک لمبا وقت گزرا۔ اخبار پڑھتے وقت پہاڑی ناشتے کے لیے کہنے آیا تو بہت دیر تک انھوں نے دھیان نہیں دیا، حالانکہ یہ سچ ہے کہ اخبار نگاہوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ کچھ بھی پڑھ نہیں رہے تھے۔ پھر اچانک ان کا دماغ کچھ جھٹکے کے ساتھ بدلا۔ شاید انھیں یاد آیا کہ صرف ڈھائی دن اور باقی بچے ہیں اور اس بیچ انجو کے ساتھ لیٹنا تو دور، اسے چھوا بھی کم ہی ہے انھوں نے۔ پیروں میں سلیپر پھنساتے ہوئے وہ میز پر آئے۔

ان کے پہنچتے ہی پہاڑی تازہ چائے کی کیتلی رکھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد انھوں نے غور کیا کہ ان کے سامنے صاف کپ کی بجائے ایک جھوٹی بڑی پلیٹ اور پی کر خالی کیا گیا کپ بھی ہے۔ یعنی اجو ناشتہ کر کے جا چکی ہے۔ ہاتھ کی چھری وہ پٹکتے پٹکتے رک گئے۔ پہاڑی کو آواز دے کر پوچھا تو معلوم ہوا، میم صاحب کورٹ یارڈ میں خرگوشوں کے پاس گئی ہیں۔

جیسے غصہ پیا ہو، چائے نہیں، اس طرح کھیر ناشتہ نمٹا کر اٹھے۔ پہلے اُدھر جانے لگے، لیکن پھر مڑ گئے۔ آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ صرف ڈھائی دن ہیں۔ خرگوشوں کے پاس انجو شاید ایک آدھ گھنٹہ بتائے؟ ہوسکتا ہے دوپہر میں انجو آئے؟

لیکن ایک آدھ گھنٹہ نہیں، پورے دو گھنٹے بیت گئے۔ آہستہ سے اٹھ کر وہ بنگلے کے پیچھے کی طرف گئے۔ چہار دیواری کے قریب لگے اونچے کامنی کے درخت کے نیچے انجو ایک خرگوش کو لیے کھڑی اسے کچھ کھلا رہی تھی۔ ان کی موجودگی انجو نے جانی یا نہیں جانی، پر اس نے ادھر دیکھا نہیں۔ لیکن اسے اس سے واقف کرنے کے لیے وہ تھوڑی اونچی آواز میں، کھو کھلے پن سے ہنسے۔

انجو نے پھر بھی ادھر نہیں دیکھا۔ تب انھوں نے کچھ اور اونچی آواز میں وہیں سے کہا، ”اے سینٹی مینٹل لیڈی وِد اٹینڈر ریسٹ!“

انجو نے پھر بھی نہیں سنا۔ لیکن کیا یہ سچ ہوسکتا ہے کہ اس نے نہ سنا ہو؟ اتنے تیز بولے گئے

الفاظ ذرا بھی اس کے کان کو نہ چھو سکے ہوں؟

تھوڑا سا انتظار کرنے کے بعد وہ اندر لوٹ آئے۔ لمبے ہولسٹر میں بند ائیر گن نکالی، اسے توڑ کر سوراخ اور ٹرِگر کی جانچ کی اور پھر لوڈ کر لیا۔

اے سینٹی مینٹل لیڈی ود اٹینڈر بیسٹ! انجو نے میجر کھیر کو وہی خرگوش کھلا دیا۔ دوپہر چڑھتی جاتی ہے اور ٹینڈر بیسٹ ان کے اندر اپنے پنجے کھرونچتا ہے۔ لگتا ہے جیسے اسے وہیں پیٹ کی تھیلی کے اندر کوئی ذبح کرنے کے لیے دوڑا رہا ہو۔ میجر کھیر اب اندر ہی اندر گھٹنے لگے۔ آخر کیوں؟ بات ایسی بھی کیا ہوئی ہے؟ کل آنے کے بعد میجر نے صرف کل، وہ بھی بالواسطہ، ماسٹر سے فرصت پا لینے کی درخواست کی تھی۔ یہ ضرور سچ ہے کہ ناچ سکھانے آنے والے ماسٹر کی وجہ سے وہ تھوڑا توازن برقرار نہ رکھ سکے تھے لیکن ظاہر تو کچھ بھی نہ ہونے دیا تھا۔ صرف اتنا چاہا تھا کہ ان تین دنوں میں وہ نہ ہی آتا تو اچھا تھا۔ ویسے وہ تو خود جانتے ہیں کہ ان کے مہینوں باہر رہنے کے دوران انجو کو کچھ نہ کچھ وقت بتانے کے لیے چاہیے ہی۔ یہ بھی انھیں لگا تھا کہ جانے کیسے میرا، انجو کی بڑی بہن، نے بھی ناچ سیکھنا ہی ضروری سمجھا تھا اور اب انجو بھی...

لیکن پھر بھی، آخر ہوا کیا؟ انجو کے اس عجیب رویے کی وجہ؟ ٹہلتے ٹہلتے وہ پھر تھک کر بیٹھے تو اچانک انھیں لگا، شاید وہ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ بلا وجہ ہی کچھ نتیجے نکال رہے ہیں۔ نہیں، اتنا بے چین ہونے سے کام نہیں چلے گا۔

''ارے بھئی انجو!'' انھوں نے انتہائی نرم لہجے میں آواز دی اور خاموش ہو کر انتظار کرنے لگے۔ لڑکیوں کے بارے میں شاید وہ جلد باز ہو گئے ہیں، انھوں نے سوچا۔ دشمن اور رائفل کے ٹرِگر کے درمیان جتنی فارمیلٹی ہوتی ہے شاید اس سے کچھ کم ہی وہ بیوی کے تئیں نبھا رہے ہیں۔ اور پھر انجو...

میرا کے لیے جو رحم ان کے دل میں امنڈتا ہے اسے وہ انجو کے لیے پیار میں بدل کر کام چلا لینا چاہتے ہیں۔ سچ مچ انجو کی اس بہن کے لیے اب تھوڑا سا رحم آتا ہے ان کے دل میں۔ ممکن ہے اس کے بارے میں بھی جلدی کی ہو میجر نے۔ حالانکہ ممکن نہیں لگتا۔ انجو کو گھر پر ناچ سکھانے آتا ہے ماسٹر، اور میرا خود جاتی تھی سیکھنے۔

حیرت ہے کہ مہینوں کے بعد جب میجر کھیر گھر لوٹتے تھے تب بھی میرا سیکھنے جانا ضروری سمجھتی

Scanned with CamScanner

تھی۔لیکن کیوں؟ مہینوں کے بعد لوٹے میجر کھیر کے ساتھ کیا پہلی شام بھی پوری بتائی نہیں جاسکتی؟ یہ سچ ہے کہ شادی کے تھوڑے دن بعد میجر کو لگا جیسے ہر رات کچھ ادھورا رہ جاتا ہے، اور میرا کو بھی لگا کہ کہیں یہ ادھوراپن قسمت ہی نہ بن جائے۔ اور پھر جب جب کھیر چھٹی پر گھر لوٹے، انھیں محسوس ہوا کہ اس ادھورے پن کی کھائی بڑھتی جارہی ہے۔ ہوسکتا ہے بار بار ایک ہی طرح سے ایک ساتھ، ایک ہی جگہ سوتے رہنے کی وجہ سے اب جسموں میں نیاپن نہ رہ گیا ہو، اس لیے کچھ چھٹیاں انھوں نے دور ہوٹلوں، ڈاک بنگلوں میں بھی بتائیں۔لیکن وہاں وہ ادھوراپن اور بڑھ گیا۔فوج میں ان کے ایک افسر ساتھی نے ایک بار ان کی فکر کو بانٹتے ہوئے ایک اسپیشلسٹ کی طرح مشورہ دیا کہ ہر عورت تھوڑی سی طاقت کا استعمال چاہتی ہے، تھوڑا سا بیسٹ۔

تھوڑا سا بیسٹ... میجر کھیر کئی روز تک سوچتے رہے کہ وہ کہیں بیسٹ ہوسکے ہوں۔ چھٹی پر آئے اُس بار تو پہلی ہی رات میرا اس طرح چڑ چڑائی جیسے بلی کو کسی کتے نے گھیر لیا ہو۔ اس نے قریب قریب میجر کھیر کا چہرہ نوچ لیا تھا، بڑوٹ!

کچھ زیادہ بیسٹ ہو گئے تھے وہ کیا؟ دوسرے، تیسرے اور چوتھے روز کے بعد میجر کھیر بہت اداس ہو گئے، یا پھر پست ہو گئے۔ میرا اب انھیں بغیر بتائے ہی ناچ سیکھنے جانے لگی۔ لوٹتی بھی دیر سے تھی۔ لوٹتی تو تھکاوٹ بھی زیادہ ظاہر کرتی تھی۔ کیا کرتے کھیر؟ جھلاہٹ تو اب انھیں بھی ہو رہی تھی۔ اندر اندر ایک تشدد کا عنصر بھی امنڈ رہا تھا۔ اکتائے اور چڑے میجر کھیر نے ٹھیک آخری شام اس کا پیچھا کیا۔ وہ اب میرا کو ستانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب میرا کو معلوم ہو گا کہ میجر کھیر ان کی جاسوسی کر رہے ہیں تو وہ ضرور دکھی ہوگی، صرف اس لیے کہ اس پر شک کیا گیا۔ آخری شام اس کے باہر جانے کے بعد وہ خود بھی نکلے۔ تھوڑے وقفے کے بعد وہ اس ڈانس ماسٹر کے گھر پہنچے۔ معلوم ہوا وہ وہاں نہیں ہیں۔ میرا سچ مچ وہاں نہیں تھی۔ ماسٹر بھی نہیں تھا۔

میجر کھیر لوٹ آئے۔ حد ہے کہ انھوں نے پوچھا تو میرا نے صاف بتا دیا کہ وہ کہاں تھی اور کیوں تھی۔ اس کے بعد...

''تھوڑا سا بیسٹ!'' دوست نے کہا تھا۔ نہیں جانتے کہ وہ کچھ زیادہ بیسٹ ہوئے تھے یا نہیں۔ سات روز تک انھوں نے غم منایا تھا اور آٹھویں روز میرا کی چھوٹی بہن کو ڈھیر سا پیار کرنے

Scanned with CamScanner

کے بعد فوج کی طرف لوٹ گئے تھے۔

میرا کے خط، لگاتار خط۔نہیں، اس بار بیسٹ کی ضرورت نہیں۔اگر ہوگی بھی تو وہ ٹینڈر بیسٹ ہو کر ہی کام چلالیں گے۔اور پھر بیسٹ ضروری ہی کیوں ہو؟ میرا نے کئی قد آور کتّے پالے تھے۔میرا کی موت کے بعد میجر کھیر نے انھیں ہٹا دیا۔انجو کے لیے وہ ایک بار ایک جوڑا خرگوش لائے، سفید، ملائم...

اے سینٹی مینٹل لیڈی ود اٹینڈر بیسٹ! کھیر نے مرے خرگوش کے گوشت سے حلق تک آئی ابکائی کو دباتے ہوئے دوبارہ اسی نرم لہجے سے آواز دی، ''انجو!''

جواب پھر نہیں آیا۔سبھاؤ میں اور نرمی لاتے ہوئے بے حد آہستگی سے خود ہی اٹھے۔چہرے پر ضرورت سے زیادہ چوڑی مسکراہٹ لپیٹے ہوئے انجو کے کمرے میں گئے۔وہاں وہ نہیں تھی۔پھر اگلے کمرے میں دیکھا۔اس کے بعد انھوں نے باری باری سے سارے کمرے دیکھے اور آخر میں نظر دوڑاتے دوڑاتے ماتھے پر پسینہ محسوس ہوا۔

ہار کر پہاڑی سے پوچھا تو معلوم ہوا، میم صاحب تھوڑی دیر پہلے تیار ہو کر کہیں گئیں۔کہاں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔لیکن جواب انھیں تو چاہیے ہی۔جھٹکے کے ساتھ کپڑے پہن کر وہ باہر نکل گئے۔اس بار ماسٹر کے گھر وہ سیدھے نہیں گئے۔وہی ایک جگہ پہلے دیکھنی ہوگی، انجو کی بتائی ہوئی۔تھوڑی دیر اس اجاڑ اور جھاڑیوں، چٹانوں سے بھری جگہ بھٹکنے کے بعد ہی میجر کھیر کو پرچھائیاں ملیں۔انجو کی ایک سینڈل اٹھی ہوئی۔اس کے بعد بہت آہستہ سے آگے بڑھنے پر انھوں نے دو جوڑی ٹخنے زمین پر رگڑتے ہوئے دیکھے۔اتنے سرخ تلوے انجو کے ہی ہو سکتے ہیں۔لیکن پہلی مرتبہ میجر کھیر بیسٹ نہیں، صرف ٹینڈر رہ گئے۔مردانہ پیروں کے انگوٹھے اور انجو کی ایڑیوں سے رگڑتی نرم گھاس کو دیر تک دیکھتے رہے، اور پھر اچانک جب ان میں تھراہٹ کے ساتھ ٹھہراؤ آ گیا تو وہ تیزی سے مڑے اور لوٹ آئے۔بیچ میں کہیں رکے نہیں۔

لوٹنے کے بعد انھیں لگا، وہ تھکے ہوئے ہیں۔تھوڑا سا لیٹنے کے بعد وہ سوئے تو شام کا اندھیرا گھر چکا تھا۔لیکن اندھیرے کے ساتھ ایک عجیب قسم کا آدمی جاگ چکا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد میجر کھیر نے انتہائی ہمت کے ساتھ بتایا کہ وہ جانتے ہیں،

Scanned with CamScanner

وہ کل کہاں گئی تھی۔

''پھر کہنے کی کوئی خاص ضرورت؟'' انجو کے اس سرد جواب سے ایک بار ان کی ہمت پھر ٹوٹ گئی لیکن اچانک قہقہہ لگا کر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ہنستے ہوئے بولے، ''شاید تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اس سے ناراض ہوں۔''

''پھر؟''

''ارے! یو آر اگین ٹرائنگ ٹو گیٹ اسکویر! فار گاڈز سیک، میں تو بالکل کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔'' کھیر کے چہرے پر بولتے بولتے ایک سرخی آئی اور وہ خاموش ہو گئے۔ بہت لمبی خاموشی کے بعد وہ آہستہ سے بولے، ''آئی سے، آئی مین، کیوں نہیں تم اسے یہیں بلا لیتی ہو؟ یو، یو کین ہیو فن ہیر، جسٹ ہیر!''

''اینڈ یو ول وِٹنس دَ پرفارمنس، ہوں؟ یو!'' الفاظ غصے سے اینٹھ کر انجو کے ہونٹوں پر ہی رہ گئے۔

لیکن کھیر کا کام جیسے آسان ہو گیا۔ اسی طرح بے اثر آواز میں انھوں نے جواب دیا، ''مان لو کہوں ہاں۔ آئی ڈزائر اِٹ، بٹ پلیز...''

''واٹ پلیز! یو مین می میکنگ لو وِدھِم وائل یو وُڈ واچ اَس ڈوا اِٹ!'' وہ ہانپنے لگی۔ پھر جیسے اتنا بھی کافی نہیں ہوا۔ اس نے جھٹکے سے ہاتھ سے سامنے رکھی پلیٹ فرش پر پٹک دی اور لپک کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میجر کھیر کچھ دیر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ سے اٹھے۔ کسی مریض کی طرح دھیرے دھیرے چل کر وہ اسٹڈی تک پہنچے۔ مکان میں بھیانک سناٹا چھایا رہا۔ تھوڑے وقفے سے ایک زوردار دھماکا ہوا۔ درختوں کے پرندے بری طرح پھڑ پھڑا کر اڑے لیکن باقی کہیں کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ سناٹا جوں کا توں چھایا رہا۔ اسٹڈی کے ادھ کھلے دروازے کے اندر تک شام کی پیلی دھوپ سرک آئی۔ پیلی دھوپ میں ایک کالا لال دھبا چمک اٹھا۔ اس سے تھوڑا سا اور آگے ایک ننھی کالی سی چیز پڑی ہوئی تھی۔ شاید وہ پستول تھی۔

❀❀

مدرارا کھشس

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

کشتی

ہر شام، بالکل اسی وقت، پچھلی کھڑکی پر تھوڑا لٹک کر کھڑا ہونا جیسے ایک میکانکی عمل ہو گیا ہے۔

پیچھے چھوٹے اسٹول پر رکھی چائے ٹھنڈی ہونے میں وقت لگتا ہے۔ کبھی کبھی انھیں وقت کا صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا۔ تب وہ ضرورت سے زیادہ ٹھنڈی ہو گئی چائے بھی پی ڈالتے ہیں، بس تھوڑی گنگنی سی۔ ایک بار دانت کی تکلیف ہو گئی تھی اور ٹھنڈی یا گرم کوئی بھی چیز ناقابل برداشت ٹیس پیدا کر دیتی تھی، تبھی سے گرم چائے کی عادت چھوٹ گئی۔

کھڑکی سے اس وقت نیچے بہتا ہوا پانی بے آب کولتار کی سڑک سے گزرے پرانے ٹینکر سے بہتے چلے گئے موبل آئل سا دکھائی دیتا ہے، کہیں چوڑا، کہیں پتلا، کہیں بل کھایا، پھٹا ہوا سا۔

پانی کے اس بہاؤ کو انھوں نے پسند کبھی نہیں کیا لیکن اس سے پہچان بنا لی ہے۔ ٹھیک اپنی بیوی کی طرح۔ انھیں نہیں معلوم کہ وہ اسے پیار کرتے ہیں یا نہیں، پر وہ ان کی اپنی ہے۔

کچھ لوگوں کے لیے سمجھوتہ کتنی سطحوں پر ہوتا ہے۔ وہ کبھی ایسے مکان میں نہ رہے جو کسی ندی یا جھیل کے کنارے ہو۔ ان کے افسر اعلیٰ ریور بینک کالونی میں رہتے ہیں۔ جس ندی کے کنارے ان کی کالونی ہے، اسی میں جا کر مل گیا ہے یہ نالا۔ اسے نالا ہی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اتنا چوڑا اور گہرا ہے کہ بارش میں ایک اچھی خاصی ندی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اسے نالا ہی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باقی موسموں میں بہت تیکھی تیزابی بدبو والے پانی کی ایک موٹی اور بے ڈھنگی لکیر بنی رہتی ہے، بہت

چوڑائی میں پھیلی، اوب ڈوب کرتی کالی ولدل کے اوپر سوروں کی پانت (ٹولی) کی طرح لوٹتی۔

اس بہت چوڑے اور گہرائی سے بہتے نالے کے دونوں کنارے پکی اینٹوں سے بنے ہیں اور کہیں انھی پر پیٹھ ٹکا کر اور کہیں تھوڑا ہٹ کر، دونوں طرف مکان ہیں۔ دور تک ٹین، کھپریل، پکی چھتیں اور یہاں تک کہ پولیتھین کی پھٹی چادریں اوڑھے۔

ہر مکان کے پیچھے ایک سپاٹ کھڑکی یا جھروکا ہے اور نیچے کی طرف گندگی نالے میں گرانے والا سوراخ، کائی اور سڑک کی کالک اگلتا ہوا۔ ہر گھر جیسے وہاں بیٹھا ہوا دیر سے اپنا پیٹ صاف کر رہا ہو۔ نالا دور تک جوں کا توں چلا گیا ہے اور آگے آسمان کو پھاڑ کر اس میں سما گیا ہے۔ بارش کے بادل یہیں اٹھتے ہیں اور وہیں ٹھہرے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ بڑھ کر مکانوں پر چھا جاتے ہیں تو سہرن (کپکپی) سی ہوتی ہے کچھ سے اندھیرے کی اور سیلن کی۔ بادل شام کو جب بھی رنگین ہوتے ہیں تو نالے کے اس پانی کے پھیلے ہوئے چیتھڑے پر بھی جھلکتے ہیں۔ تب وہ تیزابی بدبو بھول جاتی ہے۔

یہ سب اتنا برا تو نہیں ہے، اور ان کا اندازہ ہے کہ ریور بینک کالونی کے دیال صاحب کے گھر سے دکھائی دینے والی ندی اس سے کچھ بہت زیادہ اچھی نہیں دکھتی ہوگی۔ تھوڑا پانی زیادہ اور کچھ چوڑائی میں بڑھا ہوا۔ لیکن بادلوں والی شام کا رنگ وہاں اس سے بہت زیادہ چٹکیلا کیا ہوگا۔

ہاں، چھت پر چڑھ جانے کے بعد یہ منظر تھوڑا بدل جاتا ہے۔ آسمان تو ویسا ہی رہتا ہے۔ آس پاس، دور تک چلی گئی کباڑ لدی چھتیں بھی ویسی ہی رہتی ہیں۔ پر نیچے کا نالا ایک عجب دہشت سی پیدا کرتا ہے۔ کبھی انھوں نے سند باد کے سفرنامے پڑھے تھے۔ اس کتاب میں سند باد ایک بار موت کی گھاٹی کے کنارے جا پہنچتا ہے۔ وہ گھاٹی کیسی تھی، یہ یاد نہیں۔ لیکن چھت سے نالا کافی ٹھنڈا لگتا ہے، موت کی طرح، ہزاروں برس کے نرک کی طرح سڑتا ہوا۔

لیکن ریور بینک کالونی کی ندی کون سی کم ڈراونی لگتی ہے۔ پل پر کھڑے ہو تو آنتوں کو کھینچنا شروع کر دیتی ہے۔

پیچھے والی جس کھڑکی سے وہ جھانک رہے تھے، اس پر لٹکا بھورا سا کپڑا انھوں نے باقاعدہ کھینچ دیا۔ وہ کھینچ دینے پر گھر بدل جاتا ہے۔ پورا مکان نالے کے کنارے سے کھسک کر شہر کے بیچ آ بیٹھتا ہے۔

انھوں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ کرسیاں وغیرہ تھوڑا پیچھے ہٹانی ہوں گی۔ پیچھے تو خیر نہیں ہٹ پائیں گی۔ جگہ نہیں ہے۔ پر بیچ سے کڑھے ہوئے کیسمنٹ سے ڈھکی میز وغیرہ ایک کنارے کرنی ہوگی۔ اتنے بھر سے جگہ نکل آئے گی۔ تھوڑی سی ورزش کے لیے وہ کافی ہوگی۔ زیادہ کسرت کی ضرورت تو نہیں ہوگی۔ بدن میں ابھی مضبوطی بنی ہوئی ہے۔ پٹھوں میں کساؤ ہے۔ پھرتی بھی ہے۔ کشتی کے داؤ پیچ وہ بھولے نہیں ہیں۔ لیکن داؤ پیچ سے زیادہ ضروری ہے سہن شکتی (قوتِ برداشت) اور حوصلہ۔ وہ دونوں ہیں۔ پھیپھڑوں میں سانس بھرنے کی صلاحیت بڑھانی ہوگی۔ اتنا کافی ہے۔

دیال کو کشتی میں ہرانا مشکل کام نہیں ہے۔ اُن کے بال سفید ہی زیادہ ہیں۔ غور کرنے پر یقین ہوسکتا ہے کہ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ ہانپتے ہیں۔ سانس پھولنے لگتی ہے، بھلے ہی اتنی زیادہ نہیں۔ ان کا کمرہ اگر دوسری یا تیسری منزل پر ہوتا تو سانس خاصی ہی پھولتی۔ کشتی میں اگر انھیں صرف تھوڑی دیر روکا بھر جاسکے تو وہ بے دم ہو جائیں گے۔ اتنی سانس پھول جائے گی کہ انھیں گرایا جاسکے۔

لیکن کیا یہ سب سچ ہے؟ کشتی ہوگی؟ ٹائپسٹ کلرک ستیش بہادر اور آفس انچارج دیال کے بیچ کیا اس طرح کی کشتی دفتر میں سارے کارندوں کے سامنے سچ مچ ممکن ہے؟

اُس دن ڈائرکٹر صاحب دفتر کا معائنہ کر رہے تھے۔ ہر کمرے کا، ہر کارندے کا۔ وہ تیسری منزل پر بھی آئے۔ ان کے ساتھ ڈپٹی ڈائرکٹر اور آفس انچارج بھی تھے۔

ستیش بہادر نے کھڑے ہو کر انھیں دھیان سے دیکھا تھا۔ ڈائرکٹر کے ساتھ آئے دیال کچھ عجیب ہی لگ رہے تھے۔ ان کی طاقت بڑھ گئی تھی اور بدن چھوٹا ہو گیا تھا۔ ڈائرکٹر کے ساتھ وہ ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ بڑے افسر کے ساتھ نہیں، کسی ہنٹر کے ساتھ آئے ہوں، لیکن وہ ہنٹر کچھ اتنا وزنی اور بڑا ہے کہ اسے لٹکانا نہیں، ڈھونا پڑ رہا ہو۔

اسی جگہ ستیش بہادر بول پڑے، ''سر، یہ ٹائپ رائٹر...''

''ٹائپ رائٹر؟ کیا ٹائپ رائٹر؟'' دیال نے تھوڑے تیکھے پن میں ہنٹر ادھر گھمایا۔ ڈائرکٹر صرف مسکرائے، ہلکی سی سوالیہ نگاہ کے ساتھ۔

''اس میں سر، دو حروف خراب ہو گئے ہیں۔ اسپیس...''

Scanned with CamScanner

''میں اس میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں پیچ کش لے کر بیٹھوں گا کیا؟ اسے ٹھیک تو ہونا چاہیے۔ کیوں نہیں ہوا؟'' ڈائرکٹر نے بہت ملائمت سے، کسی کو چوٹ نہ لگے پر دھکا محسوس ہو، ایسے کہا۔

''لکھ کر دینا چاہیے تھا سر۔ میں جانتا ہوں، کام نہ کرنا ہو تو ٹوٹا ٹائپ رائٹر لیے بیٹھے رہو۔''

''نہیں سر، میں نے تو لکھ کر دیا تھا۔''

''انھوں نے تو لکھ کر دیا تھا۔'' ڈائرکٹر تھوڑا مزہ لیتے ہوئے بولے۔ ''اب بتایئے؟''

''بالکل جھوٹ ہے۔ میری میز پر کوئی کاغذ نہیں اٹکتا۔'' دیال نے کہا اور ستیش بہادر کو گھورنے لگے۔

''دیال صاحب کی میز پر کوئی کاغذ نہیں اٹکتا... '' ڈائرکٹر مسکرائے۔ ''ڈراور میں...''

لوگ بہت مہذب طریقے سے مسکرائے۔ ستیش بہادر نے پھر کہا، ''سر، میں نے اس کے بعد دوبارہ اور لکھ کر دیا۔ ایک رپورٹ تو کل ہی دی ہے سر۔''

''وہ بھی ان کی میز پر نہیں ہوگی۔ پھر کہاں گئی دیال صاحب؟''

ڈائرکٹر اس گفتگو میں کھیل کا سا مزہ لینے لگے۔

دیال کی کنپٹیوں پر پریشانی رینگنے لگی۔ ''جھوٹ مت بولو۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔''

''ظاہر ہے، جھوٹ سے نفرت ہونا اخلاقی پاکیزگی کی نشانی ہے...'' ڈائرکٹر اس بار اچھی انگریزی میں پرانی ہی سنجیدگی سے بولے۔

ستیش بہادر کچھ زیادہ ہی گھبرا گئے۔ انھیں لگا، اگر وہ اپنی بات ثابت نہ کر پائے تو یہیں، ابھی، کوئی خوفناک مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ وہ اور نرمی لیکن مضبوط لہجے میں بولے، ''میں نے کل ٹائپ رائٹر کے بارے میں رپورٹ دی۔ اسے آپ نے پڑھا بھی تھا۔ آپ کو یاد ہوگا صاحب۔ اور پھر آپ نے صاحب، اسی پر رکھ کر مونگ پھلی کھائی تھی۔ دو مونگ پھلیاں نیچے لڑھک...''

''یہ کیا بکواس ہے؟'' دیال نے ہلکے سے ڈانٹا۔ ڈائرکٹر اسی طرح مسکراتے ہوئے بولے، ''لیکن اس پر مونگ پھلی کیوں کھائی آپ نے؟ بادام، کاجو بھی کھا سکتے تھے۔ یا پھلوں کی چاٹ بھی تو نیچے ملتی ہے۔ اس سے دماغ کو طاقت ملتی ہے۔ پھلوں میں وٹامن زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ پھل نہیں کھاتے ہیں؟ یا ہری سبزی؟''

''جی کھاتا ہوں سر، مگر میں اِسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ کام ہی نہیں کرنا چاہتا...''

''ہوں، یہ تو مشکل مسئلہ ہے۔ ستیش بہادر صاحب کام نہیں کرنا چاہتے اور دیال صاحب کی میز پر کوئی کاغذ نہیں رہتا۔''

ڈائرکٹر سوچنے کا ڈرامائی انداز بناتے ہوئے بولے، ''یہ تو مشکل ہے۔ فیصلہ ہو کیسے؟ کیوں صاحب؟''

ڈائرکٹر نے اپنی تعریف کی متھی کمرے میں ادب اور مسکراہٹ کے اسٹولوں پر کھڑے باقی لوگوں کی طرف کر دی۔ وہ صرف مسکراتے رہے، بولے کچھ نہیں۔

''ایک راستہ ہے مسٹر دیال۔ آپ کبھی کشتی لڑتے تھے۔ لڑتے تھے نا؟''

''جی ہاں صاحب۔''

دیال کے لیے یہ سب سے دلچسپ بات تھی۔ کشتی میں کب کیا داؤ لگانا چاہیے، اس کی تفصیل دیتے ہوئے وہ اکثر اپنی جانگھ پر ہاتھ مار کر اپنے عالیشان ماضی کی تصویر کھینچتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کو آج بھی للکار دیتے تھے۔ ''بڑا گمان ہے جوانی کا؟ آؤ، دو دو ہاتھ ہو جائیں...''

ڈائرکٹر اور زیادہ مسکرائے۔ ''آپ مسٹر ستیش بہادر کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیجیے۔''

''جی تو کرتا ہے صاحب...''

''مگر ستیش صاحب بھی کسرتی لگتے ہیں۔ اٹھا پائیں گے؟''

''برجو استاد سے کشتی سیکھی تھی میں نے۔ مجھ سے پکڑ کرنے میں بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے سر۔''

''تو ہو جائے۔''

''جی؟''

''ہو جائے کشتی!''

''سر، یہ بڑا دلچسپ ہوگا...'' کمرے کے باقی لوگوں نے خوشی اور جوش سے کہا۔ دیال صاحب سٹپٹا گئے اور انھوں نے سختی بھری نگاہیں کمرے کے لوگوں پر ڈالیں، لیکن لوگوں کی دلچسپی پہلے کی طرح بنی رہی۔

Scanned with CamScanner

''تو ہو جائے پھر؟ ابھی ہو؟''

غصے کو دباتے ہوئے دیال ہاں کہتے کہتے رک گئے، پھر بولے،'' کیوں صاحب، انھیں پٹخنی دلوانا چاہتے ہیں۔ چھوڑیے...''

''یہ تو پیچھے ہٹنا ہوا دیال صاحب۔'' ڈائرکٹر خاصا مزہ لینے لگے۔ معاملہ اتنا دلچسپ تھا کہ ایک بار شروع ہوا تو آگے بڑھتا ہی گیا۔ دیال کی آنکھوں میں غصے کی بجائے بے بسی جھانکنے لگی۔ ہلکی سی ہی سہی، انھیں امید تھی کہ یہ بات مذاق میں ہی ختم ہو جائے گی یا کمرے میں موجود کوئی ان کے بچاؤ کے لیے اس کھیل کو ملتوی کرانے کی کوشش کرے گا۔

لیکن کمرے کے سبھی لوگ اچانک ہی اس معاملے میں افسر انچارج کے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ اس کا مزہ لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ممکن ہے کہ اس کشتی میں دیال جیتیں لیکن ان سے لڑنے کا جو موقع ٹائپسٹ ستیش بہادر کو ملنے والا تھا، اتنے سے لگ بھگ سب کا بدلہ چکنے جارہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں موجود سبھی لوگوں کو دیال سے ملنے والی تکلیفیں یاد آ گئی تھیں۔

دیال بولے،'' دیکھیے سر، میں ان سے لڑ تو سکتا ہوں، میں ان کو اچھی طرح پٹکوں گا، لیکن ذرا مہینے بھر کا ریاض تو کر لینے دیجیے۔ برسوں سے تو یہاں فائلیں نمٹا رہا ہوں۔''

''مہینے بھر کا ریاض واجب ہے۔ تو رہی دیال صاحب! آج تاریخ ہے سات۔ اگلے مہینے کی چھ تاریخ پکی رہی۔ طے؟'' ڈائرکٹر نے باقی لوگوں کی طرف دیکھا۔ لوگ بہت خوش تھے۔

دیال نے انھیں پھر گھورا۔ اس بار ان کی آنکھوں میں وحشت بھرا چڑچڑاپن ابھر آیا تھا۔ اگر اردو شاعروں کے مطابق آنکھیں سچ مچ چھری یا تیر کا کام کر سکتی ہوتیں تو دیال دفتر کے بہت سے لوگوں کو اب تک بری طرح زخمی کر چکے ہوتے۔

اس حادثے کے بعد شروع کے دو تین روز لوگوں نے صرف اس دن ہوئے مکالموں کے مزے لیے۔ دیال کی گھبراہٹ کسی سے چھپی نہیں رہی تھی۔ اسے یاد کر کے بھی کئی روز لوگ خوش ہوتے رہے اور پھر سب کچھ بھول گئے۔ دفتر میں دیال کا رعب داب پھر پہلے جیسا ہی دکھائی دینے لگا۔ ٹھیک پہلے جیسی ہی خامیاں انھیں ماتحتوں کے کام میں ملنے لگیں۔ کبھی کبھی تو کوئی ماتحت صرف اس لیے بھی ڈانٹ کھانے لگا کہ وہ جملے میں کو ما لگانا بھول گیا تھا۔ دیال کو ماتحت کے کام میں جب کوئی

Scanned with CamScanner

بڑی غلطی نہیں ملتی تھی اور ڈانٹنے کے لیے انھیں کوما جیسی معمولی چیز کا سہارا لینا پڑتا تھا تو ان کا غصہ خاصا بڑھ جاتا تھا۔ تب وہ سب سے پہلے آج کی تعلیم پر تنقید کرتے تھے۔ اس کی بعد پوری نئی نسل کتنی کندذہن اور کام چور ہے، اس پر بنار کے بولتے تھے۔ اس کے بعد دیر تک وہ صرف ڈانٹتے رہتے تھے۔ اتنی دیر تک کارندے کو کھڑا رہنا ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں یہ بھی ممکن ہوتا تھا کہ وہ چیخ کر کہیں،
''اب میری کھوپڑی پر کیوں کھڑے ہیں؟''
ظاہر ہے، کارندہ یہ سن کر وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرتا تھا۔ تب وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیختے تھے، ''اب جا کہاں رہے ہیں، ایں؟''
لوگ چونکہ اس سب کے عادی ہو چکے تھے اس لیے دھیرے دھیرے انھیں یہ دفتر نارمل لگنے لگا۔

اسی بیچ کشتی والی بات پھر تازی ہوگئی۔ ہوا یہ کہ ڈائرکٹر، جو بہت کم ہی لوگوں کو دکھائی دیتے تھے، ایک بار پھر دِکھ گئے۔ دراصل اِدھر دفتر میں دو ایسے واقعات ہو گئے کہ جن کی وجہ سے وہ دِکھے۔ ایک تو نیا سال آ گیا تھا اور دوسرے دفتر کا ایک پراجیکٹ بہت زیادہ کامیاب ہو گیا تھا۔ ان دونوں باتوں کے لیے ڈائرکٹر نے دفتر کے سارے کارندوں کو اپنے بڑے سے کمرے میں بلایا تھا۔ مبارکباد دینے اور نیک خواہشات کا تبادلہ کرنے کے بعد انھوں نے دفتر کی چھوٹی موٹی باتیں بھی کیں، پھر نظر ستیش بہادر پر ٹک گئی۔ شرارت بھری مسکراہٹ ہونٹوں کے اندر دبا کر گمبھیر آواز میں انھوں نے پوچھا، ''ستیش بہادر جی، آپ کے ٹائپ رائٹر میں آ کی ماترا اب بھی غلط جگہ لگتی ہے؟''
''جی سر، وہ بات یہ ہے کہ مکینک ٹھیک تو کر گیا تھا مگر اب اس کا ربن ہی نہیں سرکتا،'' ستیش بہادر نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''ہوں۔ دیال صاحب...!'' انھوں نے دیال صاحب کی طرف دیکھا۔ دیال اس پل ہونٹ چبانے لگے تھے۔ ڈائرکٹر نے کہا، ''کتنی غلط بات ہے۔ میں بھی بھلکو ہو گیا ہوں۔ ارے بھئی، اُس کشتی کی تیاری تو آپ لوگ کر رہے ہیں نا؟ کب ہونی ہے کشتی؟''
''سر، چھ تاریخ کو...'' کارندوں کے چہروں پر اچانک ہی رونق آ گئی۔
دیال نے ناراض ہو کر کہا، ''سر، اس آدمی کو میں ابھی بتا دیتا اگر آپ کے سامنے یہ بدتمیزی نہ

Scanned with CamScanner

کہی جاتی۔''

''نہیں بھائی،'' ڈائرکٹر بولے،''کشتی تو ڈھنگ سے ہی ہوگی۔اور چھ تاریخ کو ہی۔''

انھوں نے کیئر ٹیکر کو تفریح والے کمرے میں گدوں کا انتظام کرنے کا حکم دیا اور دو ریفری بھی مقرر کردیے۔سیٹی لانے کا کام بھی سونپ دیا گیا۔یہاں تک کہ دو کارندے آنکھوں دیکھا حال بتانے کے لیے بھی مقرر کردیے گئے۔ٹیپ ریکارڈر اور کیمرا لانے کا کام اسٹور کیپر کے ذمے کردیا گیا۔

اس کے بعد دیال کو لگا،معاملہ سچ مچ گمبھیر ہے۔وہ خود ستیش بہادر کا ٹائپ رائٹر دیکھنے اس کے کمرے میں آئے۔اسے غرّاتی ہوئی آواز میں گھور کر بولے،''ربن تو مجھے تم لوگوں کے دماغ کا ٹھیک کرنا پڑے گا۔اور تم اس بھرم میں مت رہنا کہ کشتی کا تماشا کر کے معاملہ ختم ہو جائے گا۔بہت برداشت کرلیا ہے میں نے۔کام چوری نس نس میں بھری ہے۔کشتی لڑیں گے!ایسا پٹکوں گا کہ ہڈیاں بٹورنے نہیں ملیں گی۔یہ مت سمجھ لینا کہ میری عمر زیادہ ہے اس لیے جیت جاؤ گے۔''

وہ دیر تک اسی طرح بولتے رہے۔دراصل اس طرح وہاں آکر ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا ایک خاص مقصد تھا،وہ ان کے جسم کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ستیش بہادر کی عمر تو ابھی کم تھی ہی،صحت بھی ٹھیک ہی تھی۔بلکہ بدن میں ایک طرح کی کساوٹ اور مضبوطی تھی کیونکہ وہ کالج میں کھیل کود میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔یہاں تک کہ ان کا خیال تھا کہ اگر ان کے ساتھ ناانصافی نہ کی جاتی اور پڑھائی کے دوران شادی نہ ہو جاتی تو وہ ایک اچھے پیشہ ور کھلاڑی ثابت ہوتے۔

دیال انھیں ڈانٹ کر یا ان کی جسمانی طاقت کا جائزہ لے کر چلے گئے۔ان کے جانے کے بعد ستیش بہادر مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔انھیں اس بات کا گہرا دکھ ہو رہا تھا کہ بہت مشکل سے ملی اس نوکری کی ساری خوشی ان کا یہ ٹائپ رائٹر کھا گیا تھا جو ان کے سامنے آنے کے بعد سے آج تک کبھی ٹھیک نہیں ہوا تھا۔وہ ٹائپ رائٹر نہ صرف بگڑا رہتا تھا بلکہ بدصورت بھی کافی تھا۔دور سے دیکھنے پر وہ ٹائپ رائٹر کم،ایک بے ڈھب ہتھ کرگھا زیادہ لگتا تھا۔اس مشین پر کام کرنے میں ان کی عدم دلچسپی کی اور دوسری وجوہات بھی تھیں۔

پڑھائی کے دوران جیسا کہ ہر نوجوان کے ساتھ ہوتا ہے،وہ خاصے سہانے سپنے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔پڑھائی ختم کرنے کے بعد کبھی اپنے کو ایک افسر پاتے تھے،کبھی بہت بڑا پروفیسر،

لیکن پڑھائی ختم کرنے کے بعد اس ٹائپ رائٹر کے پاس بیٹھنے کی سہولت انھیں بہت زیادہ پریشانیاں اٹھانے کے بعد ملی تھی۔ تب تک ان کے بچے بھی ہو گئے تھے۔ سب سے بڑی پریشانی تو انھیں اس دن ہوئی تھی جس دن تبادلے پر وہ اس شہر بھیجے گئے تھے۔ دو مہینے تک تو رہنے لائق انھیں کوئی جگہ ہی نہیں ملی تھی اور تب جا کر کہیں انھیں نالے کے کنارے بنے اس مکان کی اوپری منزل پر دو چھوٹے چھوٹے کمرے ملے تھے۔ شروع کے کچھ دن اس شہر کے گھر میں بہت ہی بھیانک تھے۔ اس نالے سے رات دن ایک تیکھی تیزابی بدبو اٹھتی تھی۔ صبح کے بعد اس میں ایک اور بدبو بھی مل جاتی تھی۔ پر دھیرے دھیرے وہ اس کے عادی ہو گئے۔ خاص طور سے اس لیے کہ جب کبھی اس تیزابی بدبو کو ہٹا کر تازہ ہوا کا جھونکا ادھر سے گزرتا تھا تو بہت زیادہ ہی سہانا لگتا تھا، جیسے کوئی آدمی بہت کڑوی چیز کھاتا رہے اور پھر اسے کچا آٹا بھی کھلا دیا جائے تو بہت میٹھا لگے۔ انھوں نے اپنی طبیعت کے اس طرح تبدیل ہو جانے کی ایک اچھی سی دلیل بھی کھوج لی تھا۔ وہ اکثر چائے پیتے وقت بیوی سے کہا کرتے تھے کہ اگر بدبو کا وجود نہ ہو تو خوشبو کا مطلب ہی کیا رہ جائے۔ اس نالے میں بجبجاتی ہوئی کیچڑ ہمیشہ بھری ہوتی تھی۔ ستیش بہادر ہمیشہ یاد دلاتے رہتے تھے کہ کنول بھی تو کیچڑ میں رہتا ہے، جو کہ محض ایک کہاوت تھی اور جھوٹ تھی۔ کنول بہت اچھے پانی میں کھلتا ہے اور کیچڑ میں صرف اس کی جڑ رہتی ہے۔ اور وہ کیچڑ بھی اس نالے جیسی گندی نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ ستیش بہادر نے کنول دیکھا ہی نہیں تھا۔

تو جناب، دیال کے جانے کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ کی طرح غمگین ہو گئے۔ تب ان کے سامنے بیٹھنے والے فائلنگ کلرک نے اپنا منھ کھولا، ٹھیک ایسے جیسے دیال کے کمرے میں آنے اور وہاں سے جانے اور منھ کے بند ہونے اور کھلنے کا کوئی خودکار تعلق ہو۔ اس نے کہا، ''کتا سالا! مگر ستیش، تمھیں اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سالے کے بدن میں دم نہیں ہے۔ بوڑھا تو ہو رہا ہے۔ اٹھا کر پٹکنا ذرا زور سے۔''

اس بات پر ڈسپیچ کلرک کا منھ بھی کھل گیا۔ ''ہے تو صحیح بات۔ بہت ڈینگ مارتا رہتا تھا، اب پتا چلے گا۔ مگر ستیش، تم ذرا ہوشیار رہنا۔ آدمی بہت کمینہ ہے۔ تمھاری رپورٹ بھی خراب کر سکتا ہے۔ سال ختم ہو گیا ہے نا...''

Scanned with CamScanner

''رپورٹ؟'' فائلنگ کلرک نے فوراً اپنا منھ بند کرلیا، کیونکہ سالانہ رپورٹ تو اس کی بھی لکھی جاتی تھی۔

''کردے رپورٹ خراب، پروا نہیں ہے۔'' ستیش ناراض ہوکر بولے۔'' اٹھا کر پٹکا نہیں تو میرا نام نہیں۔''

''مگر ابھی تو تمھارا پروبیشن ہے۔ دھیان رکھنا،'' ڈسپیچ کلرک ہمدردی دکھاتے ہوئے بولا۔'' نہ ہو تو تم ڈائرکٹر صاحب سے بات کرلو۔ وہ چاہیں گے تو دیال کیا، دیال کا باپ بھی کچھ نہیں کر پائے گا۔''

ستیش بہادر امکانات پر غور کرتے ہوئے بیٹھے رہے، دیر تک۔ دھیرے دھیرے انھوں نے پایا کہ ہر قیمت پر اس کشتی کے لیے تیار ہیں۔ جو بھی ہو، کشتی وہ لڑیں گے اور دیال کو پچھاڑیں گے۔

انھوں نے کمرے کے بیچ سے میز ہٹا دی اور باقاعدہ ورزش شروع کردی۔ پچھلی کھڑکی سے آتی بدبو وہ بھول گئے اور تب تک کسرت کرتے رہے جب تک پسینے سے نہا نہیں گئے۔

آخر چھ تاریخ آگئی۔ اس دن وہ تھوڑا جلدی ہی دفتر پہنچ گئے۔ انھیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہاں قریب قریب ہر کوئی اس واقعے کا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، انتظار کر رہا تھا۔ آس پاس کی میزوں کے لوگ ان کے قریب آ کھڑے ہوئے۔ وہ آج ان کی خاصی خاطر داری بھی کر رہے تھے۔

تبھی دیال وہاں آ گئے۔ تعجب ہے کہ اس بار ان میں سے کوئی بھی سٹپٹایا نہیں۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' دیال ہمیشہ جیسے رعب سے بولے۔

''کچھ نہیں سر، آج کشتی ہے نا...''

''بہت نوٹنکی مت کرو۔ کشتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کام ہی نہیں ہوگا۔ تم لوگوں کو تو حرام خوری کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ چاہیے۔ یاد رکھو، میں ایک ایک کو ٹھیک کردوں گا،'' وہ ناراضگی سے لوگوں کو گھورتے ہوئے بولے۔'' اور یہ بھی یاد رکھنا، سالانہ رپورٹ لکھنے کا بھی وقت آگیا ہے۔ میں ایک ایک کو ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں۔ سمجھے؟''

وہ چلے گئے۔ ستیش بہادر کو لگا، وہ رپورٹ والی بات انھی سے کہی گئی ہے۔

دوپہر کو بیچ مچ کشتی شروع ہوگئی۔ ڈائرکٹر ایک کرسی رکھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ستیش بہادر نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جو بھی ہو، دیال کو پٹخنی اچھی طرح دیں گے۔

Scanned with CamScanner

دیال بہت گمبھیر تھے۔

آخر سیٹی بجی۔ ہاتھ بڑھانے کی بجائے دیال نے ستیش بہادر کو گھورا۔ ڈائرکٹر نے ہی یاد دلایا کہ انھیں ہاتھ ملانا ہے۔ ہاتھ ملانے کے بعد دیال نے موقع نہیں دیا۔ کسی پیشہ ور پہلوان کی طرح لپٹ پڑے۔ لوگ شور مچا کر ستیش بہادر کو بڑھاوا دینے لگے۔ اس سے دیال کا غصہ اور بڑھ گیا۔ ستیش بہادر تھوڑا چوک جاتے تو نیچے آ چکے ہوتے، پر وہ جلد ہی سنبھل گئے۔ لوگوں کا شور انھوں نے سنا اور جھک کر دیال کو کمر سے اٹھالیا۔ دیال اچکچا گئے۔ انھوں نے چھٹپٹا کر ان کی پیٹھ پر ایک گھونسا مارا۔ ڈائرکٹر نے سیٹی بجائی۔ ''گھونسا نہیں چلے گا۔''

دیال کو اٹھا لینے پر شور اور بڑھا اور لوگ ان کے نیچے گرائے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ تبھی لوگوں نے دیکھا، ستیش بہادر کے گھٹنے مڑے، وہ دیال کو اسی طرح اٹھائے ہوئے بیٹھ بھی گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے لوٹ گئے۔ دیال نے اُتساہ میں آ کر انھیں رگڑ بھی دیا۔ لوگ غصے میں ستیش بہادر کو گالیاں دینے لگے۔

دیال بے حد خوش ہو گئے تھے۔

ستیش بہادر تیزی سے اٹھ کر بھیڑ میں گم ہو گئے۔ آج جب وہ لوٹے تو ایک تسلی انھیں ضرور تھی، انھوں نے اپنی سالانہ رپورٹ خراب ہونے سے بچالی تھی۔ بیوی کی چائے کا انتظار کرتے انھوں نے آج پھر پچھلی کھڑکی کھول لی۔ تھوڑی دیر وہ نیچے جھانکتے رہے، پھر پردہ کھینچ دیا۔ نالا کتنا زیادہ گندا ہے، انھوں نے سوچا، اور بد بو بھی کس قدر نا قابلِ برداشت۔

❀❀

اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: رحمٰن مصور

سرگم کولا

جیسے کتوں کے لیے کاتک کا موسم ہوتا ہے ویسے ہی آرٹ اور کلچر کے لیے جاڑے کا موسم ہوتا ہے دلّی میں۔ گوری چمڑی والے سیاح بھرے رہتے ہیں — کھلکھلاتے، ابلتے، چہکتے، رجھاتے، لبالب — ہمارے کلچر کے سب سے بڑے خریدار اور اسی لیے پارکھی۔ بڑے گھروں کی عورتیں، لپی پتی، کیلنڈر آرٹ — جن سے حقارت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے — جاڑے کی شامیں کسی آرٹ گیلری اور ناٹک دیکھنے میں گزارنا پسند کرتی ہیں۔ جاڑا آرٹ اور کلچر کا موسم ہے۔

سورج جلدی ہی ڈوب جاتا ہے اور نرم ملائم گرم کپڑوں سے ٹکراتی تازگی دینے والی ہوا آرٹ گیلریوں اور آڈیٹوریموں کے آس پاس مہک جاتی ہے؛ ایسی خوشبو جو نامرد کو مرد بنا دے اور مرد کو نامرد۔ لوگ آرٹ اور کلچر میں ڈوب جاتے ہیں۔ آرٹ اور کلچر لوگوں میں ڈوب جاتے ہیں۔

میوزک کانفرنس کے گیٹ پر چار سپاہی کھڑے تھے۔ اُوبے، اکتائے — ڈنڈے لیے۔ ان کے پیچھے دو انسپکٹر کھڑے تھے، گردن اکڑائے، کیونکہ ان کے سامنے چار سپاہی کھڑے تھے۔ پھر دو سوٹ دھاری تھے۔ سوٹ دھاریوں کے سوٹ ایک سے تھے۔ بنوائے گئے ہوں گے۔ سوٹ دھاری کافی ملتی جلتی شکل کے تھے۔ کافی مشکل سے کھوجے گئے ہوں گے۔

گیٹ کے سامنے بجری پڑا راستہ تھا۔ بجری بھی ڈالی گئی ہوگی۔ پھولوں کے گملے زمین کے اندر گاڑ دیے گئے تھے۔ نہ جاننے والوں کو تعجب ہوتا تھا کہ اُوسر میں پھول اگ آئے ہیں۔ اوپر کاغذ

Scanned with CamScanner

کے سفید پھولوں کی چادر سی تانی گئی تھی جو کچھ سال پہلے تک — کاغذ کے پھولوں کی نہیں، اصلی پھولوں کی — پیروں فقیروں کی مزاروں پر تانی جاتی تھی۔ پھر شادی بیاہ میں لگائی جانے لگی۔ دونوں طرف غلاف چڑھے بانس کے کھمبے تھے۔ ان غلاف چڑھے بانسوں پر ٹیوب لائٹیں لگی تھیں۔ اسی راستے سے اندر جانے والے جا رہے تھے۔ داس گپتا کو گیٹ کے بالکل سامنے کھڑے ہونے پر صرف اتنا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ جانے والے دکھائی دے رہے تھے، جو اونچے اونچے جوتوں پر اپنے قد کو اور اونچا دکھانے کی ناکام کوشش میں اس طرح لاپروائی سے ٹہلتے ہوئے اندر جا رہے تھے جیسے پورا اہتمام انھی کے لیے کیا گیا ہو۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں تھیں جن کی شکلیں ولایتی کاسمیٹکس نے ڈراؤنی سی بنا دی تھیں۔ لال ساڑی، لال آئی شیڈو؛ نیلی ساڑی، نیلی آئی شیڈو؛ کالی کے ساتھ کالا، پیلی کے ساتھ پیلا۔ جاپانی ساڑیوں کے پلو کو لپیٹنے کی کوشش میں اپنے ادھ کھلے سینے دکھاتی؛ کشمیری شالوں کو لٹکنے سے بچاتی یا صرف سامنے دیکھتی... یا جینز اور جیکٹ میں کھٹ کھٹ کھٹ۔ رئیسی کی یہی نشانیاں ہیں، داس گپتا نے من ہی من سوچا۔ گمبھیر، بھیانک روپ سے گمبھیر چہرے، خود اطمینانی سے تمتمائے، فخر سے دمکتے ہوئے؛ دولت، شہرت، عزت سے مطمئن، ناامیدی سے عاری۔ ''سالا کون آدمی اس کنٹری میں اتنا کانفیڈنس ڈیزرو کرتا ہے؟'' داس گپتا اپنی ڈیزرو کرنے والی فلاسفی بدبدانے لگے۔ سامنے سے بھیڑ گزرتی رہی۔ ہیپ لڑکیاں... عجیب عجیب طرح کے بال... گھسی ہوئی جینز... مرد مار لڑکیاں۔ ان کو سونگھتے ہوئے کتے... کتے ہی کتے... ڈاگی... ڈاگیز... سویٹ ڈاگیز۔

پروگرام شروع ہو گیا۔ بھیم سین جوشی کا گائن شروع ہو چکا تھا، لیکن داس گپتا کا کوئی جگاڑ نہیں لگ پایا تھا — بنا ٹکٹ اندر جانے کا جگاڑ۔

گیٹ، بجری پڑے راستے، سوٹ سے آراستہ استقبال کرنے والوں، پولیس انسپکٹروں اور سپاہیوں سے دور، باہر سڑک پر داہنی طرف ایک گھنے پیڑ کے نیچے عجب سنگھ اپنا پان سگریٹ کا کھوکھا رکھے بیٹھا تھا۔ تعجب کی بات ہے، مگر سچ ہے، کہ اتنے بڑے شہر میں داس گپتا اور عجب سنگھ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ داس گپتا گیٹ کے سامنے سے ہٹ کر عجب سنگھ کے کھوکھے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ سردی بڑھ گئی تھی اور عجب سنگھ نے تسلے میں آگ سلگا رکھی تھی۔

''دس بیڑی۔''

''تیس ہو گئیں دادا۔''

''ہاں، تیس ہو گیا۔ ہم کب بولا تیس نہیں ہوا۔۔۔ ہم تم کو پیسہ دے گا۔'' داس گپتا نے بیڑی لے لی۔ ایک بیڑی تسلے میں جلتی آگ پر سلگائی اور خوب لمبا کش کھینچا۔

''جگاڑ نہیں لگا دادا؟''

''لگے گا، لگے گا۔''

''اب گھر جاؤ۔ گیارہ بجنے کو ہیں۔''

''کیوں شالا گھر جائے؟ ہم کو بھیم سین جوشی کو سننے کا ہے۔۔۔''

''دو سادے بنارسی۔''

استاد بھیم سین جوشی کی آواز کا ایک ٹکڑا باہر آگیا۔

''ولز— کنگ سائز، یہ نہیں۔''

داس گپتا کھوکے کے پاس سے ہٹ آئے۔ اب آواز صاف سنائی دے گی۔۔۔ لیکن آواز بند ہوگئی۔۔۔ ایک آئیڈیا آیا۔ پنڈال کے اندر پیچھے سے گھسا جائے۔ بیڑی کے لمبے لمبے کش لگاتے وہ گھوم کر پنڈال کے پیچھے پہنچ گئے۔ اندھیرا پیڑ۔ وہ لپکتے ہوئے آگے بڑھے۔ ٹارچ کی روشنی۔

''کون ہے بے؟'' پولیس کے سپاہی کے علاوہ ایسے کون بولے گا۔

داس گپتا جلدی جلدی پینٹ کے بٹن کھولنے لگے۔ ''پیشاب کرنا ہے جی پیشاب۔'' ٹارچ کی روشنی بجھ گئی۔ داس گپتا کا جی چاہا ان سپاہیوں پر موت دیں۔ سالے یہاں بھی ڈیوٹی بجا رہے ہیں۔۔۔ پیشاب کی دھار سپاہیوں پر پڑی۔ پنڈال پر گری۔ چوتیے نکل نکل کر بھاگنے لگے۔۔۔ داس گپتا ہنسنے لگے۔

وہ لوٹ کر پھر کھوکے کے پاس آگئے۔ پاس ہی میں ایک چھوٹے سے پنڈال کے نیچے کینٹین بنائی گئی تھی۔ دو میزوں کا کاؤنٹر۔ کافی پلانٹ۔ اوپر دو سو واٹ کا بلب۔ ہاٹ ڈاگ، ہیمبرگر، پاپ کارن، کافی کی پیالیاں۔ داس گپتا نے کان پھر اندر سے آنے والی آواز کی طرف لگا دیے۔ سب اندر والوں کے لیے ہے۔ جو سالا میوزک سننے کو باہر کھڑا ہے، چوتیا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر بھی سالا نے ایسا لگایا

ہے کہ باہر تک آواز نہیں آتا۔ اور اندر چوتیے بھرے پڑے ہیں۔ بھیم سین جوشی کو سمجھتے ہیں؟ استاد کی تانیں انجوائے کر سکتے ہیں؟ ان سے اگر یہ کہہ دو کہ استاد جوشی تانوں میں مند سپتک سے مدھیہ اور مدھیم سپتک سے تار سپتک تک سُروں کا پل سا بنا دیتے ہیں، تو یہ سالے گھبرا کر بھاگ جائیں گے... یہ بات بھیم سین جوشی کو نہیں معلوم ہوگا؟ ہوگا، ضرور ہوگا۔ سالے سنگیت سننے آتے ہیں۔ ابھی دس منٹ میں اٹھ کر چلے جائیں گے... ڈکار کر کھائیں گے اور گدھے کی طرح پڑ کر سو جائیں گے۔

''دادا، سردی ہے،'' عجب سنگھ کی انگلیاں پان لگاتے لگاتے اینٹھ رہی تھیں۔

''شردی کیوں نہیں ہوگا۔ دشمبر ہے، دشمبر۔''

''اینٹا لے لو دادا، اینٹا۔'' عجب سنگھ نے داس گپتا کے پیچھے ایک اینٹ رکھ دی اور وہ اس پر بیٹھ گئے۔

جیسے جیسے سناٹا بڑھ رہا تھا، اندر سے آواز کچھ صاف آ رہی تھی۔ استاد بڑا خیال شروع کر رہے ہیں۔ داس گپتا اینٹ پر سنبھل کر بیٹھ گئے... پگ لاگنے دے... دھی دھی... دھاگے ترکٹ تونا کا تا دھاگے... ترکٹ دھی نا... یہ طبلے پر کون سنگت کر رہا ہے؟ داس گپتا نے اپنے آپ سے پوچھا۔ واہ، کیا جوڑ ہے!

''یہ طبلے پر کون ہے؟'' انھوں نے عجب سنگھ سے پوچھا۔

''کیا معلوم کون ہے دادا۔''

کتنی متانت اور سنجیدگی ہے۔ اندر تک آواز اترتی چلی جاتی ہے... تونا کا تا...

''تمھارے پاس کیمپا ہائے؟'' تین لڑکیاں تھیں اور چار لڑکے۔ دو لڑکیوں نے جینز پہن رکھی تھیں اور ان کے بال اتنے لمبے تھے کہ کمر تک لٹک رہے تھے۔ تیسری کے بال اتنے چھوٹے تھے کہ کانوں تک سے دور تھے۔ ایک لڑکے نے چمڑے کا کوٹ پہن رکھا تھا اور باقی دو رمی جیکٹ پہنے تھے۔ تیسرے نے ایک کالا کمبل لپیٹ رکھا تھا۔ ایک کی پینٹ اتنی تنگ تھی کہ اس کی پتلی پتلی ٹانگیں پھیلی ہوئی اور کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ لمبے بالوں والی لڑکیوں میں سے ایک لگاتار اپنے بال پیچھے کیے جا رہی تھی، جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تیسری لڑکی نے اپنی ناک کی کیل پر ہاتھ پھیرا۔

''تمھارے پاس کیمپا ہائے؟'' لمبی اور پتلی ٹانگوں والے لڑکے نے کینٹین کے بیرے سے

Scanned with CamScanner

پوچھا۔ اس کا ایکسینٹ بالکل انگریزی تھا۔ وہ 'ت' 'ٹ' اور 'ڈ' 'ی' کے ساتھ ملا کر بول رہا تھا۔ 'اے' کو کچھ زیادہ لمبا کھینچ رہا تھا۔

''نہیں جی، ابھی ختم ہو گیا...''

''او، ہاؤ سِلی!'' چھوٹے بالوں والی لڑکی ٹھنکی۔

''ہاؤ اسٹوپڈ کینٹین دے ہیو۔''

''وی مسٹ کمپلینٹ۔''

''لیٹس ہیو کافی سویٹیز،'' لمبی ٹانگوں والے نے ادا سے کہا۔

''بٹ آئی کانٹ ہیو کافی ہیئر!'' جو لڑکی اپنی ناک کی کیل چھوئے جا رہی تھی اور شاید ان تینوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی، بولی۔

''وائے مائی ڈیر؟'' لمبی ٹانگوں والا اس کے سامنے کچھ جھکتا ہوا بولا اور یہ بات باقی دو لڑکیوں کو کچھ بری لگی۔

''آئی آلویز ہیو کافی اِن مائی ہاؤس آر ان اوبرائے۔''

''فائن، لیٹس گو ٹو اوبرائے دین!'' لمبی ٹانگوں والا نعرہ لگانے کے سے انداز میں چیخا۔

''سر... سر، کیمپا آ گیا،'' کینٹین کے بیرے نے سامنے اشارہ کیا۔ ایک مزدور اپنے سر پر کیمپا کا کریٹ رکھے چلا آ رہا تھا۔

''او، کیمپا ہیز کم!'' دوسری دو لڑکیوں نے کورس جیسا گایا۔ اندر سے بھیم سین جوشی کی آواز کا ٹکڑا باہر آ گیا۔

''او کیمپا آ آ آ... ہیز کم!'' سب سر میں گانے لگے، ''کے اے اے اے ماپا آ آ آ... پار کرو، ارج سنو... او... پا آ آ آ... کیمپا آ آ آ... پار کرو... پا آ آ آ جا... کیمپا آ آ آ...''

''بٹ ناؤ آئی وانٹ ٹو ہیو کافی ان اوبرائے!'' خوبصورت کیل والی لڑکی ٹھنکی۔

''بٹ وی کیم ہیئر ٹو لسن ٹو بھیم سین جوشی۔''

''او، ڈونٹ بی سلی... ہی ول سنگ فار دَ ہول نائٹ... ہیو کافی ان اوبرائے دین وی کین کم بیک... ایون وی کین ہیو سلیپ اینڈ کم بیک...'' لمبی ٹانگوں والا چابیوں کا گچھا ہلاتا آگے بڑھا۔

بھیم سین جوشی کی دردناک آواز باہر تک آنے لگی تھی... خود سے التجا کی آواز، دکھوں اور کشٹوں سے بھری پرارتھنا... ارج سنو آ آ... موؤ وٗ... موؤ وٗ وٗ... کھچاک... کھچاک... کار کے دروازے ایک ساتھ بند ہوئے اور کررررکرر رکرر... بھرررربھرررر بھرر...

بارہ بج چکے تھے۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ سڑک کے کناروں پر دور دور تک موٹروں کی لائنیں تھیں۔ لوگ باہر نکلنے لگے تھے۔ زیادہ تر ادھیڑ عمر اور گمبھیر چہرے والے — اکتائے اور خود میں کھوئے ہوئے... موٹی عورتیں... کمر کا لٹکتا ہوا گوشت... جمائیاں آرہی ہیں۔ سالے، نیند آنے لگی... ٹکٹ برباد کردیا۔ ارے استاد تو دو بجے کے بعد موڈ میں آئیں گے۔ بس ٹکٹ لیا... منگوالیا ڈرائیور سے۔ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھے۔ پبلک ریلیشن... یہ ٹکٹ ہی نہیں ڈیزرو کرتے... پیسہ ویسٹ کردیا... استاد کو بھی ویسٹ کردیا... ایسی رڈی آڈینس! جو لوگ جارہے ہیں ان کی جگہ خالی... اس میں شالا ہم کو نہیں بیٹھادیتا۔ بولو، پیشا تو تم کو پورا مل گیا ہے۔ اب کیوں نہیں بیٹھائے گا؟

داس گپتا کو سردی لگنے لگی اور انھوں نے ایئر فورس کے پرانے اوور سائز کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے۔ عجب سنگھ کچھ سوکھی پتیاں اٹھا لایا۔ تسلے کی آگ دہک اٹھی... یہ سالا نکل رہا ہے 'آرٹ سینٹر' کا ڈائریکٹر۔ پینٹنگ بیچ بیچ کر کوٹھیاں کھڑی کرلیں۔ اب سینیٹری فٹنگ کا کاروبار ڈال رکھا ہے۔ یہی سالے آرٹ کلچر کرتے ہیں، کیونکہ ان کو پبلک ریلیشن کا کام سب سے اچھا آتا ہے۔ پارٹیاں دیتے ہیں۔ ایک ہاتھ سے لگاتے ہیں، دوسرے سے کماتے ہیں۔ اپنی وائف کے نام پر انٹیریئر ڈیکوریشن کا ٹھیکہ لیتا ہے۔ امِت سے کام کراتا ہے۔ اسے پکڑا دیتا ہے ہزار دو ہزار... لڑکی سپلائی کرنے سے ووٹ خریدنے تک کے دھندے جانتا ہے... دیکھو میوزک کانفرنس کی آرگنائزر کیسے اس کی کار کا دروازہ کھول رہی ہے... بروشر میں دیا ہوگا ایک ہزار کا اشتہار۔ جیسے سؤر گو پر چلتا ہے اور اسے کھا بھی جاتا ہے، وہی یہ آرٹ کلچر کے ساتھ کرتے ہیں۔ فیکٹری نہ ڈالی 'کلا کیندر' کھول لیا... امپورٹڈ کار کا دروازہ مہذب آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔ کسم گپتا... سالی نہ مس ہے نہ مسز ہے... داس گپتا سوچنے لگے۔ کیوں نہ اس سے بات کی جائے۔ وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس سے انگریزی ہی میں بات کی جائے۔

"کین یو پلیز..."

اس نے بات پوری نہیں سنی۔ مطلب سمجھ گئی۔ کندھے اچکائے۔

''نو، آئی ایم ساری۔۔۔ وی ہیو اسپینٹ تھرٹی تھاؤزنڈ ٹو ارینج دِس۔۔۔'' آگے بڑھتی چلی گئی۔

تھرٹی تھاؤزنڈ، ففٹی تھاؤزنڈ، ون لیک۔۔۔ فائدے، منافعے کے علاوہ یہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ وہ آکر اینٹ پر بیٹھ گئے۔

''وِلز۔''

''میٹھا پان۔''

''بے نمبر ڈال، بے۔۔۔''

''او، ہاؤ مین یو آر!'' عورت نما لڑکی کو کمسن لڑکا اپنا ہیمبر گر نہیں دے رہا تھا۔ عورت نما لڑکی نے اپنا ہاتھ پھر بڑھایا اور کمسن لڑکے نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔ ان کے ساتھ کی دوسری دو لڑکیاں ہنسے جارہی تھیں۔

''مین،'' لڑکی ادا سے بولی۔

مین؟ مین کا مطلب تو نیچ ہوتا ہے، لیکن یہ سالے ایسے بولتے ہیں جیسے سویٹ۔ اور سویٹ کا مطلب مین ہوگا۔

کمسن لڑکا اور عورت نما لڑکی ایک ہی ہیمبر گر کھانے لگے۔ ان کے ساتھ والی لڑکیاں ایسے ہنسنے لگیں جیسے وہ دونوں ان کے سامنے مباشرت کر رہے ہوں۔

''ڈِڈ یو اٹینڈ دیٹ چاؤلاز پارٹی؟''

''او نو، آئی وانٹڈ ٹو گو، بٹ۔۔۔''

''مہرا ز گوز نائس پارٹیز۔''

''ہائے بابی!''

''ہائے لٹی!''

''ہائے جان!''

''ہائے کٹی!''

''یہ مہراز گوز نائس پارٹیز۔۔۔ بکاز دے ہیو نائس لان۔۔۔ لاسٹ ٹائم دیئر پارٹی واز

ٹیریفک... دیئر واز ٹو مچ ٹو ایٹ اینڈ ڈرنک... وی کیم بیک ٹو تھرٹی ان دَ مورننگ... یونو وائے وی ہیڈ ٹو کم بیک سوسون؟ مائی مدر ان لا واز دیئر ان اور ہاؤس... ڈڈیو میٹ ہر؟ سو چارمنگ لیڈی ایٹ دی ایج آف سیونٹی تھری... سوائٹ ریکٹو، آئی کانٹ ٹیل یو...''

''ڈڈیو لائیک دَ پروگرام؟''

''او ہی از سو ہینڈسم۔''

''ڈڈیو نوٹس ڈرنگ ہی واز ویرنگ؟''

''او یس، یس... بیوٹی فل۔''

''مسٹ بی ویری ایکس پنسو۔''

''او شیور۔''

''مائی مدرز انکل گاٹ دَ سیم رِنگ۔''

''دیٹ از پلیٹنم۔''

''ہے ویٹر، ٹو کافی۔''

سنتے نہیں دیتے سالے۔ اب اندر سے تھوڑی بہت آواز آ رہی تھی۔ داس گپتا نے اینٹ کھسکا لی اور انگیٹھی کے پاس کھسک آئے۔

''ہی ہیز جسٹ کم بیک فرام یوروپ۔''

''ہی ہیز اے ہاؤس ان لنڈن۔''

''مسٹ بی ویری رِچ۔''

''نیچرلی ہی ٹیکس ٹین تھاؤزنڈ فار اَنائٹ۔''

''دین آئی ول کال ہم ٹو سنگ آن اور میرج۔'' کم عمر لڑکے نے عورت نما لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

سالے کے ہاتھ دیکھو! کلائیاں دیکھو! داس گپتا نے سوچا۔ اپنے بوتے پر سالا ایک پیسہ نہیں کما سکتا۔ باپ کی دولت کے بل بوتے پر استاد کو شادی میں گانے کو بلائے گا!

عجب سنگھ نے پھر انگیٹھی میں سوکھے پتے ڈال دیے۔ بیڑی پیتا ہوا ایک ڈرائیور آیا اور آگ

کے پاس بیٹھ گیا۔اس نے خاکی وردی پہن رکھی تھی۔

''سردی ہے جی، سردی۔''اس نے ہاتھ آگ پر پھیلا دیے۔کوئی کچھ نہیں بولا۔

''دیکھو جی کب تک چلتا ہے یہ چتیاپا۔ڈیڑھ سو کلومیٹر گاڑی چلاتے چلاتے ہوا پتلی ہوگئی۔ اب سالے کو مجرا سننے کی سوجھی ہے۔دو بجنے...''

''صبح چھ بجے تک چلے گا۔''

''تب تو پھنس گئے جی۔''

''پراجی، کوئی پاس تو نہیں ہے؟''عجب سنگھ نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''پاس؟اندر جانا ہے؟''

''ہاں جی، اپنے دادا کو جانا ہے،''عجب سنگھ نے داس گپتا کی طرف اشارہ کیا۔

''دیکھو جی، دیکھتے ہیں۔''

ڈرائیور اٹھا اور تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھا۔لمبا تڑنگا۔ہریانہ کا جاٹ۔گیٹ پر کھڑے سپاہیوں سے اس نے کچھ کہا اور سپاہی سواگت کرنے والے کو بلا لایا۔

ڈرائیور زور زور سے بول رہا تھا،''پولیس سے آیا ہوں جی۔ایس پی کرائم برانچ، نارتھ ڈسٹرکٹ کا ڈرائیور ہوں جی۔ڈی وائی ایس پی کرائم برانچ اور ڈی ڈی ایم پی ٹریفک کی فیملی نے پاس منگایا ہے جی،''وہ لاپروائی سے ایک سانس میں سب بول گیا۔

سوٹ دھاری سواگت کرنے والے نے سوٹ کی جیب سے پاس نکال کر ڈرائیور کی طرف بڑھا دیے۔وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آ گیا۔

''سردی ہے جی، سردی ہے۔''ہاتھ آگے بڑھایا۔''یہ لو جی پاس۔''

''یہ تو چار پاس ہیں۔''

''لے لو جی اب، نہیں تو کیا ان کا اچار ڈالنا ہے!''

داس گپتا نے ایک پاس لے لیا۔''ہم چار پاس کا کیا کرے گا؟''

ہریانہ کا جاٹ کافی اُوب چکا تھا، اس سوال پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس نے بچے ہوئے تین پاس تسلے میں جلتی آگ میں ڈال دیے۔ڈرائیور اور عجب سنگھ نے تسلے پر ٹھنڈے ہاتھ

پھیلا دیے۔ داس گپتا گیٹ کی طرف لپکے۔ اندر سے صاف آواز آرہی تھی... جا آ آ آ گو... استاد الاپ لے کر بھیرویں شروع کرنے والے ہیں... جا آ آ آ گو... مو... پیا آ آ آ آرے ے... دھا دھیں دھیں دھاں دھا تیں تیں تا... جا آ گو وَ مو وَ ھ... ن... پیا آ آ آ آرے ے ے ے...

❁❁

اصغر وجاہت

ہندی سے ترجمہ: رحمٰن مصور

اُن کا ڈر

گاڑی کی رفتار ساٹھ کے قریب تھی، سیدھے، بالکل سیدھے ہائی وے پر وہ پانی کی طرح بہی جارہی تھی۔ اس سے پہلے اس طرح اتنا لمبا سفر میں نے نہیں کیا تھا۔ ہاں، ان انٹرسٹیٹ ہائی ویز کے بارے میں سنا ضرور تھا۔

وہ چاروں ہندوستانی تھے یا، جیسا کہ وہ کہتے تھے، حیدرآبادی تھے۔ میری ان سے خاص جان پہچان نہیں، پھر بھی میں ان کے ساتھ ڈیٹرائٹ سے شکاگو جارہا تھا۔ ہوا یہ کہ علیگڑھ کے میرے دوست انجم نے مجھے فون کر کے بتایا کہ ان کے بھائی شکاگو آرہے ہیں اور میں چاہوں تو ان کے ساتھ آسکتا ہوں اور یہ کہ وہ مجھ سے پیسے نہیں لیں گے۔ انجم میرے ساتھ علیگڑھ میں تھے اور ہم دونوں نے ساتھ مل کر اردو کی خدمت کرنے کے کئی پلان بنائے تھے۔ ایک پلان کے تحت تو کئی سو روپے چندہ بھی جمع ہوگیا تھا جو خزانچی ہونے کی وجہ سے انجم کے پاس جمع تھا۔ پھر امتحان ختم ہوگئے۔ انجم حیدرآباد اور وہاں سے امریکہ آگئے۔ اردو بیچاری وہیں علیگڑھ میں رہ گئی۔

یہ لوگ، یعنی انجم کے بھائی مسرور صاحب اور ان کے دوست، مجھے دیکھنے میں کچھ عجیب لوگ لگے تھے۔ اسد صاحب نے کالی شیروانی اور علیگڑھ کٹ پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ان کی ڈاڑھی خاص علیگڑھ کے جماعت اسلامی والوں کی ڈاڑھی کی ٹکر کی تھی۔ یہ سب ہندوستان میں میں نے ہمیشہ دیکھا اور بھگتا تھا لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ کسی ایسے آدمی سے امریکہ میں بھی ملاقات ہوجائے گی۔ تیسرے

Scanned with CamScanner

صاحب ڈاکٹر طاہر تھے اور چوتھے، موٹے اور کچھ بیوقوف سے لگنے والے صاحب کا نام احمد تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ان میں سے تین لوگ، یعنی مسرور صاحب، اسد اور ڈاکٹر طاہر، کافی پڑھے لکھے ہیں۔ مسرور صاحب نے امریکہ ہی کی کسی یونیورسٹی سے کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کی تھی، ڈاکٹر طاہر بھی وین یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر تھے، اسد صاحب کے پاس انجینئرنگ کی کوئی بڑی ڈگری تھی۔ ہاں چوتھے صاحب کے بارے میں ٹھیک سے نہیں معلوم، لیکن یہ بھی بی اے پاس ضرور رہے ہوں گے۔ سفر شروع ہوا تو ڈاکٹر طاہر گاڑی چلا رہے تھے۔ ان کو شہر سے نکل کر آئی نائنٹی فور تلاش کرنے میں کچھ مشکل ہو رہی تھی۔ مسرور صاحب آگے کی سیٹ پر، مشیگن اسٹیٹ کا نقشہ کھولے، شہر سے آئی نائنٹی فور تک پہنچنے کا راستہ بتا رہے تھے۔ ڈاکٹر طاہر نے کسی غلط ایگزٹ پر گاڑی موڑ لی اور کچھ دور جانے کے بعد پتا چلا کہ ہم لوگ ایک دوسرے ہائی وے سے پھر واپس شہر جا رہے ہیں۔

''لیجیے، آ گئے نا غلط ہائی وے پر۔ اب دیکھیے کب ایگزٹ ملتا ہے،'' مسرور صاحب بولے۔

''سات آٹھ میل تو چلنا ہی پڑے گا۔ یہ کمبخت بڑی خرابی ہے ہائی ویز کی۔'' کچھ دیر کی بھاگ دوڑ کے بعد گاڑی آئی نائنٹی فور پر آ گئی، اب بس سیدھا راستہ تھا، ناک کی سیدھ میں۔

''ہاں، تو میٹنگ کیسی رہی احمد صاحب؟'' مسرور صاحب نے نقشہ بند کر دیا۔

''اور تو سب باتیں طے ہو گئیں، لیکن ٹورانٹو کی برانچ سے بات کرنے والی بات رہ گئی،'' احمد صاحب نے جواب دیا۔

''خیر، وہ تو ہو ہی جائے گی۔ اب ایگزیکٹو کی میٹنگ تو شکاگو ہی میں ہے نا، اس میں بات کر لیں گے۔ اور بھائی اس سے انکار کون کرے گا۔ اصولاً تو صحیح بات ہے نا!''

''ارے ڈاکٹر صاحب، یہ بات نہ کہیے۔ پچھلی بار یاد ہے نا، دلّی کے آخری مشاعرے والی بات پر لوگ اعتراض کر رہے تھے کہ یہ غیر اسلامی کام ہے،'' اسد صاحب بولے۔

میں اس بات پر چونک گیا۔ مجھے اتنا ہی معلوم تھا کہ یہ لوگ کسی میٹنگ میں شرکت کر کے واپس شکاگو جا رہے ہیں۔ اس میٹنگ سے اسلامی اور غیر اسلامی بات کا کیا تعلق؟ خیر، میں نے بولنا ٹھیک نہیں سمجھا۔

''لوگ اتنی آسانی سے اسلامی اور غیر اسلامی لفظوں کا استعمال کر دیتے ہیں جیسے وہی سب کچھ

Scanned with CamScanner

جانتے ہیں،'' ڈاکٹر طاہر بولے۔

'' آسمانی کتاب ہے صاحب۔ ہم ناچیز بندے اس کے بارے میں کیسے آخری بات کہہ سکتے ہیں؟'' احمد نے کہا۔

'' احمد صاحب، شکاگو میں پاکستانیوں نے قوالی کروائی تھی۔ پچیس ڈالر کا ٹکٹ تھا اور سب ٹکٹ بک گئے تھے۔ میرے خیال سے ہم فنڈ ریز کرنے کے لیے مشاعرہ کروا سکتے ہیں،'' مسرور صاحب نے کہا۔

'' مشاعرہ؟'' احمد چونکے۔'' پھر وہی سوال آجائے گا۔ اسلام میں تو مشاعرہ، نوٹنکی، ڈراما یعنی بھیس بدلنا ناجائز ہے۔''

'' یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ مشاعرے میں لوگ بھیس بدلتے ہیں؟'' ڈاکٹر طاہر کچھ ناراض سے ہوئے۔

'' صاحب، مشاعرہ کون سا اسلامی کام ہے؟'' احمد بولے۔

'' اس طرح دیکھیں تو اسلامی کام کوئی نہیں ہے۔ صرف گھر میں بیٹھے قرآن نماز پڑھتے رہو، یہی سب سے بڑا اسلام ہے۔ پھر ہم لوگ گھر سے ہزاروں میل دور یہاں کیوں نوکری کر رہے ہیں؟ احمد صاحب، اسلام دین کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ آپ احمد صاحب، اسلام کے 'بیسکس' کو ذرا دل لگا کر، تشریح سمیت پڑھ ڈالیے۔ لیکن مولانا آزاد کی تشریح نہ پڑھیے،'' ڈاکٹر طاہر بولے۔

احمد چپ ہو گئے۔ پھر باتیں قرآن کی تشریحات پر چل پڑیں۔ میں عجیب چکر میں پڑ گیا تھا۔ ان لوگوں کو اس ملک میں ایسے دیکھنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔

'' مجھے نہیں معلوم آپ کے کیا خیالات ہیں،'' اچانک مسرور صاحب نے مجھ سے کہا۔ میں پیچھے بیٹھا تھا۔ بات کرنے کے لیے انھیں اپنی گردن ذرا موڑنی پڑی۔

میں نے جلدی سے کہا،'' جی ہاں، جی، میں اسلام میں خاصی دلچسپی لیتا ہوں۔''

انھوں نے سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں اپنے جملے پر خود شرمندہ ہوا۔ اپنے آپ کو ایک موٹی سی گالی دی کہ سالے، تم کو بولنا بھی نہ آیا۔ کون سی ترکی بول رہے ہو جو الٹی سیدھی بات منہ سے

Scanned with CamScanner

نکل رہی ہے! اسلام میں دلچسپی لینے سے کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا اسلام بھی تمھارے لیے گھڑ دوڑ، تیرا کی یا یکے بازی ہے جس میں تم دلچسپی لیتے ہو؟ خیر، اب کیا ہو سکتا ہے۔

''ہم لوگوں نے صاحب، ایک آرگنائزیشن بنائی ہے جس کا نام ہے 'ایکشن کمیٹی فار دی انڈین مسلمز'۔ شارٹ فارم ہے اے ایس آئی ایم۔ ہندوستان میں جب کبھی فساد ہو جاتا ہے تو ہم لوگ پریشان حال مسلمانوں کے لیے چندہ بھیجتے ہیں۔ اے سی آئی ایم نے چار مسلمان لڑکوں کو ہندوستان سے بلا کر جرنلسٹ کا کورس بھی کروایا تھا۔ سوچا تھا، وہ واپس جا کر بڑے اخباروں میں نوکری کریں گے، مسلمانوں کے بارے میں لکھیں گے۔ لیکن ان میں سے تین نے یہاں کا امیگریشن ویزا لے لیا اور چوتھا وہاں بیکار ہے۔ کیا کریں صاحب، ہم نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی،'' اسد صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور ان کے لیے مجھ سے بات کرنا آسان تھا۔

''بس یہ سمجھیے کہ یہ آرگنائزیشن ہندوستانی مسلمانوں کی امریکہ میں نمائندگی کرتی ہے۔ اس کی برانچیں شکاگو، ڈیٹرائٹ، ٹورانٹو، سان فرانسسکو اور میامی میں ہیں۔ ہم لوگوں نے حال ہی میں شکاگو میں ایک مسجد بھی بنائی ہے۔ ہر اتوار کو گیٹ ٹوگیدر ہوتا ہے۔ ہم ہی لوگوں میں سے کوئی کسی مذہبی مسئلے پر تقریر کرتا ہے،'' مسرور صاحب نے بتایا۔

''آپ یہاں کب آئے؟'' اسد صاحب نے پوچھا۔

''میں، کوئی ایک مہینہ ہوا۔''

''کیا ارادہ ہے؟ کچھ رشتے دار وغیرہ ہیں؟''

جی نہیں، ایک دوست ہے، ان کی اسپانسر شپ ہے۔''

''ٹورسٹ ویزا دیا ہے نا؟''

''جی ہاں۔''

''خیر، وہ تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ آپ کے کوئی دو ہزار ڈالر خرچ ہو جائیں گے،'' انھوں نے سنجیدگی سے کہا۔

میں سمجھ نہیں پایا۔ میں نے کہا،'' جی؟''

''جی ہاں، امیگریشن ویزا کے لیے ٹرائی کریں گے نا؟''

''مگر میرا تو ایسا خیال نہیں ہے۔ میں تو جولائی میں لوٹ جاؤں گا۔''

''اچھا، لوٹ جائیں گے؟'' انھیں کافی حیرت ہوئی۔ ''ارے صاحب، آ گئے ہیں تو کیا حرج ہے، ٹرائی کر لیں۔ ویسے آج کل کافی سختی ہو گئی ہے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔''

''لیکن کیسے ہو گا جناب؟ میں نے تو سنا ہے کہ اب ناممکن ہے۔'' میں بھی اس معاملے میں صرف تفریح کے لیے دلچسپی لینے لگا۔

''وہ جو صاحب، اپنی طرف ہوتا ہے نا،'' انھوں نے ایک آنکھ دبائی۔ ان کے مولوی نما چہرے پر آنکھ مارنا عجیب لگا۔ یہ شاید نمبر دو والے کام کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ''وہ یہاں بھی چلتا ہے۔''

''کیا؟ ذرا اور بتائیے۔''

''صاحب، کچھ امریکن لڑکیاں ہیں جو ہزار ڈالر لے کر شادی کر لیتی ہیں۔ پھر امیگریشن آسانی سے مل جاتا ہے۔ پھر کچھ پیسہ لے کر طلاق دے دیتی ہیں۔ یہی سب سے آسان ترکیب ہے۔ خلیل اللہ صاحب کے بھانجے کا معاملہ اسی طرح بنا تھا۔ آج کل دو ہزار ڈالر پھٹکار رہے ہیں، یعنی سولہ ہزار روپے مہینہ۔ میں پچھلی بار حیدرآباد گیا تھا تو میں نے تو سب غیر شادی شدہ پڑھے لکھے مسلمان لڑکوں سے کہا کہ امریکہ آ جاؤ۔ خوب پیسہ پیدا کرو اور جب مرضی چاہے واپس چلے جاؤ۔''

''کیا آپ کی اے سی آئی ایم بھی اس کام میں کچھ مدد کرتی ہے؟''

''نہیں۔ ذاتی طور پر آپ کی مدد ہم لوگ کر سکتے ہیں۔ کچھ وکیل امیگریشن کا ٹھیکہ لیتے ہیں۔ کوئی دو تین ہزار لیتے ہیں اور کام کروا دیتے ہیں،'' مسرور صاحب بولے۔

''آ جائیے صاحب، یہاں پیسہ ہی پیسہ ہے۔ ہندوستان میں ہے کیا؟ فرقہ پرستی الگ ہے،'' احمد بولے۔

''تھوڑا سا رسک لینا پڑے گا۔ مجھے جب یہاں آنے کا موقع ملا تو حیدرآباد میں نوکری سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ میں نے دو گھنٹے کے اندر فیصلہ کیا۔ استعفیٰ ٹھونکا اور چلا آیا،'' مسرور صاحب نے بتایا۔

''تو مشاعرے کا کیا طے کیا احمد صاحب؟'' ڈاکٹر طاہر بولے۔

''بھائی، یہ معاملہ تو ایگزیکٹو ہی میں طے ہو گا،'' مسرور صاحب نے سانس کھینچی۔

Scanned with CamScanner

''ڈاکٹر صاحب، مشاعرے میں کسی ایسے شاعر کو بلایا جا سکتا ہے جس کا آئیڈیل اسلام ہو،'' اسد بولے۔

''ہاں، اگر ایسا شاعر مل جائے اور کچھ مقامی شاعر ہو جائیں تو کامیاب مشاعرہ ہو سکتا ہے۔ ٹکٹ پندرہ ڈالر سے کیا کم ہوگا،'' ڈاکٹر طاہر نے جواب دیا۔

''کیا آپ کسی ایسے شاعر کو جانتے ہیں جو اسلامی فلسفے اور اصولوں کو سامنے رکھ کر شاعری کرتا ہو؟'' مسرور صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

ذرا مشکل سوال تھا۔ میں نے کہا، ''جانتا تو نہیں، لیکن ایسا شاعر مل ضرور جائے گا۔''

نو بج رہے تھے۔ اب تک باہر کافی روشنی تھی۔ شہروں اور ہائی ویز کے ناموں کے بورڈوں کے نیچے سے گاڑی تیزی سے گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی سڑک کے کنارے پر روشنی سے چمکتے 'فوڈ' اور 'گیس' کے بورڈ دکھ جاتے تھے۔ دس بجے کے آس پاس ڈاکٹر طاہر نے کچھ کھانے کے لیے ایک ایگزٹ پر گاڑی موڑ لی۔

''یہاں پیسہ بہت ہے، لیکن روحانی سکون کہیں نہیں ہے،'' اسد صاحب نے مجھ سے کہا۔

میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ کیا ان کو یہاں آنے سے پہلے یہ نہیں معلوم ہوگا کہ روحانی سکون، اگر وہ کچھ ہوتا ہے تو، یہاں نہیں ملے گا۔ لیکن میں نے ہاں میں ہاں ملانے کے لیے کہا، ''ہاں صاحب، وہ اپنے انڈیا میں ہی ہے۔''

''لیکن کیا کریں، ہم تو اب انڈیا جا نہیں سکتے،'' انھوں نے اس طرح کہا جیسے واقعی انڈیا جانا چاہتے ہوں۔

وہ ہنسنے لگے۔ ''دس سال یہاں رہنے کے بعد وہاں عجیب لگتا ہے۔ ابھی پچھلے سال گیا تھا۔ گاؤں کی وہی حالت ہے، لوگ ویسے ہی ہیں۔ وہی دھچ دھچ کر کے چلنے والے اِکّے گاؤں جاتے ہیں۔ دو چار دن تو اچھا لگتا ہے، پھر مزہ نہیں آتا۔''

''آج کل مہنگائی بھی بہت ہے،'' میں نے بتایا۔

''مہنگائی تو یہاں بھی بہت ہے،'' انھوں نے کہا۔

''لیکن میرے خیال سے زندگی یہاں پھر بھی بہت آسان ہے۔''

Scanned with CamScanner

''زندگی بہت آسان تو ہے جناب، لیکن یہاں بھی پرابلمز کم نہیں ہیں، خاص طور پر ہم لوگوں کے لیے،'' مسرور صاحب بولے۔

''اور خاص طور پر ان کے لیے جو فیملی والے ہیں،'' ڈاکٹر طاہر بولے۔

''اچھا کیا میں نے جو فیملی کو نہیں بلایا،'' احمد بولے۔

''ہاں، کیا حال ہے احمد صاحب ان لوگوں کا؟ پچھلی بار آپ نے بتایا تھا کہ بلانے والے ہیں۔ کب تک کچی پکی کھاتے رہیں گے؟ بلا ہی لیجیے بھابھی کو، اب تو آپ کو چھ سال ہو گئے ہیں،'' ڈاکٹر طاہر بولے۔

''ہاں، اسلامی نظریے سے بھی ٹھیک نہیں ہے۔ آپ یہاں اور آپ کی بیوی ہندوستان میں۔ اسلام کہتا ہے کہ مرد اپنی عورت سے دور صرف چھ مہینے تک رہ سکتا ہے،'' مسرور صاحب نے کہا۔

''اور آپ کو تو چھ سال ہو گئے،'' اسد صاحب نے وہ بات پتا نہیں کیوں دہرائی جو کہی جا چکی تھی۔

''آپ اپنے ساتھ ہی نہیں، ان کے ساتھ بھی زیادتی کر رہے ہیں،'' مسرور صاحب نے پھر کہا۔

احمد صاحب نے کہا، ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔ ان گرمیوں میں سوچتا ہوں چلا جاؤں۔ حیدر آباد میں کمپنی والوں کے پاس میرا بانڈ بھی پڑا ہے، اس کا پتا نہیں کیا ہوا۔''

''کیوں؟ کیا چھٹی دینے سے پہلے بانڈ بھروایا تھا؟''

''ہاں، یہی کہ کمپنی میں کم سے کم دس سال اور کام کرنا پڑے گا یا دس ہزار دینا پڑے گا۔''

''تو کیا آپ یہاں کی نوکری چھوڑ دیں گے؟''

''وہاں آپ کو زیادہ سے زیادہ پانچ سو ملے گا۔ یہاں کیا ملتا ہے؟'' اسد نے پوچھا۔

''یہاں تو اب ڈیڑھ ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ کا موٹا موٹا حساب دس ہزار روپے مہینے سے زیادہ ہے،'' انھوں نے بتایا۔ ''گھر پانچ سو ڈالر مہینہ بھیج دیتا ہوں۔ خط آتا ہے کہ سب خرچ ہو جاتا ہے۔ یعنی ساڑھے تین ہزار خرچ ہو جاتا ہے۔ اب میں وہاں پانچ سو روپے کما کے کیا ان لوگوں کا پیٹ بھروں گا اور کیا اپنا۔''

Scanned with CamScanner

''تو آپ بلا ہی لیجیے بیوی کو،'' مسرور صاحب بولے۔

''ارے صاحب، بلا لیں تو بچوں کو بھی بلائیں۔ تین لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں خدا کے فضل سے۔ ان سب کا گزر میرے ایک کمرے والے فلیٹ میں تو ہو نہیں سکتا۔ تین سو ڈالر مہینے کا فلیٹ لینا پڑے گا، باقی بچوں کی تعلیم اور اِدھر اُدھر میں خرچ ہو جائے گا۔ ایک ڈالر نہیں بچے گا۔ پھر پردیس میں پڑے رہنے کا فائدہ؟''

''ارے تو فلیٹ خرید لیجیے نا۔ ابھی اچھن کے برابر والا بکا نہیں ہے۔ تیس ہزار میں سودا ہو جائے گا۔ بولیے؟'' مسرور صاحب نے کہا۔

''نہیں صاحب، کیش تو اس لیے خون پسینہ کر کے جوڑا ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد ہندوستان میں کام آئے گا۔''

''تب تو آپ کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے،'' مسرور صاحب نے سگریٹ سلگالی۔

''بڑی لڑکی ماشاء اللہ سے بیس کی ہو گئی۔ اس کی شادی کا مسئلہ ہے۔ میں یہاں ہوں۔ اچھے لڑکوں کی تلاش اب کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے،'' انھوں نے کہا۔

''تو آپ جناب، یہاں سے تین مہینے کی چھٹی لیجیے۔ ایئر فرانس سے واپسی والا ٹکٹ لے کر حیدرآباد جائیے۔ لڑکی کی شادی کیجیے اور باقی بچوں اور بیوی کو لے کر آجائیے۔ کمپنی والوں کے منھ پر ڈیڑھ ہزار ڈالر مار کر اپنا بانڈ واپس لیجیے،'' ڈاکٹر طاہر احمد صاحب کی پوری زندگی کا پروگرام طے کرنے لگے۔

''بیوی پردہ کرتی ہے ڈاکٹر صاحب۔ دوسری لڑکی بھی ماشاء اللہ سترہ سال کی ہے۔ ایک دو سال بعد اس کی بھی شادی کا مسئلہ سامنے ہوگا۔ ایک لڑکا وہاں انٹر میں پڑھتا ہے، دوسرا ہائی اسکول میں۔ دونوں یہاں آکر کہاں پڑھیں گے؟ اور کیسے؟ یہ سب آسان نہیں ڈاکٹر صاحب،'' احمد صاحب کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔

سامنے سے آنے والی موٹروں کی ہیڈ لائٹ میں سب کے چہرے کچھ لمحوں کے لیے چمک جاتے اور پھر اندھیرے میں ڈوب جاتے۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور شاید اس لیے گاڑی کی رفتار بڑھ گئی۔ سب جلدی سے جلدی گھر پہنچنا چاہتے تھے، اور احمد صاحب بھی۔ گھر، جہاں بیوی

نہیں ہے، بچے نہیں ہیں، صرف ایک کمرے کا فلیٹ ہے۔

''سوچتا ہوں، واپس ہی چلا جاؤں،'' وہ مری ہوئی آواز میں بولے۔

ڈاکٹر طاہر کو پتا نہیں اس بات پر کیوں غصہ آگیا۔''میں تو جناب، ٹیکسی چلالوں گا، جھاڑو دے لوں گا، لیکن رہوں گا امریکہ میں۔ ہندوستان بھی سالا کوئی ملک ہے، جہاں سائنٹسٹ خودکشی کر لیتے ہیں، انجینئر بیکار گھومتے ہیں۔ دیٹ از دَ کنٹری آف ڈپریشن۔ یہاں کم سے کم یہ ڈر تو نہیں کہ ہندو مسلم فساد ہوگا اور مار دیے جائیں گے۔'' ان کی بات کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔

''ہمیں تو صاحب، یہیں رہ کر حالات کو سازگار بنانا ہے۔ اب اے سی آئی ایم کی شروعات ہو چکی ہے۔ اسی کے ذریعے کچھ نہ کچھ کرنا ہے،'' مسرور صاحب بولے۔

''یہ جو ہر سنڈے کو مسجد میں گیٹ ٹو گیدر ہوتا ہے، اس کو ذرا اور بڑے پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم لوگ 'انڈین مسلم' نام کا ایک اخبار تو نکال سکتے ہیں۔ اور اپنے بچوں کے لیے ایک ایسا اسکول اور ہاسٹل کھول سکتے ہیں جہاں ماڈرن تعلیم مسلم ماحول میں دی جایا کرے۔ یہ بہت ضروری ہے احمد صاحب۔ ہمارے بچے ابھی اسکولوں میں جاتے ہیں جہاں امریکن لڑکے لڑکیاں جاتے ہیں۔ دن بھر وہیں رہتے ہیں۔ بچوں کے دماغ پر اسی ماحول کا اثر پڑے گا۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی جوان لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ گھر چلی آئے اور آپ سے کہے کہ یہ میرا 'بوائے فرینڈ' ہے، جیسا کہ امریکی گھرانوں میں ہوتا ہے؟ اور جناب، ایسا ہوگا اور ضرور ہوگا۔ کیا گارنٹی ہے کہ آپ کی لڑکی آپ کے کہنے سے شادی کرے گی؟ اگر وہ اسی ماحول میں پلی بڑھی تو اسی رنگ میں رنگ جائے گی،'' وہ جوش میں بولتے گئے۔''اس لیے ایک ایسا ماحول بنانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے بچے انھی مذہبی قدروں کو اپنا سکیں جن میں ہم پلے بڑھے ہیں۔''

''جی ہاں، اسکول والا آئیڈیا بڑا اچھا ہے۔ کم سے کم بچے اگر پندرہ سولہ برس کی عمر تک ایسے ماحول میں رہیں تو پھر امریکی ماحول کا اثر ان پر نہیں پڑے گا،'' اسد صاحب بولے۔

''طاہر صاحب، میں اپنی بڑی بیٹی کو خود قرآن شریف پڑھاتا ہوں۔ میں خود...''

مسرور صاحب کی بات پر ڈاکٹر طاہر بولے،''مگر مسرور صاحب، کالج میں تو وہ سیکس ایجوکیشن پڑھتی ہی ہوگی۔ اس ملک میں لڑکیاں چودہ سال کی عمر میں ڈیٹنگ کرنے لگتی ہیں۔ پارکوں اور سڑکوں

Scanned with CamScanner

پر جو کچھ ہوتا ہے، اخباروں اور ٹیلی وژن پر جو کچھ آتا ہے، اسے دیکھ کر ہمارے بچے کیا سیکھیں گے؟''

مسرور صاحب کچھ ڈری ہوئی آواز میں بولے، ''نہیں نہیں، میں اسکول اور اسلامی ہاسٹل والے آئیڈیا سے بالکل ایگری کرتا ہوں۔ میں تو آپ کو صرف اپنی بات بتا رہا تھا۔''

''ابھی ہمارے بچے چھوٹے ہیں مسرور صاحب۔ ہم ان کو جیسا بنانا چاہیں گے ویسا وہ بنیں گے۔ لیکن میں کسی بھی صورت میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میری بیٹی بغیر شادی کیے کسی کے ساتھ رہنے لگے، جیسا کہ عام طور پر امریکہ میں ہوتا ہے،'' ڈاکٹر طاہر بولے۔

اسد صاحب بولے، ''ڈاکٹر صاحب، میں سوچتا ہوں کہ شہناز گیارہ بارہ برس کی ہو جائے تو میں اسے ہندوستان نانا نانی کے پاس بھیج دوں۔''

''آئیڈیا برا نہیں ہے،'' ڈاکٹر طاہر بولے، ''لیکن کیا آپ کے ساس سسر اس کی تعلیم وغیرہ کا اسی طرح خیال کریں گے جیسا آپ کرتے ہیں؟ یا کیا لڑکی گیارہ سال تک یہاں رہنے کے بعد ہندوستان کے کسی چھوٹے سے قصبے کے اسکول میں پڑھنا منظور کرے گی؟ میرے خیال سے شاید یہ لڑکی کی سائیکولوجی کے لیے برا ہوگا۔ لیکن ٹھیک ہے صاحب، کرنا ہی پڑے گا۔''

کچھ دیر تک گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ لوگ تصور میں اپنی اپنی لڑکیوں کو امریکی لڑکوں کے ساتھ مباشرت کرتے دیکھ کر کافی ڈر گئے تھے۔ احمد صاحب گنگنا رہے تھے۔ ان کی لڑکی ہندوستان میں ہے۔ کسی امریکی کے ساتھ مباشرت نہیں کر سکتی۔ کیا گارنٹی ہے کہ کسی اور کے ساتھ، یعنی کسی ہندوستانی کے ساتھ، مباشرت نہیں کر رہی ہوگی؟ لیکن شاید احمد صاحب اتنی دور کی کوڑی لانے میں یقین نہیں رکھتے۔

❀❀

Scanned with CamScanner

پنکج سُبیر

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

ایسٹ انڈیا کمپنی

وہ کل جمع نو تھے، اس میں اگر دو بچوں کو بھی جوڑ دیا جائے تو کل تعداد گیارہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یوں تو دوسرے درجے کا یہ ریل کا ڈبہ مسافروں سے ٹھساٹھس بھرا تھا، لیکن اس کے حصے میں وہ کل گیارہ تھے — ایک طرف بیٹھے ہوئے پانچ اور دوسری طرف چار، اور ساتھ میں دو بچے۔ ان گیارہ میں اسے اپنی من پسند کھڑکی کے پاس کی جگہ مل گئی تھی۔ ایک بار اسے ریل میں کھڑکی کے پاس جگہ مل جائے تو پھر اسے ڈبے کے اندر کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ اس کا من باہر تیزی سے دوڑ رہے کھیتوں کھلیانوں، ندی تالابوں، بجلی ٹیلیفون کے کھمبوں اور پہاڑی سلسلوں کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے، اور ساتھ میں تال ملانے لگتی ہے ریل پٹریوں پر تھاپ دے رہی پہیوں کی آواز — "سٹک سٹک... پٹک پٹک... پٹک پٹک... سٹک سٹک..."

آج اسے پہلے پہل تو کھڑکی کے پاس جگہ نہیں ملی تھی، لیکن اچانک ہی کھڑکی کے پاس بیٹھے شریف آدمی کے ٹی سی کے ساتھ کچھ مکالمے ہوئے اور وہ اپنا سامان اٹھا کر ٹی سی کے ساتھ چلے گئے۔ ویسے بھی وہ اور ان کا بے تحاشا سامان دونوں ہی اس سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں کچھ نامانوس سے لگ رہے تھے۔ شاید اپر کلاس میں ریزرویشن نہ ملنے کی وجہ سے وہ یہاں بیٹھ گئے تھے۔ غریب لوگوں کے بھارت میں۔ موقع ملتے ہی وہ اپنے جیسے امیر لوگوں کے بھارت میں چلے گئے، اپنے حصے

Scanned with CamScanner

کی کھڑکی ایک غریب کو دے کر۔ ان کے وہاں سے ہٹتے ہی اس نے بجلی کی پھرتی سے کھڑکی کے پاس قبضہ کرلیا۔ کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہی اسے لگا کہ اب سفر کتنا ہی لمبا ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ کھڑکی کے اس پار والے ایک پورے سنسار کے ساتھ اب وہ جڑ گیا ہے؛ سفر کی رفتار اب فطرت سے جڑ کر اور تیز ہوگئی ہے۔

تو وہ کل جمع گیارہ تھے۔ کچھ گھنٹوں کے لیے مجبوری میں بنا ایک دوسرے سے بالکل اجنبی لوگوں کا سماج۔ اس سماج میں نہ کوئی کسی کے ماضی کے بارے میں جانتا ہے نہ مستقبل کے، صرف حال کے کچھ گھنٹوں کو کاٹنے کے لیے یہ سماج بنا ہے۔ کھڑکی کے پاس آسن جمانے کے کافی دیر بعد وہ ڈبے کے اندر آیا — یہاں آنے سے مطلب ذہنی طور پر اندر آنا ہے — باہر کے قدرتی مناظر کو چھوڑ کے وہ اندر آیا، تب اسے دس لوگ دکھائی دیے جو اس کے سمیت کل گیارہ تھے اور اوپر بیان کیے گئے سماج کی تخلیق کر رہے تھے۔

سامنے کی سیٹ پر کونے میں ایک 'چھوٹا پریوار سکھی پریوار' براجمان تھا۔ ٹھیٹھ دیہاتی میاں بیوی اور ان کی دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں۔ یہ بیٹیاں اس بات کا اشارہ تھیں کہ یہ خاندان بہت دنوں تک چھوٹا اور سکھی خاندان نہیں رہے گا۔ اگر دو بیٹے ہوتے تب شاید یہ رہ جاتا، لیکن میاں بیوی کی کم عمر اور دو بیٹیاں چھوٹا خاندان سکھی خاندان پر سوالیہ نشان لگا رہی تھیں۔ ان چار کے بعد سیٹ پر ایک خاتون اپنی جوان لڑکی کو لے کر بیٹھی تھیں۔ لڑکی چونکہ جوان تھی اس لیے ظاہر ہے کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی، اس کے ٹھیک سامنے۔ ماں بیٹی دونوں ہی کھاتے پیتے گھر کی ہونے کی بات کو اپنی چربی سے ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔ یہ تھا اس کی مخالف بنچ کا، یعنی اس کے ٹھیک سامنے کی سیٹ پر براجمان اس کے حصے کا آدھا سماج۔

اب اس نے اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں پر نظر ڈالی۔ اس دیکھنے کے دوران اسے لگا کہ اپنی مخالف سمت پر نظر ڈالنا بہت آسان ہے، آنکھیں اٹھاؤ اور دیکھ لو، لیکن اپنے برابر بیٹھنے والوں کے لیے باقاعدہ کوشش کرنی پڑتی ہے۔ بات وہی کوشش کرنے اور کوشش نہ کرنے کی ہے۔ اپنے لوگوں میں خود کو چھوڑ کر باقی لوگوں کو دیکھا۔ سامنے کی بنچ کو جب اس نے دیکھا تھا تو کہیں سے کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا۔ مگر جب گردن گھما کر، کچھ جھک کر، اس نے اپنے برابر بیٹھے لوگوں کو دیکھا تو ان لوگوں میں، خاص طور سے

Scanned with CamScanner

عورتوں میں، ردعمل ان کی آنکھوں میں صاف دکھائی دیا، کچھ اس طرح کہ دیکھو، کیسے گھور رہا ہے۔

خیر، اس دیکھنے دکھانے کے عمل میں جو کچھ نظر آیا وہ اس طرح تھا: اس کے ٹھیک پاس دو عورتیں بیٹھی تھیں اور ان کے پاس پھر ایک عورت تھی اور پھر ایک مرد بیٹھا تھا۔ اب اسے اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ تین عورتیں اور ایک مرد بیٹھا تھا، لیکن ایسا اس لیے نہیں کہا جا رہا کیونکہ دو عورتیں ایک ساتھ تھیں اور تیسری عورت اور چوتھا مرد ایک ساتھ، جیسا کہ ان کی بات چیت سے پتا چل رہا تھا۔ اس کے ٹھیک پاس کی دو عورتیں روایتی ہندوستانی عورتیں تھیں جن کا تعلق ممکن ہے کہ متوسط طبقے سے ہو۔ روایتی اس لیے کہ ان کی گفتگو میں کردار بھلے ہی رہ رہ کر بدل رہے ہوں لیکن موضوع وہی ایک تھا، یعنی غیبت، اور یہ غیبت پوری شدت اور پوری ایمانداری کے ساتھ کی جارہی تھی۔ حالانکہ کبھی کبھی یہ کانا پھوسی والی سطح پر پہنچ جاتی تھی — شاید ان عورتوں کا یہ ماننا تھا کہ بھلے ریل کے ڈبے کی دیواریں ہوں یا گھر کی، دیواریں تو دیواریں ہیں اور ان کے کان ہوتے ہی ہیں۔

ان دو عورتوں کے اس طرف جو عورت اور مرد تھے وہ بہت بوڑھے تھے، ایک سردار جی اور ان کی بیوی۔ سردار جی پوری طرح اپنے روایتی حلیے میں تھے اور اوپر ایک کرپان بھی لٹکائے ہوئے تھے۔ بیوی ان سے کچھ زیادہ بوڑھی تھیں، یا پھر بیمار تھیں، ایسا اس لیے کیونکہ سردار جی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر نیچے فرش پر بیٹھ جاتے تھے اور ان دو لوگوں والی جگہ پر ان کی بیوی اُدھ لیٹی ہو جاتی تھیں۔ ایسا رہ رہ کر ہو رہا تھا۔

پوری طرح نظر دوڑانے کے بعد اس نے دوبارہ سامنے نظر ڈالی تو اس کے ٹھیک سامنے بیٹھی لڑکی اس سے نظر ملتے ہی بلا وجہ شرما گئی۔ کچھ لڑکیوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے، ایک ٹھیک ٹھاک سا آدمی جسے تھوڑی دور سے دیکھنے پر جوان ہونے کا دھوکا سا ہوتا ہو، اس کی موجودگی سے ہی انھیں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ صورت حال یہ ہوگئی کہ کچھ ہی دیر میں اسے کنکھیوں سے دیکھنا، دوپٹہ منھ میں دبانا، پیر کے انگوٹھے سے زمین کرید کر لجانا، جیسی نایاب حرکات کا مشاہدہ کرنے کا قیمتی موقع مل گیا۔ اگرچہ ٹرین کے اس ٹھوس ہموار فرش پر کریدنے جیسا کچھ نہیں تھا، پھر بھی عورتیں اپنے روایتی انداز کو نبھانے میں پکا یقین رکھتی ہیں — اب روایت پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدنے کی ہے تو کریدنا ہے۔ اُدھر کونے کا چھوٹا خاندان سکھی خاندان جس طرح سے بیوہار کر رہا تھا اس سے صاف لگ رہا تھا

Scanned with CamScanner

کہ اب یہ چھوٹا خاندان سفر ختم ہونے کے کچھ دن بعد ہی چھوٹے خاندان کا دائرہ توڑ دے گا، اگر چہ دو بچیوں کی وجہ سے دونوں میاں بیوی خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔

تو اس طرح دو دو کے چار گروپوں میں گیارہ افراد بات چیت میں مشغول۔ اور ان سب کے بیچ ایک بلا وجہ کا مکالمہ اس کے اور سامنے والی لڑکی کے درمیان بھی ہو رہا تھا۔ حالانکہ یہ نگاہوں سے ہونے والا مکالمہ تھا اور قطعی یکطرفہ تھا۔ اور اسی یکطرفہ مکالمے کے باعث وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر نکل گیا اور ایک بار پھر ندی، تالاب، پیڑ، پہاڑوں کے ساتھ دوڑنے لگا۔ اچھا ہوتا ہے کھڑکی کے پاس بیٹھنا کیونکہ کھڑکی کے پاس بیٹھنے والے کو یہی ایک بڑی سہولت ہوتی ہے: اگر ڈبے یا بس کے اندر کا ماحول کسی خاص شخص یا کسی خاص واقعے کی وجہ سے دلچسپ نہ رہے تو جسمانی طور پر اندر موجود رہ کر ذہنی طور پر باہر نکلا جا سکتا ہے، جو وہ ابھی کر رہا ہے۔

کافی دیر تک وہ کھڑکی کے باہر دوڑتا رہا، تب تک جب تک باہر اندھیرے نے ندیوں، پہاڑوں، تالابوں کو اپنی آغوش میں نہیں لے لیا اور باہر دوڑنا اس کے لیے قطعی ناممکن نہیں ہو گیا۔ گھور اندھیرا باہر پھیلا اور وہ اندر آ گیا۔ اندر آ کر اسے پہلی تسلی یہ ملی کہ اس کے سامنے والی لڑکی اپنی ماں کے کندھے پر سر ٹکائے سونے یا شاید اونگھنے کی حالت میں آ چکی تھی۔ باقی سب کچھ بدستور تھا۔ ہاں، لگ بھگ ادھیڑ عمر کے ایک عورت مرد جو صرف اس لیے میاں بیوی کہے جا سکتے تھے کیونکہ ٹرین بھارت میں تھی، وہ دونوں جہاں دونوں سیٹیں ختم ہوتی ہیں ٹھیک اسی جگہ پر آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ مرد پورے طور پر روایتی ہندوستانی ادھیڑ تھا جس کے سر کے بال غائب تھے اور پیٹ توند نام کی بے جان مخلوق میں تبدیل ہو چکا تھا۔ عورت اس سے بھی زیادہ ہندوستانی نظر آ رہی تھی۔

شوہر کی آنکھوں میں کچھ پا لینے کے لیے بے چینی نظر آ رہی تھی۔ اس نے دیکھا، کونے والے سردار جی کی بیوی فی الحال لیٹی ہوئی ہیں اور سردار جی سیٹ سے نیچے بیٹھے اونگھنے والی مدرا میں نظر آ رہے ہیں۔ نو وارد کھڑے جوڑے کی نگاہیں ادھ لیٹی سردارنی کی گھیری ہوئی جگہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اگر سردار جی پاس نہ بیٹھے ہوتے تو یقیناً وہ دونوں ابھی تک سردارنی کو اٹھا چکے ہوتے۔ رات کافی ہو چکی تھی لیکن پبلک ڈبے میں کیا رات کیا دن، کیونکہ بیٹھے بیٹھے اونگھنا ہی تھا اور وہ بھی لوہے کی سخت سیٹوں پر۔ اسے صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ اس کے ٹھیک سامنے والی کی اونگھ کہیں ٹوٹ نہ جائے، نہیں تو پھر

Scanned with CamScanner

اسے کریدنا، لجانا، یہ سب جھیلنا پڑے گا، کیونکہ اندھیرے میں کھڑکی سے باہر بھی تو نہیں جایا جا سکتا۔

سردارنی اچانک کچھ کراہیں اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سردار جی کو اس بات کا پتا ہی نہیں چل پایا کہ سردارنی اٹھ کر بیٹھ گئی ہیں، اور وہ پہلے کی طرح اونگھتے رہے۔ سردارنی کو شاید کم دکھائی دیتا تھا، وہ اٹھ کر چپ چاپ بیٹھ گئیں، بس ایک بار دوپٹے کو سنبھال کر سر ڈھک لیا۔ سردارنی کے اٹھتے ہی کھڑے میاں بیوی کے بیچ کچھ ایسا ہوا کہ جسے فلمی زبان میں 'آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہو گیا' کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کو صرف اسی نے دیکھا کہ کھڑے شوہر نے بھنوؤں کو اوپر اچکا کر، گردن کو سامنے کھینچ کر سردارنی کے بیٹھ جانے سے خالی جگہ کی طرف اشارہ کیا، اور جواب میں کھڑی بیوی نے گرگٹ کی طرح تین بار ہاں میں سر ہلا کر شوہر کے ہاتھوں سے بیگ لے لیا۔ یہ پورا سلسلہ اس کے لیے دلچسپ ہو گیا تھا— اسے اب ڈبے کے اندر بھی مزہ آ رہا تھا۔

ہاتھوں میں بیگ لے کر کھڑی بیوی کچھ دیر تک کھڑی رہی، پھر بلی کی طرح دبے پاؤں اس خالی جگہ کی طرف بڑھی۔ دبے پاؤں بڑھنے کی وجہ شاید یہی تھی کہ سردار جی کی نیند نہ ٹوٹ جائے کیونکہ اس صورت میں سردار جی اس خالی جگہ کے پہلے حقدار ہونے کی بنیاد پر وہاں بیٹھ جاتے۔ لیکن کھڑی بیوی کا آج قسمت ساتھ دے رہی تھی، وہ اپنا بیگ اور لگ بھگ بیگ سا ہی ٹھسا ٹھسایا جسم لے کر اس خالی جگہ پر بیٹھ گئی، یعنی اب اسے بیٹھی بیوی کہا جا سکتا تھا۔ کھڑی بیوی کے بیٹھتے ہی اس کی سیٹ پر ہلکی سی ہلچل سی ہوئی۔ یہ ہلچل سردارنی کی طرف سے نہیں ہوئی تھی کیونکہ انھیں تو کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا— یہ ہلچل اس کے ٹھیک پاس بیٹھی دونوں روایتی عورتوں کی طرف سے ہوئی۔

یہ دونوں عورتیں ابھی بھی اونگھ اونگھ کر غیبت میں لگی ہوئی تھیں۔ رات ہو جانے کی وجہ سے غیبت کے موضوع بھی رات یا نیند سے متعلق ہو گئے تھے، مثلاً فلانی کو نو بجے سے ہی نیند آنے لگتی ہے، یا فلانی صبح کے آٹھ بجے تک سوتی رہتی ہے۔ ان دونوں عورتوں کا یہ غیبت کا روایتی پروگرام تیسری عورت یعنی کھڑی بیوی کے ٹھیک پاس آ کر بیٹھتے ہی کچھ دیر کے لیے ملتوی ہو گیا۔ غیبت کی ایک اہم خصوصیت یہی ہے کہ پریم گلی اتی سانکری، جا مے تین مہیلا نہ سمائیں۔ جو کانا پھوسی دو عورتوں کے بیچ مزہ دیتی ہے، وہ مزہ تین میں کہاں؟ یہی وجہ تھی شاید کہ دونوں عورتوں کے بیچ کی گفتگو کھڑی بیوی کے بیٹھی بیوی میں بدلتے ہی تھم گئی، اور دونوں کنکھیوں سے بیٹھی بیوی کی طرف دیکھنے لگیں۔

اسی بیچ سردار جی کی اونگھ والی کیفیت ختم ہو گئی۔ انھوں نے اٹھ کر جیسے ہی اپنی جگہ پر اس عورت کو بیٹھے دیکھا تو فوراً بولے، ''او بھین جی، ایتھے تو میں بیٹھا تھا۔'' عورت نے فوراً اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ادھیڑ شوہر نے فوراً سردار جی کو جواب دیا، ''او سردار جی، مہیلا ہیں، کب تک کھڑی رہتیں۔ آپ تو اچھے بیٹھے ہی ہو نیچے۔'' سردار جی بوڑھے ہونے کے ساتھ شائستہ بھی تھے، اور پھر عورت کے بیٹھنے کی مخالفت بھی کیسے درج کراتے؛ کچھ نہیں بولے، مڑ کر سردارنی سے کچھ پوچھنے لگے۔ کھڑا شوہر اور بیٹھی بیوی دونوں مسکرا رہے تھے۔ وہ اس واقعے کے خلاف آواز اٹھانے کو ہوا، پھر سوچا، جانے دو۔ اپنا کیا گیا؟ جگہ تو سردار جی کی گئی۔

کچھ دیر تک اس نے کھڑکی کے باہر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن باہر کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ دوبارہ اندر آ گیا۔ اس کے ٹھیک سامنے ابھی بھی اونگھ کا ماحول تھا۔ وہ بھی اونگھنے لگا۔ کافی دیر تک وہ اونگھتا رہا۔ اس کی اس بے اختیار اونگھ کے کئی اسباب تھے، جیسے کہ اس کے ٹھیک سامنے کی نگاہوں کے مکالمے کا اونگھ جانا، چھوٹے اور سکھی خاندان کی بات چیت کا تھم جانا، اور ٹھیک پاس کی غیبت کا بھی اونگھ جانا۔ کافی دیر بعد جب اس کی آنکھیں تھوڑی کھلیں تو اس نے دیکھا کہ سارے ہم سفر اونگھ والی کیفیت سے گہری نیند کی آغوش میں جا چکے ہیں۔ اس کو ملا کر صرف پانچ لوگ ہی جاگ رہے ہیں، سردار جی، سردارنی، بیٹھی بیوی اور کھڑا شوہر۔ بیٹھی بیوی اپنے کھڑے شوہر کی فکر میں جاگ رہی تھی، اور سردار جی سردارنی کی وجہ سے جاگ رہے تھے — یعنی دونوں جوڑے بھارتی گھریلو زندگی کی بہترین مثال بنے ہوئے تھے۔

سردارنی کو بیٹھے رہنے میں پریشانی ہو رہی تھی، شاید اس لیے وہ بار بار پہلو بدل رہی تھیں۔ پہلے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ادھ لیٹی ہو جاتی تھیں لیکن کھڑی ہوئی عورت کے بیٹھی ہونے کے بعد ادھ لیٹے ہونے کی جگہ ختم ہو گئی تھی۔ بیوی کو پریشان دیکھ، سردار جی میں نے دھیرے سے پوچھا، ''کی ہویا ویراں والیے، لیٹنا ہے؟'' سردارنی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ سردار جی سردارنی کا درد سمجھ کر بھی چپ رہے۔ اسی بیچ اس نے دیکھا کہ بیٹھی بیوی اور کھڑے شوہر کے بیچ دوبارہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ٹائپ کی کوئی چیز ہوئی، جس کے ہونے کے بعد بیٹھی بیوی کے چہرے پر کچھ انچ لمبی مسکراہٹ پھیل گئی۔

Scanned with CamScanner

بیٹھی ہوئی بیوی نے آواز میں مٹھاس گھولتے ہوئے سردار جی سے پوچھا، ''کیا بات ہے بھائی صاحب، بھابھی جی سے بیٹھتے نہیں بن رہا ہے کیا؟'' سردار جی نے سوچا، ایسا شاید سیٹ خالی کرنے کے مقصد سے پوچھا جارہا ہے، اس لیے فوراً جواب دیا، ''ہاں بہین جی، طبیعت خراب ہے، زیادہ دیر بیٹھ نہیں پاتی۔'' بیٹھی بیوی نے کہا، ''اب تو سب سو ہی گئے ہیں، میرے پاس ایک موٹی دری ہے۔ آپ اسے دونوں سیٹوں کے بیچ بچھا کر ان کو وہاں لٹادو، یہاں انھیں پریشانی ہو رہی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے کھڑے شوہر سے مخاطب ہوئی، ''سنیے، آپ ہی تھوڑی جگہ بنا کر یہ دری بچھا دیجیے، بھائی صاحب بیچارے اکیلے ہیں۔'' خود ہی صلاح دے کر اس کی منظوری بھی خود ہی دیتے ہوئے اس نے بیگ سے دری نکال کر شوہر کی طرف بڑھا دی۔ شوہر نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح دری ہاتھ میں لی اور دونوں سیٹوں کے بیچ رکھے سامان کو سیٹوں کے نیچے سرکاتے ہوئے دری بچھا دی۔

دری بچھتے ہی بیٹھی بیوی نے فوراً سردار جی کا بیگ لے کر اسے دری کے ایک سرے پر تکیے کی طرح رکھ دیا اور سردار جی سے بولی، ''لیجیے بھائی صاحب، بھابھی جی کو یہاں لٹا دیجیے، یہاں انھیں آرام مل جائے گا۔'' سردار جی نے اٹھ کر سردارنی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھالیا اور نیچے بچھی دری پر لٹانے لگے۔ اس سب میں کھڑا شوہر بھی مدد کر رہا تھا۔ سردارنی کے لیٹتے ہی کھڑا شوہر بھی فوراً سردارنی کے اٹھنے سے خالی ہوئی جگہ کو پر کر کے بیٹھے شوہر میں بدل گیا۔ سردار جی نے اسے بیٹھتے ہوئے دیکھا لیکن کچھ نہ بولے— بولتے بھی کیسے، ان لوگوں کی دری پر ہی تو سردارنی کو لٹایا ہے۔ سردار جی نے سردارنی کے پیروں کے پاس تھوڑی جگہ بنائی اور وہیں نیچے بیٹھ گئے۔ بیٹھی بیوی نے سردار جی سے کہا، ''یہاں بھابھی جی آرام سے صبح تک سو سکیں گی۔'' جواب میں سردار جی نے بڑی نرمی سے صرف سر ہلا دیا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ ٹرین پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اسے یاد آیا، بچپن میں تاریخ کے استاد اسے بار بار سمجھاتے تھے کہ کس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی بھارت میں آئی، پھر دھیرے دھیرے بھارت میں پھیلی اور آخر میں پورے بھارت پر قبضہ کرلیا۔ تب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ تاریخ کا وہ سبق آج جا کے اس کی سمجھ میں آیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کس طرح بھارت پر قبضہ کیا ہوگا۔ اس نے بیٹھی بیوی اور تازہ تازہ بیٹھے شوہر کی طرف دیکھا۔ اسے لگا، وہ دونوں یونین جیک میں بدل گئے ہیں۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور آنکھیں بند کر او نگھنے لگا۔ باقی

مسافروں کے ساتھ اب بیٹھا شوہر اور بیٹھی بیوی اور سردار جی اور سردارنی بھی اونگھنے سے اب نیند کی طرف بڑھ رہے تھے، کیونکہ اب سبھی مطمئن ہو گئے تھے — یونین جیک سیٹ پر لہرا رہا تھا، اور بھارت نیچے دری پر سو رہا تھا۔ وہ بھی دھیرے دھیرے سو گیا۔

❀❀

Scanned with CamScanner

پنکج سُبیر

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

کفر

ظفر آج بھی گھر نہیں لوٹا ہے۔ ایسا اکثر ہی ہوتا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہارا ظفر دیر رات گھر لوٹتا ہے۔ گھر لوٹ کر ایک ہی بات کہتا ہے، ''آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔ دوست نہیں مانے تو ان کے ساتھ کھا لیا تھا۔'' ممتاز بھی کچھ نہیں بولتی۔ معلوم ہے کہ اس کا شوہر اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے، ورنہ کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ غریبی اور دوست، یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ کبھی نہیں رہ سکتیں۔ بھوک کا پیڑ جب پیٹ میں اُگا ہو تو چہرہ خود ہی بتا دیتا ہے۔ ممتاز اس ایک جھوٹ کو چپ چاپ گردن ہلا کر مان لیتی ہے۔ مان لینے کے علاوہ چارہ بھی کیا ہے۔ جب غربت گھر میں بھائیں بھائیں کرتی ڈول رہی ہو تو بھوک بھی اس کی سہیلی بن کر سر پر تین تگاڑا کھیلتی ہے۔

بچوں کو تھوڑا بہت کھلا پلا کر سلا دیا ہے ممتاز نے۔ ظفر جان بوجھ کر دیر کرتا ہے۔ جانتا ہے، بچے سو گئے ہوں گے۔ جب ہاتھ بھرے ہوتے ہیں تب شام ڈھلے ہی گھر لوٹ آتا ہے۔ مگر ہاتھ بھی روز کہاں بھرے ہوتے ہیں۔ اکثر تو دیر رات اپنے ہی گھر چوروں کی طرح آتا ہے۔ اگر پیٹ میں بھوک ہو تو آنکھوں میں نیند بھی کچی ہوتی ہے۔ پھر بچوں کو بھی کیا معلوم کہ ان کا باپ کس حال میں ہے۔ وہ تو بس یہ جانتے ہیں کہ ابا صبح سے کام پر نکل جاتے ہیں، کام کے بدلے میں پیسے آتے ہیں جس سے کھانا آتا ہے، اور یہ کھانا بھی بھوک مار دوا ہے۔ اب ان کو کون بتائے کہ کام تو آدمی جب کرے جب کام ہو۔ دن بھر فیکٹری کے پچھواڑے بیٹھ کر گھر لوٹا ہوا آدمی خالی ہاتھ نہیں آئے گا تو

کیسے آئے گا۔

تین بھائیوں کی پیٹھ پر پیدا ہوئی ممتاز کا نام ماں باپ نے ممتاز کیوں رکھا تھا، یہ تو اسے پتا نہیں۔ ہاں، نام جیسا کچھ نہیں مل پایا اسے۔ جو ملا وہ سب کچھ ان ناموں کے مطابق تھا جو امی جھونٹے پکڑ کر پیٹتی ہوئی اسے دیتی تھیں: ''کرم جلی''، ''نصیب پیٹی''۔ ان کی ہی زبان پھل گئی تھی۔ اگر وہ ایسا جانتیں تو شاید اسے ممتاز ہی کہہ کر بلاتیں۔

''بچے سو گئے کیا؟'' ظفر نے دھیرے سے پوچھا۔

''ہاں، ابھی سوئے ہیں۔ آج بڑی دیر کر دی؟'' ممتاز نے کہا۔

''ہاں، آج پھر کام نہیں ملا۔ ٹھیکیدار کہتا تھا کہ اگر اور ایسا چلا تو وہ واپس لوٹ جائے گا۔ یہاں اس کو بیٹھے کی مزدوری بھی نہیں مل رہی ہے،'' ظفر نے کرتا اتار کر ممتاز کو دیتے ہوئے کہا۔

''خدا سب ٹھیک کرے گا، اس پر بھروسا رکھو،'' ممتاز نے شوہر کو ٹوٹا ہوا جان کر کہا۔

''ہاں، اب بس اسی کا آسرا ہے،'' ظفر نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ کرتا ٹانگ کر ممتاز باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ ہاتھ میں کھانے کی پلیٹ لیے لوٹی تو ظفر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ بھوک بھی کتنا عادی کر دیتی ہے آدمی کو! جانتا ہے کہ اگر خالی ہاتھ گھر لوٹا ہے تو صرف سلانے کے سوا یہ گھر اور کچھ بھی نہیں دے گا۔

''کھانا کھا لو۔'' ممتاز کی آواز سن کر ظفر چونک پڑا۔

''ارے میں تو...''

ظفر کی بات کاٹتے ہوئے ممتاز بولی، ''باہر سے کھا کر آئے ہو، پر تھوڑا بہت کھا لو، آج تمھاری پسند کا سالن بنایا ہے۔''

''تم نے کھا لیا؟'' ظفر نے ہاتھ میں پلیٹ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''کھا لوں گی۔ آپ کھائیے، تب تک میں اندر کا کام نمٹا لوں،'' کہتے ہوئے جیسے ہی ممتاز اندر جانے کے لیے مڑی ویسے ہی ظفر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آؤ بیٹھو، ساتھ ہی کھا لیتے ہیں،'' ظفر نے ممتاز کو نیچے بٹھاتے ہوئے کہا۔ دونوں میاں بیوی چپ چاپ کھانا کھانے لگے۔ دونوں چھوٹے سے چھوٹا نوالہ کھانے کی کوشش کر رہے تھے تا کہ

Scanned with CamScanner

دوسرا زیادہ کھا سکے۔

''ایسے کب تک۔ چلے گا؟'' ممتاز نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں کہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔۔۔ اب فیکٹری کا آسرا تو ہے نہیں،'' ظفر نے ہاتھ کے نوالے کو پلیٹ میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

ظفر کو نوالہ چھوڑتے دیکھ کر ممتاز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے غلط وقت پر غلط بات کہہ دی۔

''کھا تو لو، فکر کرنے کو تو عمر پڑی ہے،'' ممتاز نے شوہر کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ظفر نے پھر سے کھانا شروع کر دیا۔

''سوچتا ہوں کہ کل کینٹ کی طرف چلا جاؤں۔ سنا ہے، وہاں کچھ فیکٹریوں میں بھرتی چل رہی ہے لیبر کی،'' ظفر نے سر جھکائے ہی کہا۔

''کہیں پچھلی بار جیسا نہ ہو، دیکھ بھال کے جانا،'' ممتاز نے بھی اس طرح سر جھکائے ہوئے کہا۔

''اب ہوتا ہے تو ہوتا رہے، اس پر تو کسی کا بس نہیں ہے!'' ظفر نے تھوڑے سخت لہجے میں کہا۔ کنپٹیوں کی نسیں کچھ ابھر آئیں۔

دو مہینے پہلے بھی ظفر نے ایک جگہ کام کے لیے کوشش کی تھی۔ فیکٹری کے منیجر نے مضبوط قد کاٹھی دیکھ کر اسے رکھنے پر اپنی رضامندی بھی دے دی تھی مگر جب سپروائزر کے سامنے پیشی ہوئی تو ظفر کی قسمت اس کے مذہب کے سامنے ہار گئی۔ باہر نکلتے وقت ظفر کے کان میں وہ جملے بھی پڑے تھے جو سپروائزر منیجر سے کہہ رہا تھا، ''تم کو کچھ عقل بھی ہے کہ نہیں؟ یہ لوگ بھروسے کے قابل بھی ہوتے ہیں؟ سیٹھ ویسے ہی ان لوگوں سے چڑتا ہے۔ خود تو جاؤ گے، ساتھ میری نوکری بھی لے ڈوبو گے۔'' سپروائزر کی کہی بات ظفر کے کانوں میں لاوے کی طرح اتر گئی۔

آدمی نے اپنی بے ایمانی اور کمینے پن کو چھپانے کے لیے مذہب کا لفظ گڑھ لیا ہے۔ یہ لفظ حقیقت میں آدمی نے پوری آدمیت کے کمینے پن کو اجاگر ہونے سے بچانے کے لیے گڑھا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگ بے ایمان ہیں اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھروسے کے لائق نہیں ہیں۔ 'یہ لوگ'، 'وہ لوگ' کے چکر میں پوری آدمیت اپنی بے ایمانی، اپنا کمینہ پن چھپا کر معصوم بنی رہتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ممتاز نے ظفر کی کنپٹیوں اور ماتھے کی رگوں کو ابھرتے دیکھا تو دھیرے سے کہا، ''سب لوگ ایک جیسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔'' کھانا ختم کر کے ظفر لوٹا ہاتھ میں لے کر باہر ہاتھ دھونے چلا گیا۔ ممتاز برتن سمیٹ کر اندر چلی گئی۔

اگلے دن صبح جب ظفر کام پر پہنچا تو وہاں کا ماحول پچھلے دنوں جیسا ہی تھا۔ سارے مزدور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ ظفر بھی جا کر وِنے کے پاس بیٹھ گیا۔ وِنے پڑھا لکھا لڑکا ہے، ظفر سے عمر میں بھی کم ہے، پھر بھی دونوں میں خوب بنتی ہے۔

''آؤ ظفر بھائی، تم بھی دیکھو تماشا!'' وِنے نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

''تماشا؟ آج کیا ہونے والا ہے؟'' ظفر نے پوچھا۔

''سنا ہے آج سب فائنل ہو جائے گا، اپنے اپنے گھر جاؤ، کاندا (پیاز) روٹی کھاؤ،'' وِنے نے طنز کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔

''کھاؤ تو تب نا جب گھر میں ہو!'' ظفر نے طنز کا جواب طنز میں دیا۔

''پوری کویتا سنو، تمھارے سوال کا جواب مل جائے گا۔ اپنے اپنے گھر جاؤ، کاندا روٹی کھاؤ، کاندا روٹی نہ ملے تو چوہے کی پونچھ کتر کر کھاؤ،'' وِنے نے کویتا گا کر سناتے ہوئے کہا۔

''غریبوں کے گھر یہ چوہے کیا بھوکے مرنے آئیں گے؟ آخر چوہوں کا بھی تو پیٹ ہوتا ہے۔ جس گھر میں انسانوں کو ہی دو وقت کی نصیب نہ ہو رہی ہو، وہاں کے چوہوں کو روزے نہیں رکھنا پڑیں گے تو اور کیا ہوگا،'' ظفر نے کہا۔

''ظفر بھائی، کویتا میں نے تو نہیں بنائی! جس نے بنائی اس نے چوہے کی پونچھ ہی کترنے کو کہا ہے،'' وِنے نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ضرور کسی بھرے پیٹ والے نے لکھی ہوگی یہ کویتا، جس کے گھر میں چوہے ہوتے ہوں گے۔ یہاں تو بچے ہی دو وقت کے لیے ترس رہے ہیں،'' ظفر نے کچھ حقارت کے ساتھ جواب دیا۔

''اب کرو گے کیا؟ یہاں تو سنا ہے آج ہی سب کچھ فل اور فائنل ہونے والا ہے،'' وِنے نے ظفر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھوں گا، جہاں مجھے مسلمان ہونے کے باوجود کام مل جائے،'' ظفر کے لہجے میں

کڑواہٹ تھی۔

''ظفر بھائی، ہندو مسلمان تو کوئی دھرم ہے ہی نہیں، اصل دھرم تو دنیا میں دو ہی ہیں: امیری اور غریبی۔ بھرے پیٹ والوں کا دھرم اور خالی پیٹ والوں کا دھرم۔ جب تک آدمی کا پیٹ خالی ہے تب تک اسے نہ تو یہ یاد رہتا ہے کہ میں ہندو ہوں، اور نہ یہ کہ سامنے والا مسلمان ہے۔ مگر جہاں پیٹ بھرا، وہاں فوراً یہ یاد آ جاتا ہے کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان،'' وِنے نے ظفر کے لہجے کی کڑواہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دلائل کے انداز میں یہ بات کہی۔

ظفر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ زمین کریدتا رہا۔

''جب پیٹ میں روٹیاں چھم چھم کر کے ناچ رہی ہوں، تب ہوتا ہے آدمی ہندو یا مسلمان، ورنہ تو ہم ایک ہی ذات کے ہیں، بھک مروں کی ذات کے۔ ہندو یا مسلمان ہونے کا رئیسانہ شوق پالنا ہماری اوقات سے باہر کی چیز ہے،'' وِنے نے ظفر کے غصے کو کم نہ ہوتے دیکھ کر اپنی بات کو بڑھایا۔

''تو پھر میں کہاں جاؤں؟ غریبوں کی فیکٹریاں تو ہوتی نہیں ہیں، ہوتی تو رئیسوں کی ہی ہیں، اور رئیسوں کے لیے میں یا تو مسلمان ہوں یا ہندو۔ 'وہ لوگ' جن پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا!'' ظفر نے پھر طنز کا تیر چلایا۔ وِنے لاجواب ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

''جیسے ہی اپنا نام بتاتا ہوں، ویسے ہی لوگوں کے ماتھے پر شکن پڑ جاتی ہے، جیسے میں مسلمان نہ ہو کر کوئی جانور ہوں۔ کیا مجھے سب دکھائی نہیں دیتا ہے؟ اور بے ایمانی تو آدمی کی سرشت میں ہے لیکن یہ بے ایمانی ہمیشہ بھرے پیٹ والے ہی کرتے ہیں۔ ہم جیسے بھک مرے لوگوں کو روٹی کا مسئلہ حل کرنے سے ہی فرصت کب ملتی ہے جو بے ایمانی جیسے امیروں کے شوق پالیں،'' ظفر نے وِنے کو خاموش دیکھ کر کہا۔

''اور، بچے کیا کرتے ہیں دن بھر؟'' وِنے نے بات کو گمبھیر ہوتے دیکھ کر موضوع بدلا۔

''کرتے کیا ہیں! جب تک یہاں کا کام چلتا تھا وہ اسکول بھی جاتے تھے، پر اب تو حالت یہ ہے کہ دن بھر مارے مارے محلے میں پھرتے ہیں،'' ظفر نے جواب دیا۔

''کہیں کام پر کیوں نہیں لگا دیتے؟ چار پیسے لائیں گے تو تم کو بھی سہارا ملے گا،'' وِنے نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''ہاں اب تو یہی کرنا پڑے گا۔ سوچتا تھا کہ فیکٹری میں کام چالو ہو جائے گا تو پھر سے اسکول بھیجنا شروع کر دوں گا۔ بچوں کے ہاتھوں میں پیچ کش اور پانے پکڑانا نہیں چاہتا تھا، پر ایسا لگتا ہے کہ یہی قسمت میں لکھا کر آئے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو ممتاز کا کہ اسے کچھ سینا پرونا آتا ہے، تھوڑا بہت اِدھر اُدھر کا کام کر کے گھر کا چولھا سلگا لیتی ہے،'' ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ظفر نے کہا۔

''کوئی ضروری ہے کہ بچوں کو مکینک ہی بناؤ؟ اور بھی تو کام ہیں،'' وِنے بولا۔

''جو لوگ مجھے مسلمان ہونے کی وجہ سے کام نہیں دے رہے ہیں، وہ میرے بچوں کو دیں گے کیا؟'' ظفر نے پھر تلخی سے کہا۔

''ایک کام ہے تو سہی، اور روز روز کا بھی نہیں ہے، بس ہفتے میں ایک دن کرنا ہے۔ تینوں بیٹے ایک دن میں ہی اتنا کما لیں گے کہ گھر بھی چل جائے گا اور اسکول بھی جانے لگیں گے،'' وِنے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''کوئی غلط کام ہی ہوگا۔'' ظفر نے کہا

''غلط کا مطلب چوری وغیرہ تو نہیں، ہاں تمھارے مذہب کے حساب سے وہ ضرور ہے جسے تم وہ... کیا کہتے ہو... ہاں کفر۔ کفر ضرور ہے،'' وِنے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کفر کی تو تب سوچیں جب پیٹ میں روٹیاں ہوں۔ خالی پیٹ والوں کے لیے کیا کفر اور کیا اس کا ڈر!'' ظفر نے کہا۔

''تو چلو میرے ساتھ،'' وِنے نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟ پہلے یہاں کا فیصلہ تو سن لیں،'' ظفر نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''فیصلہ تو ہو چکا ہے، اب ہمارے سننے یا نہ سننے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ تم چلو تو میرے ساتھ،'' وِنے نے ہاتھ پکڑ کر ظفر کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

''پر چلنا کہاں ہے؟''

''تم چلو تو سہی، تمھیں کچھ سامان دلاتا ہوں،'' وِنے بولا۔

''سامان؟ یہاں تو روٹیوں کے لالے پڑے ہیں اور تم سامان خریدنے کی بات کر رہے ہو؟'' ظفر نے پھر حیرانی سے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''ابھی ادھار دلوا دیتا ہوں، پرسوں آ کر پیسے دے جانا۔''

''کہاں سے دے جاؤں گا؟ کیا کل پیسے آسمان سے ٹپک پڑیں گے؟'' ظفر نے پھر سوال کیا۔

''آسمان سے نہیں۔ انھی رئیسوں کے پاس سے آئیں گے جو تمھیں کام نہیں دے رہے ہیں،'' ونے نے کہا۔

''کیسے آئیں گے؟'' چلتے ہوئے ظفر نے پوچھا۔

''سب معلوم ہو جائے گا۔ تم چلو تو سہی،'' کہتے ہوئے ونے نے ظفر کو بانہہ پکڑ کر کھینچ لیا۔

شام کو جب سامان کا جھولا لیے ہوئے ظفر گھر پہنچا تو ممتاز حیرت میں پڑ گئی۔

''یہ کیا لے آئے؟'' ہاتھ کا جھولا پکڑتے ہوئے اس نے کہا۔

''کام کا سامان ہے، ونے نے دلوایا ہے۔ کل سے بچوں کو کام پر بھیجنا ہے۔ اور ہاں، ایک تھیلی میں کچھ راشن بھی ہے۔ ونے نے ہی دلوا دیا ہے کہ پرسوں آ کر پورا حساب کر جانا،'' ظفر نے جواب دیا۔

''کام پر بھیجنا ہے؟ کہاں؟'' ممتاز نے پوچھا۔

''وہ کل بتا دوں گا۔ صبح جلدی اٹھا کر بچوں کو نہلا دھلا کر تیار کر دینا،'' ظفر نے مختصر سا جواب دے کر بات کو ختم کر دیا۔

صبح جب ممتاز بچوں کو نہلا دھلا کر لائی تو دیکھا، ظفر سارا سامان جما کر بیٹھا ہے۔ ظفر نے بچوں کو دیکھا تو ممتاز سے بولا،''میرے واسطے بھی نہانے کا پانی بھر دو۔ تب تک میں بچوں کو تیار کر دیتا ہوں۔''

ممتاز جب پانی بھر کر لوٹی تب تک ظفر بچوں کو تیار کر چکا تھا۔

ممتاز نے دیکھا تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی،''یا خدا! یہ کیا کفر کر رہے ہو؟''

''کچھ کفر نہیں ہے! یہ بس ایک دن کا ہی ہے، بس ہفتے میں ایک دن کے لیے،'' ظفر نے لاپروائی سے کہا۔

''ذرا تو خدا کا خوف کرو!'' ممتاز نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''اس میں برا کیا ہے، جو ڈروں؟ کوئی چوری ڈکیتی جیسے کام تو کروا نہیں رہا میں اپنے بچوں سے۔'' ظفر نے جواب دیا۔

''مگر پاس پڑوس والے کیا کہیں گے؟'' ممتاز نے پھر سوال کیا۔

''کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ منھ اندھیرے یہ بچے نکلیں گے تو شام ڈھلنے کے بعد ہی آئیں گے۔ کوئی دیکھے گا ہی نہیں تو بولے گا کیا!'' ظفر نے پھر اتنی ہی لاپروائی سے کہا۔

''مگر...؟'' ممتاز نے کچھ دلائل دینے کی کوشش کی لیکن ظفر نے ہاتھ کا اشارہ کر کے بات کاٹتے ہوئے کہا، ''بس... اب اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی۔''

ممتاز نے شوہر کے تیور دیکھے تو کچھ نہیں بولی۔

ظفر نے چھوٹے بیٹے کے بال ٹھیک کیے اور بولا، ''ٹھیک ویسا ہی کرنا جو میں نے بتایا ہے۔ ان تین لفظوں کے علاوہ کچھ بھی مت بولنا نہیں تو سب معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔''

بڑے بیٹے نے جواب دیا، ''جی ابو...''

''چلو ایک بار اپنی امی کے سامنے جا کر پریکٹس کر لو۔'' ظفر نے کچھ مسکرا کر ممتاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تینوں بچے ممتاز کی طرف پہنچے اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اسٹیل کی لٹکن کو اوپر اٹھاتے ہوئے ایک آواز میں بولے، ''جے شنی مہاراج!''

❁❁

پنکج سُبیر

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

گھیراؤ

واقعے کو دیکھا جائے تو کوئی اتنا بڑا واقعہ نہیں تھا جس پر اتنا واویلا مچایا جائے، ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا جائے۔ لیکن اگر شہر کی تاریخ دیکھیں تو یہی چھوٹا سا واقعہ بارود کے گھر میں چھوٹی سی اگربتی ثابت ہو سکتا ہے۔ شہر کے کچھ آوارہ شہدے اسکول سے لوٹتی ہوئی دو بہنوں کو روز چھیڑتے تھے۔ بہنوں کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ ان کے گھر میں مرد نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کے باپ بینک میں نوکری کرتے تھے جن کے اچانک گزر جانے کے بعد ماں کو بینک میں نوکری مل گئی تھی۔ اس گھر میں یہ ملا کر کل تین تھیں، ماں اور دو بیٹیاں۔ دونوں بہنیں چپ چاپ سر جھکائے ان آوارہ لڑکوں کی چھیڑ چھاڑ کو برداشت کرتی گھر لوٹتی تھیں۔

ایک مرتبہ اسکول کے پرنسپل سے بھی دونوں نے شکایت کی، جس پر پرنسپل نے پولیس میں شکایت بھی درج کرا دی، لیکن اگر کہاوت کی زبان میں بات کی جائے تو ڈھاک کے پتے وہی تین رہے۔ پولیس نے الٹے آ کر ان دونوں بہنوں سے ایسے ایسے سوال پوچھے کہ اس کے بعد ان کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ کہیں اور شکایت درج کرواتیں۔ پولیس کی طرف سے بھی جب ہری جھنڈی مل گئی تو شہدوں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ لڑکیوں کے پاس سے تیز رفتار سے موٹر سائیکل گزارنا، دوپٹہ کھینچ لینا جیسی حرکتیں اور بڑھ گئیں۔

یہ جو واقعہ ہوا اس کی کڑیاں بھی وہیں سے جڑتی تھیں، اور وہ بات صرف اتنی سی تھی کہ مرنے

والے مسلمان تھے۔

ہاں، تو ہوا اس طرح کہ راستے میں دوپٹہ کھینچنا، چھیڑنا جیسے واقعات کوئی ایک لڑکا نہیں کرتا تھا، یہ سبھی کی ملی جلی کوششیں تھیں، مگر وہ لڑکا کچھ زیادہ جوش میں آ گیا تھا۔ اتوار کے روز جب صبح صبح جب وہ لڑکی کے گھر کے سامنے سے موٹر سائیکل پر جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ بڑی بہن گھر کے باہر رسی پر کپڑے پھیلا رہی ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، موٹر سائیکل کھڑی کی اور دوڑ پڑا۔ جب تک وہ لڑکی کچھ سمجھتی، تب تک اس نے اسے بانہوں میں بھرا اور جگہ جگہ چوم لیا۔ چومنے کے بعد موٹر سائیکل اٹھائی اور یہ جا وہ جا۔ روتی ہوئی لڑکی اندر پہنچی اور ماں کو ساری بات بتائی۔ ماں بھی شاید اسی دن کی تاک میں تھی؛ چونکہ چھیڑنے والے لڑکے آدھے ہندو تھے آدھے مسلمان، اس لیے اس کا کوئی بھی داؤ نہیں لگ رہا تھا، مگر آج جو آیا تھا وہ تو صرف اور صرف مسلمان تھا، اور لڑکی ہندو تھی۔

ماں نے باہر نکل کر چھاتی پیٹ پیٹ کر رونا شروع کر دیا۔ بات کی بات میں لوگ جمع ہو گئے۔ ماں نے جو تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی اس میں یہ کہیں نہیں تھا کہ آوارہ لڑکا آ کر میری لڑکی کے ساتھ غلط حرکت کر کے چلا گیا۔ تصویر تو کچھ اس طرح سے سامنے آئی کہ ایک مسلمان لڑکا ہندوؤں کے محلے میں آ کر ایک ہندو لڑکی کے ساتھ غیر مہذب سلوک کر کے چلا بھی گیا۔ ماں جانتی تھی کہ جب تک لڑکے کے آوارہ پن کو نمک مرچ لگاتے ہوئے مسلمان نہ بتایا تب تک کچھ نہیں ہونے والا ہے۔

لڑکیوں کی ماں کا تیر بالکل نشانے پر بیٹھا۔ بھیڑ میں شامل جوان لڑکوں کی مچھلیاں ماں کی بات سنتے ہی پھڑک اٹھیں۔ کب بنا، کس نے بنایا یہ منصوبہ، یہ تو کوئی نہیں جانتا، لیکن ہوا یوں کہ واقعہ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ رات کو وہ لڑکا اپنے ایک دوست کو لے کر پھر آیا۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ صبح سے رات ہونے تک وہ آوارہ لڑکا نہیں رہا تھا، وہ اب مسلمان ہو چکا تھا۔ اور اِدھر ایک بھرا پُرا ہندو دھرم اس کی وجہ سے اپنے کو، اپنی عزت و آبرو کو خطرے میں محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ سوال اب بھی لاجواب ہے کہ اگر اتوار کی اس صبح وہ لڑکا جوش میں نہ آتا اور اس کے ساتھ والا کوئی ہندو لڑکا جوش میں آ کر وہی حرکت کر جاتا تو کیا ہوتا!

خیر، تو ہوا یہ کہ صبح کے خمار میں ڈوبا وہ لڑکا شام کو پھر لوٹا، مگر اس شام اس کا آنا ایسا رہا کہ پھر اس کا لوٹنا نہیں ہوا۔ اِدھر اس نے اپنی موٹر سائیکل کو لڑکی کے گھر کے سامنے روکا اور اُدھر کسی نے

ٹرانسفارمر کا کٹ آؤٹ نکال کر پورے محلے کی بجلی گل کر دی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کیا ہوا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ وہ تو اس وقت اندھیرے میں تھا۔ شور شرابا، مار پیٹ، چلّانے کی، کراہنے کی آوازیں، ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں — یہی سب کچھ پندرہ بیس منٹ تک ہوتا رہا۔ پھر کچھ بھگدڑ سی مچی اور خاموشی چھا گئی۔ یہ اندھیرے کی خاصیت ہے کہ اس میں ہونے والے واقعات کا خاتمہ خاموشی پر ہی ہوتا ہے۔ کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی، ٹوٹی تو پولیس کے آنے پر۔ واقعے کا خاص کردار تو جائے وقوع پر ہی ختم ہو چکا تھا، مگر اس کا ساتھی صرف اس لیے زندہ تھا کیونکہ ابھی اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ مرنا اس کو بھی تھا، سو وہ بھی اسپتال میں رات بھر زندہ رہنے کے بعد صبح سدھار گیا۔

دیکھا جائے تو واقعہ یہیں پورا ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ مگر دراصل واقعہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ دونوں لڑکوں کے مرنے کے بعد وہ اور زبردست طریقے سے مسلمان ہو گئے۔ زبردست سے مراد ہے کہ ان کے مرنے سے پہلے ہندوؤں کو لگا تھا کہ یہ مسلمان ہیں، مگر مرنے کے بعد مسلمانوں کو بھی لگا کہ ارے، وہ تو مسلمان تھے! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس تیرہ سال کے لڑکے سنی نے ہی اپنے باپ کے موٹر سائیکل کے شوروم سے پرانا سائلنسر اٹھا کر اس سے دونوں لڑکوں کے سر پر وار کیے تھے، جس سے وہ مر گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سنی کا واقعے کے دو بڑے کرداروں یعنی دونوں لڑکیوں میں سے چھوٹی کے ساتھ چکر تھا اور اپنی محبوبہ کے سامنے اپنی بہادری دکھانے کا یہ سب سے اچھا موقع جب اسے ملا تو اس نے اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس بات کو کچھ لوگ یہ کہہ کر کاٹ دیتے ہیں کہ بھلا تیرہ سال کے بچے کا بھی ایسا کوئی چکر ہو سکتا ہے۔ تو اس پر جواب ملتا ہے، ٹی وی سیریل دیکھنے والے بچے ہیں بھئی! اِدھر ماں کا دودھ چھوڑتے ہیں اور اُدھر جوان ہو جاتے ہیں۔

اس پورے معاملے پر (یقیناً ہندو) کہتے ہیں کہ مرنے والا دوسرا لڑکا سنی کے باپ کے شوروم پر کام کرتا تھا، جہاں سے اسے نکال دیا گیا تھا، بس اسی عداوت میں اس نے مارنے والوں میں سنی کا نام بھی لکھوا دیا اور مر گیا۔ کچھ لوگ (یقیناً مسلمان) کہتے ہیں کہ مرنے والے لڑکے کے ساتھ سنی کی بہن کا کچھ چکر ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے سنی کے باپ نے اسے اپنے یہاں سے ہٹا دیا تھا، اور اسی بات کا بدلہ سنی نے اس سے اس روز لیا، اسے اتنا مارا کہ وہ مر ہی گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، اس لیے بھی کہ

Scanned with CamScanner

واقعے کے وقت اندھیرا بھی تھا اور بھیڑ بھی تھی۔ یہ دونوں ہی اندھی چیزیں ہیں؛ نہ تو بھیڑ کی آنکھیں ہوتی ہیں اور نہ اندھیرے کی — یہ دونوں چیزیں اکیلے اکیلے ہی بہت خطرناک ہوتی ہیں، اگر دونوں مل جائیں تو پھر کیا کہنا!

خیر، تو دونوں لڑکے مرنے کے بعد مسلمان ہو گئے۔ دونوں کے گھر قریب ہی قریب واقع تھے۔ جب دونوں کی لاشیں گھر لائی گئیں تب تک اس محلے کے سارے لڑکے اسی طرح سے مسلمان ہو چکے تھے جس طرح سے بیتی رات اُس محلے کے لڑکے ہندو ہو گئے تھے۔ بات کی بات میں 'خون کا بدلہ خون' جیسے نعرے اچھلنے لگے۔ شہر میں اس سے پہلے ہی تین فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے، اس لیے پولیس بھی فوراً حرکت میں آ گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ حرکت میں آ گئی صحافی برادری، جن میں سمیر بھی تھا — ایک ٹی وی چینل کا نیوز اسٹرنگر۔

شہر میں تناؤ کب ہو گیا، کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ رات میں ٹھیک ٹھاک سوتے لوگوں نے جب صبح آنکھیں کھولیں تو شہر تناؤ کی فضا میں تھا۔ جیسے جیسے دن چڑھنے لگا، لوگ دھیرے دھیرے لوگوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بدلنے لگے۔ پولیس انھیں واپس لوگوں میں بدلنے کی کوشش میں لگ گئی، تو صحافی لوگوں میں آئی تبدیلی کو سرخیوں میں ڈھالنے میں جٹ گئے۔ سمیر کا اپنے چینل پر تین بار 'فونو' ہو چکا تھا۔ تینوں بار نیوز کاسٹر نے اس سے ایک ہی بات پوچھی تھی: ''ہاں سمیر جی، بتایئے، کیا صورت حال ہے وہاں؟'' اور تینوں بار سمیر نے ایک ہی سا جواب دیا تھا: ''جی ہاں، کافی تناؤ ہے، حالانکہ ابھی کسی بھی ناخوشگوار واقعے کی اطلاع نہیں ملی ہے کہیں سے، اور پولیس صورت حال کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہے، پھر بھی چاروں طرف دہشت کا ماحول ہے۔''

دلّی میں بیٹھے نیوز ایڈیٹر بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ کچھ ہو جائے، مگر یہاں کا تناؤ واقعات میں بدل نہیں پا رہا تھا۔ خبروں کی دنیا ہی ایسی ہے — یہاں روز کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ کل جو کچھ بھی ہوا وہ بھلے اہم ہی ہو اور ہو گیا ہو، مگر وہ آج کی سرخی نہیں بن سکتا۔ آج تو کچھ نہ کچھ نیا ہی چاہیے، کچھ ایسا جو آج کا ہی ہو۔

پولیس سرگرم تھی تو صرف اس بات کو لے کر کہ دونوں مرے ہوئے لڑکوں کو جلد از جلد دفنا دیا جائے۔ پولیس کو پتا تھا کہ لاشیں سیاست کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ جب تک لاشیں گھر میں رکھی

Scanned with CamScanner

رہیں گی تب تک یہ تناؤ بھی رہے گا۔ ڈی ایس پی خود گھر والوں سے کئی بار منتیں کر چکے تھے کہ جلدی سے جنازے اٹھائے جائیں، لیکن لڑکوں کے گھر والے ہر بار ٹکا سا جواب دے کر لوٹا رہے تھے۔ 'خون کا بدلہ خون' کے نعروں کے بیچ اب چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں کہ جب تک سنی کے خلاف تین سو دو کا مقدمہ درج نہیں کیا جائے گا تب تک جنازے نہیں اٹھیں گے۔ ڈی ایس پی ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کبھی وائرلیس پر پھنکارتے ہوئے ایس پی کو جواب دیتے، تو کبھی نیوز چینل والوں کو سیل فون پر واقعے کی جانکاری دے رہے تھے۔

دو پہر ہونے تک بھی جب جنازے نہیں اٹھے تو آخر میں ایس پی کو آنا پڑا۔ ایس پی اروند کمار بھی گھٹا ہوا ڈپلومیٹ تھا۔ اس نے لڑکوں کے خاندان والوں کو اس بات کی یقین دہانی کرائی کہ سنی کے خلاف ضرور مقدمہ درج ہوگا، آپ جنازے تو اٹھائیے۔ اور آخر کار جنازے اٹھے۔ بڑی تعداد میں پولیس کے جوان ڈی ایس پی کے ساتھ تھے تو پیچھے بھی اتنی ہی پولیس سٹی کوتوالی کے تھانہ انچارج کے ساتھ، اور ان کے ساتھ تھے صحافی، پل پل کی خبریں سیل فون کے ذریعے نشر کرتے: ''ہاں اخلاق، یہاں سے جنازے اٹھ گئے ہیں، پولیس کی بھاری نفری ساتھ ہے۔''

ہونے کو تو پولیس کو یہی لگ رہا تھا کہ سب کچھ ان کی سوچ کے مطابق ہی ہو رہا ہے، لیکن کہتے ہیں نا کہ بھیڑ اور بھیڑ کا کوئی بھروسا نہیں — جس نے بھروسا کیا اس سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں۔ نوجوان ڈی ایس پی بھی یہاں پر مار کھا گیا۔ جنازے کی نماز کے بعد جنازہ مسجد سے آگے بڑھا تو بھیڑ کے سُر بالکل بدل چکے تھے۔ جس وقت ڈی ایس پی ایس پی کو وائرلیس پر باخبر رکھ رہا تھا کہ ''سر، یہاں سب ٹھیک ہے،'' ٹھیک اسی وقت جنازہ شہر کے صدر چوراہے پر رکھا بھی جا چکا تھا اور بھیڑ نے باقاعدہ پہیہ جام بھی شروع کر دیا تھا۔

چوراہا ٹھیک اُس جگہ پر تھا جہاں سے دونوں محلے الگ ہوتے ہیں — یعنی مرنے والوں کا محلہ اور مارنے والوں کا محلہ۔ نعرے بازی اور شور شرابے کے بیچ آنا فانا دکانوں کے شٹر گرے اور افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔ گھروں میں دبکے لوگ سانس تھامے، اب کچھ ہوا تب کچھ ہوا کا انتظار کرنے لگے۔ چینلوں کے اینکرز سیل فونوں پر چیخنے لگے:

''ہاں پریہ درش، یہاں پر جیسا کہ خدشہ تھا ویسا ہی ہوا ہے۔ جنازے کو چوراہے پر رکھ کر پہیہ

جام کر دیا گیا ہے۔ ساری دکانیں بند کر دی گئی ہیں۔'' '' جی اخلاق، تناؤ گہرا ہے۔ پورے بازار کی دکانیں بند ہو چکی ہیں۔'' اور انھی سب کے بیچ سمیر بھی تھا۔ پندرہ دن پہلے ہی دلّی سے اسٹرنگر تعینات ہوا تھا۔ اس کے لیے یہ بڑا واقعہ تھا۔

ایس پی نے خود پہنچ کر پہیہ جام کرنے والوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بھیڑ ڈی ایم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ انھیں سنی کی گرفتاری کے ساتھ ساتھ پانچ پانچ لاکھ کا معاوضہ بھی چاہیے تھا۔ ایس پی نے ڈی ایم وندنا سکسینہ سے بات کی۔ تھوڑی ناں ہاں کے بعد وہ جائے وقوعہ پر آ گئیں۔ ڈی ایم کو دیکھ کر بھیڑ پورے جوش میں آ گئی۔ مانگوں کے نعرے لگنے لگے۔ ڈی ایم نے معاوضے سے متعلق اپنی مجبوری بتائی کہ ڈی ایم کے اختیار میں جتنا ہوتا ہے میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتی۔ بھیڑ دوبارہ سنی پر مقدمہ درج کرنے کی مانگ پر اڑ گئی۔ '' جب تک سنی پر تین سو دو کا مقدمہ درج نہیں ہوتا، تب تک جنازوں کو نہیں اٹھایا جائے گا۔''

''نہیں سر، ایسی کوئی گمبھیر صورت حال نہیں ہے،'' ڈی ایس پی اروند کمار نے سیل فون پر آئی جی کو جواب دیا۔

'' کیا گمبھیر نہیں ہے؟ ابھی کسی چینل سے بتایا جا رہا تھا کہ صورت حال کشیدہ ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے!'' اُدھر سے آئی جی کی پھٹکار آئی۔ '' جلدی حالات قابو میں لائیے اور مجھے بتائیے،'' کہتے ہوئے آئی جی نے فون کاٹ دیا۔

ایس پی نے پاس سے گزرتے ہوئے سمیر کو روک کر پیشانی پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا، '' سمیر جی پلیز! تھوڑا لو پروفائل رکھیے معاملے کو... آخر آپ بھی تو شہر کا ہی بھلا چاہتے ہیں۔''

'' بھلا تو آپ کر سکتے ہیں اس پہیہ جام کو ٹال کر! نہیں تو ابھی کچھ کا کچھ ہو جائے گا،'' سمیر نے جواب دیا۔

'' وہ تو ہم کر رہی رہے ہیں، پر آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ لوگ ڈی ایم کی بھی نہیں سن رہے ہیں،'' ایس پی نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

'' اروند جی، آپ صحافیوں کو مینج کرنے کے بجائے جا کر بھیڑ کو مینج کیجیے، وہ زیادہ بہتر ہے،'' سمیر نے جواب دیا۔ اروند کمار نے گہری نظروں سے سمیر کی طرف دیکھا۔ سمیر آگے بڑھ گیا۔

Scanned with CamScanner

''ایس پی صاحب، آپ ان لوگوں کے سامنے سنی پر مقدمہ درج کرنے کی کارروائی کر دیں، یہ لوگ جنازہ اٹھا لیں گے،'' ڈی ایم وندنا سکسینہ نے، جو بزرگ نظر آنے والے لوگوں کے ساتھ جائے وقوعہ سے آئی تھیں، اروند کمار سے کہا۔

''جی میڈم،'' اروند کمار نے جواب دیا۔

''چلیے، آپ لوگ بھی سٹی کوتوالی تک چلیں، آپ لوگوں کے سامنے ہی ساری کارروائی ہو جائے گی،'' وندنا سکسینہ نے ساتھ آئے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''بہت اچھا میڈم،'' ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

سٹی کوتوالی میں اروند کمار نے خود اپنے ہاتھ سے سنی کا مقدمہ درج کیا۔ وندنا سکسینہ نے ان لوگوں کو روزنامچہ دکھایا۔ مطمئن ہو کر وہ لوگ واپس چلے گئے۔ کچھ ہی دیر میں پہیہ جام ختم ہو گیا اور جنازے بڑھ گئے۔

''جی، یہاں صورت حال اب ٹھیک ہے۔ ایس پی اروند کمار نے خود اس تیرہ سالہ لڑکے سنی کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کر لیا ہے،'' سمیر اپنے سیل فون پر کہہ رہا تھا۔

فون ختم کر کے پلٹا تو اروند کمار نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا، ''صحافی صاحب، اگر آپ تیرہ سالہ لڑکا نہیں کہتے تو شاید واقعہ سنسنی خیز نہ ہو پاتا نا؟''

''اس میں سنسنی خیزی کی کیا بات ہے؟ یہ تو سچ ہے،'' سمیر نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ سچ بھی آپ کو وہی اچھا لگتا ہے جو سنسنی خیز ہو،'' اروند کمار نے پھر طنز کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کریں صاحب، یہ تو آپ کی اور ہماری مجبوری ہی ہے کہ ہم دونوں چاہ کر بھی اچھائیوں کی دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ ہمارا سامنا اسی سچ سے ہوتا ہے جو برا ہے،'' سمیر نے جواب دیا۔

''چلیے اب فضول بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ معاملہ ختم ہو گیا، کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا، یہی بڑی بات ہے،'' وندنا سکسینہ نے دونوں کے بیچ دخل دیتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ ایسا سوچتی ہیں کہ معاملہ ختم ہو گیا ہے؟'' سمیر نے کچھ گمبھیر لہجے میں وندنا سکسینہ سے کہا۔

Scanned with CamScanner

بھنوؤں کو کچھ ترچھا کرتے ہوئے وندنا سکسینہ نے پوچھا، ''کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے ؟''

''کوئی بھی سمجھدار شخص ایسا نہیں سوچ سکتا، اور خاص کر وہ جو اس شہر کی فطرت سے واقف ہو،'' سمیر نے بہت نپے تلے انداز میں کہا۔

''کیوں ؟'' اس بار سوال اروند کمار نے کیا۔

''وہ اس لیے کیونکہ ابھی آپ نے ایک دھرم والوں کو مطمئن کر کے واقعے کو ٹال دیا ہے، ابھی دوسرا دھرم تو باقی ہے، جس کا وہ تیرہ سال کا لڑکا ہے جس کے خلاف آپ نے مقدمہ درج کر لیا ہے،'' سمیر نے جواب دیا۔

''اس سے کیا ہوتا ہے؟'' وندنا سکسینہ نے سوال کیا۔

''اس سے دھرم خطرے میں پڑ جاتا ہے،'' سمیر نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''مطلب؟'' وندنا سکسینہ نے دوبارہ سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ لڑکے کے باپ کو صرف یہی تو کہنا ہے کہ یہ مقدمہ میرے بیٹے کے خلاف نہیں بلکہ پورے ہندو دھرم کے خلاف ہے۔ مذہب خطرے میں ہے۔ اور ہمارے دیش میں بھیڑ کو اکٹھا کرنے کے لیے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ مذہب کو خطرے میں ڈال دو،'' سمیر نے کچھ لاپروائی کے انداز میں کہا۔

''نہیں نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ایس پی صاحب، آپ حالات پر کڑی نگاہ رکھیں۔ کہیں کوئی افواہیں پھیلانے کی کوشش نہ کرنے پائے۔ اور سمیر جی، آپ بھی تھوڑا دیکھتے رہیے گا، آپ لوگوں کے ہاتھوں میں تو شہر کی نبض ہوتی ہے،'' کہتے ہوئے وندنا سکسینہ نے ڈرائیور کو اشارہ کر دیا۔ ڈرائیور نے کار آ کر لگائی اور وندنا سکسینہ بیٹھ کر اس میں روانہ ہو گئیں۔

''اچھا سر، میں بھی چلتا ہوں،'' سمیر نے اروند کمار کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اروند کمار نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ بھی ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''اچھا سمیر جی، بس تھوڑا ہم لوگوں کا خیال رکھ لیجیے گا۔''

اگلے دن جب صبح لوگ سو کر اٹھے تو شہر بھر میں مذہب کے خطرے میں ہونے سے متعلق خبریں پوری طرح سے بکھر چکی تھیں۔ کمپیوٹر پر کمپوز اور فوٹو کاپی کر کے بانٹے گئے ان پرچوں میں کل

Scanned with CamScanner

ملا کر ایک ہی بات تھی کہ دھرم خطرے میں ہے اور یکجہتی کی ضرورت ہے۔ اب ان پرچوں کے بارے میں بھی مختلف رائیں ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ پرچے لڑکے کے باپ نے ہی اپنے شوروم کے کمپیوٹر پر نکلوا کر بنوائے تھے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ کٹر ہندوتوا کا پرچار کرنے والے اخبار کے مالک سے لڑکے کے باپ کی کل رات خفیہ ملاقات ہوئی تھی اور صبح سویرے اخبار بانٹنے والے ہرکاروں نے ان پرچوں کو گھر گھر پہنچا دیا تھا۔

وجہ چاہے جو بھی رہی ہو لیکن اِدھر آسمان سے صبح کی سیندوری سرخی کا رنگ ہٹا اور اُدھر سارے شہر میں یہی رنگ پھیل گیا۔ سارے شہر میں زعفرانی رنگ کی چندری گلے میں ڈالے ہوئے لوگ نظر آنے لگے۔ جیسے جیسے دن چڑھنے لگا، چندریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ رات کو بانٹے گئے ان پرچوں میں ایک ہونے کی تلقین کی گئی تھی، اس سے وہ بہادر دستہ حرکت میں آ چکا تھا۔

''نہیں سمیر، فرقہ واریت سوچ رکھنے والی تنظیموں کی کوئی خبر ہمارے چینل سے نشر نہیں ہوتی،'' نیوز ایڈیٹر نے فون پر جواب دیا۔

''لیکن اودھیش جی، یہاں پر کافی تناؤ ہے اور یہ ہندو تنظیمیں اس لڑکے کے باپ کے اشارے پر پورے شہر کو آگ میں جھونکنے کے لیے تیار بیٹھی ہیں،'' سمیر نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''چاہے جو ہو، ہمارا اصول ہے کہ ہم فرقہ واریت کو ہوا دینے والی کوئی خبر نشر نہیں کرتے، نہ اچھی نہ بری،'' نیوز ایڈیٹر اودھیش پتر ویدی نے دوٹوک الفاظ میں یہ بات کہی۔

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''آپ صورت حال پر نظر رکھیے، کچھ بھی ہوتا ہے تو ہمیں فوراً بتایئے۔''

''ٹھیک ہے اودھیش جی، ہم کچھ ہونے کا انتظار کرتے ہیں،'' سمیر نے طنزیہ لہجے میں کہا اور فون کاٹ دیا۔

گھر کی کھڑکی سے سمیر باہر کی طرف دیکھنے لگا جہاں سیندوری رنگ گاڑھا ہوتا جا رہا تھا۔ کہیں کہیں سے نعروں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھی۔

''چاچا، آپ جا نہیں رہے وہاں؟'' بارہ سال کے بھتیجے نے آ کر پوچھا۔

Scanned with CamScanner

''نہیں بیٹا، ابھی نہیں، جب دنگا ہوگا تب جاؤں گا،'' سمیر نے اسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ بھتیجا چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔

کھڑکی کے پاس سے گزرتے ایک جان پہچان کے بجرنگی کو دیکھ کر سمیر نے پوچھا، ''کیوں بھئی، کیا چل رہا ہے؟''

''بس ابھی تو بڑے بازار میں سب کو جمع کیا ہے۔ پھر وہیں فیصلہ ہوگا کہ کیا کرنا ہے،'' اس شخص نے جواب دیا۔

''پھر بھی، کیا پلان ہے؟'' سمیر نے ٹٹولا۔

''ابھی کچھ طے تو نہیں ہے، پھر بھی بازار سے کلکٹریٹ تک ریلی تو نکلے گی۔ مظاہرے اور گھیراؤ کا طے ہونا ابھی باقی ہے،'' اس شخص نے پھر جواب دیا۔

''کتنے لوگ ہو جائیں گے اندازاً ریلی میں؟''

''تین چار ہزار تو ہونے ہی چاہییں۔ ہم نے اس کو سیاسی رنگ نہیں دیا ہے، ہر سچے ہندو کو بلایا ہے۔ جسے بھی لگتا ہے کہ مسلمانوں کے اشارے پر ایک تیرہ سال کے معصوم ہندو بچے پر قتل کا مقدمہ درج کرنا ہماری عزت اور وقار پر ایک کاری ضرب ہے، وہ ہمارے ساتھ ساتھ آئے، ہم نے یہی گزارش کی ہے۔'' اس شخص کا چہرہ کچھ تن گیا۔

''لڑکے کی گرفتاری ہوگئی؟'' سمیر نے سوال کیا۔

''ایسے کیسے ہو جائے گی! آگ نہیں لگا دیں گے تھانے کو؟'' اس شخص کا چہرہ مکمل طور پر تن چکا تھا۔

''آپ نہیں آرہے کوریج کرنے؟'' اس شخص نے سمیر سے پوچھا۔

''بس آتا ہوں، آپ چلیے،'' سمیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

اس شخص کے جاتے ہی سمیر بھی اٹھ کر جوتے کے تسمے باندھنے لگا۔

جانا تو ہوگا ہی۔ . . پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔

بڑے بازار کا ماحول کافی جوشیلا تھا۔ ہزاروں لوگ تھے جن میں سے زیادہ تر کے گلوں میں پیلی چندیاں بہادری کی نشانی کے طور پر پڑی تھیں۔ سب کے چہرے تنے ہوئے تھے۔ کچھ نوجوان

نعرے بازی بھی کر رہے تھے۔

''سمیر بھیا، سنا ہے وہ لوگ بھی جمع ہو رہے ہیں اُدھر سرائے میں،'' ایک نوجوان چندی نے اس سے آ کر پوچھا۔

''کون لوگ؟'' سمیر نے جانتے ہوئے بھی کچھ انجان بنتے ہوئے کہا۔

''وہی سالے کتوے!... ابھی بھی چھاتی ٹھنڈی نہیں ہوئی ان کی، تیرہ سال کے لڑکے کو پھنسوانے کے بعد۔'' لڑکے کی سانسوں کے ساتھ اس کو ایک جانی پہچانی بو آئی۔ اس نے مسکرا کر لڑکے کا کندھا تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا۔

''دیکھیے، فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ ہم لوگ اپنی پوری طاقت کے ساتھ مظاہرہ کریں گے۔ تب تک کلکٹریٹ کے دروازے سے نہیں ہٹیں گے جب تک ضلعی انتظامیہ خود ہمیں یہ تحریری طور پر یقین دہانی نہیں کرواتی کہ سنی کے خلاف درج مقدمہ واپس لے لیا جائے گا۔ آپ لوگ یاد رکھیں، ہمیں کل کے واقعے کا اسی طور سے جواب دینا ہے۔ اگر وہ لوگ دباؤ ڈال کر سنی کے خلاف مقدمہ درج کروا سکتے ہیں تو ہمیں بھی دباؤ ڈالنا آتا ہے۔ یہ کسی ایک بچے کی بات نہیں ہے، یہ دھرم کی بات ہے۔ آج ان لوگوں نے دباؤ ڈال کر ایک بات منوائی ہے، کل کچھ اور بھی کر سکتے ہیں۔ اچھا ہے ابھی اسی وقت انھیں انھی کی زبان میں جواب دے دیا جائے۔'' اخبار دینک سماچار کے ایڈیٹر ایک مکان کے باہر بنے چبوترے پر کھڑے ہو کر ایک مجمعے سے خطاب کر رہے تھے۔ سمیر وہیں پاس کھڑے اسکوٹر پر بیٹھ کر اپنی نوٹ بک میں نوٹ کرنے لگا۔

''نمستے بھائی صاحب!'' آواز سن کر سمیر نے سر اٹھایا تو دیکھا، سنی کا چاچا سنیل کھڑا ہے۔ سنیل بھی صحافی ہے۔ راجدھانی سے نکلنے والے ایک گمنام اخبار کی پچیس کاپیاں شہر میں مفت تقسیم کرتا ہے اور جیب سے ان کاپیوں کا پیسہ بھر دیتا ہے۔ عوض میں اس کو صحافی ہونے کا کارڈ ملا ہے۔

''اور سنیل، کیا حال ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''بس بھائی صاحب، میں تو یہاں آنا ہی نہیں چاہتا تھا پر صحافی ہونے کے ناتے آ گیا،'' سنیل نے جواب دیا۔

''یعنی تم یہاں سنی کے چاچا کی حیثیت سے نہیں آئے ہو؟'' سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

Scanned with CamScanner

سنیل کچھ جواب دیتا، اس سے پہلے ہی ایک لڑکے نے آ کر کہا، ''سنیل بھیا، بینر والا بنا پیسے کے بینر نہیں دے رہا ہے۔'' سنیل نے جیب سے اسے سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا اور وہ چلا گیا۔

''کیا پوچھ رہے تھے بھائی صاحب؟'' سنیل نے کہا۔

''نہیں، کچھ نہیں،'' سمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تھوڑا دیکھ لیجیے گا بھائی صاحب، ٹھیک ٹھاک کوریج مل جائے۔ چینل وغیرہ پر آتا ہے تو سرکار پر دباؤ پڑتا ہے،'' سنیل نے چاپلوسی والے لہجے میں کہا۔

''تم فکر مت کرو،'' سمیر نے جواب دیا۔

جلوس روانہ ہو چکا تھا۔ سمیر نے سنیل کو چلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ساتھ چل دیا۔ سمیر نے دیکھا، راستے بھر یہی ہوتا رہا کہ کوئی نہ کوئی پیلی چندی سنیل کے پاس آ کر کچھ کہتی اور سنیل کچھ نہ کچھ جیب سے نکال کر اسے دے دیتا۔ بہت پرجوش نعرے لگاتا ہوا بجرنگ دَل کا دستہ بھیڑ کی شکل میں بڑی بہادری سے کلکٹریٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سیل فون وائبریٹ ہوا تو سمیر نے جیب سے نکال کر دیکھا۔ دلّی سے چینل کے آفس سے فون تھا۔ اس نے اپنی رفتار تھوڑی دھیمی کر دی۔

''ہاں سمیر، کیا صورت حال ہے؟'' لائن پر اودھیش چترویدی تھے۔

''ابھی تک تو کچھ ہوا نہیں ہے اودھیش جی، لیکن جس طرح کے نعرے لگ رہے ہیں اس سے میں پرامید ہوں کہ کچھ نہ کچھ تو ہوگا،'' سمیر نے اپنے لہجے میں بھرے طنز کو دباتے ہوئے جواب دیا۔

''پرامید مطلب؟'' اُدھر سے اودھیش چترویدی کی آواز آئی۔

''مطلب، پرامید اس بات کو لے کر ہوں کہ آپ کو کچھ نہ کچھ خبریں تو آج مل ہی جائیں گی،'' سمیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں ابھی چار بجے تک تو ہوں۔ اگر آفس کا فون بزی ملے تو فوراً میرے سیل پر کال کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ ہو جائے اور پہلے دوسرے چینل پر فلیش ہو جائے،'' اودھیش چترویدی نے کہا۔

''ٹھیک ہے اودھیش جی،'' سمیر نے اپنے اندر اٹھ رہے جذبات کو دباتے ہوئے مختصر سا جواب دیا اور فون کاٹ دیا۔

Scanned with CamScanner

جلوس اپنی منزل کی طرف پر جوش طریقے سے بڑھ رہا تھا۔ اشتعال انگیز نعرے بازی چل رہی تھی۔ سمیر نے دیکھا، وندنا سکسینہ اور اروند کمار پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ مین گیٹ کے اندر ہیں۔ گیٹ باہر سے بند ہے اور باہر بھی پولیس بڑی بھاری تعداد میں ہے۔

''آپ لوگوں میں سے چار پانچ لوگ چل کر میڈم سے بات کر لیجیے،'' ڈی ایس پی نے بھیڑ کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ اُن لوگوں سے بات کرنے تو میڈم جنازے تک چلی گئی تھیں، ہم میں کیا کانٹے لگے ہیں؟'' ایک بجرنگی نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔

''دیکھیے، میڈم آپ لوگوں کے لیے ہی یہاں آئی ہیں۔ پلیز، چل کر اپنی بات رکھ دیجیے،'' ڈی ایس پی نے پھر سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے، چلیے کر لیتے ہیں بات،'' کہتے ہوئے کچھ لوگ مین گیٹ کی طرف بڑھے۔ بھیڑ نے گیٹ کے چاروں اطراف گھیرابندی کر رکھی تھی۔ سمیر نے بھی گیٹ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر پھنس کے رہ گیا۔ کچھ ہی دیر میں بات کرنے کے لیے گئے لوگ بڑبڑاتے ہوئے اور ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے واپس آ گئے۔

''بھائیو! ضلعی انتظامیہ نے سنی کے خلاف مقدمہ واپس لینے سے انکار کر دیا ہے، اس لیے مجبوراً اب ہمیں گھیراؤ اور مظاہرے کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا...'' سمیر کو اتنا تو سنائی دیا، اس کے بعد کی آواز نعرے بازی میں گم ہو گئی۔ کچھ لوگ دوڑ کر کلکٹریٹ کے صدر دروازے سے جوجھنے اور اسے ہلانے لگے۔ جب پولیس کا لاٹھی چارج ہوا تب سمیر ہٹ کر کچھ دور کھڑا ہو گیا اور سیل فون سے اودھیش چترویدی کو بریف کرنے لگا۔ اطلاع دینے کے بعد اس نے دیکھا، بھیڑ تتر بتر ہو چکی تھی۔

سیل فون وائبریٹ ہوا تو سمیر نے اسے آن کیا۔ فون نیوز آفس سے تھا۔

''سمیر جی، ہم کال کو نیوز روم میں ٹرانسفر کر رہے ہیں، نیوز کاسٹر اخلاق ہے جو آپ سے سوال پوچھے گا۔'' اور اس کے بعد لائن نیوز روم میں ٹرانسفر ہو گئی۔ ''ہاں سمیر، بتایئے، کیا صورت حال ہے وہاں؟'' اخلاق کی آواز سنائی دی۔

''جی اخلاق، قریب دو ہزار لوگوں نے آج جلوس نکال کر مظاہرہ کیا تھا۔ یہاں کلکٹریٹ پر

آکر انھوں نے نعرے بازی کی۔ بعد میں جب کلکٹر نے سنی کے خلاف مقدمہ لینے سے انکار کر دیا تو بھیڑ نے کلکٹریٹ کا گھیراؤ کرلیا، جس پر پولیس نے لاٹھی چارج کر بھیڑ کو تتر بتر کر دیا،'' سمیر نے جواب دیا۔

''ابھی کیا صورت حال ہے وہاں؟'' اخلاق کی آواز آئی۔

''جی اخلاق، ابھی شہر میں تو صورت حال کشیدہ ہے، پر یہاں لاٹھی چارج کے بعد حالات قابو میں ہیں،'' سمیر نے جواب دیا۔

''سمیر، یہ گھیراؤ کی صورت حال اچانک ہی بن گئی یا پہلے سے اس کے لیے کوئی جواز پیدا کیا گیا تھا؟'' اخلاق کی آواز آئی۔

''اخلاق، یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ تھا کہ اگر مانگیں نہیں مانی گئیں تو پھر گھیراؤ کیا جائے گا،'' سمیر نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے سمیر، آپ حالات پر نظر رکھیے۔ ہم آپ سے جانکاری لیتے رہیں گے،'' اخلاق کی آواز آئی اور فون کٹ گیا۔

فون کٹنے کے تھوڑی دیر بعد پھر وائبریٹ ہوا۔ اس بار ڈی ایم وندنا سکسینہ لائن پر تھیں۔

''سمیر جی، آپ یہ جھوٹی خبریں کیوں دے رہے ہیں؟'' تلخ لہجے میں وندنا سکسینہ نے کہا۔

''کون سی میڈم؟'' سمیر نے سوال کیا۔

''یہی کہ کلکٹریٹ کا گھیراؤ ہوا؟'' وندنا سکسینہ نے کہا۔

''اس میں جھوٹ کیا ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''تو کیا آپ سچ بولیں گے؟'' وندنا سکسینہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''جی میں سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق ایسے ہی پیشے سے ہے،'' سمیر نے جواب دیا۔

''اور یہ دو ہزار لوگ کہاں تھے؟'' وندنا سکسینہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''بھیڑ میں تھے میڈم، اور کہاں تھے؟'' سمیر نے جواب دیا۔ سمیر کے جواب کے ساتھ فون ڈس کنیکٹ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر سمیر نے ٹی وی کھولا ہی تھا کہ سیل فون پھر تھرتھرا اٹھا۔

Scanned with CamScanner

''ہیلو سمیر، یہ کیا کر رہے ہو بھئی؟'' ادھر سے اودھیش چترویدی کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔
''کیا ہو گیا اودھیش جی؟'' سمیر نے پوچھا۔
''بھئی یہ تم نے کیا بول دیا فون پر کہ کلکٹریٹ کا گھیراؤ ہوا ہے؟ تمھاری ڈی ایم بول رہی ہیں کہ کچھ نہیں ہوا ہے ایسا،'' اودھیش چترویدی نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔
''وہ تو ایسا بولیں گی ہی!'' سمیر کے لہجے میں لاپروائی کا عنصر تھا۔
''گھیراؤ کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟'' اودھیش چترویدی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''اودھیش جی، گھیراؤ تو ہوا تھا...'' سمیر نے بولنے کی کوشش کی مگر اودھیش چترویدی نے بیچ میں ہی بات کاٹتے ہوئے کہا،'' اب رہنے دیجیے آپ! ہم آپ کے یہاں کی ڈی ایم کو فون کر رہے ہیں تاکہ اصل صورت حال معلوم کی جا سکے۔'' سمیر نے موبائل آف کر دیا۔
سامنے ٹی وی پر وندنا سکسینہ کا فوٹو چل رہا تھا کہ ''شہر میں صورت حال بالکل معمول کے مطابق ہے، کہیں کوئی تناؤ نہیں ہے۔ کلکٹریٹ کے گھیراؤ جیسی کوئی صورت حال پیش نہیں آئی۔ کچھ تنظیموں نے آ کر اپنی کچھ مانگیں رکھی ہیں جن پر ہم غور کر رہے ہیں۔'' ٹی وی کا سوئچ آف کر کے سمیر کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

ساری دکانیں بند ہیں۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ جس طرح ابھی تھوڑی دیر پہلے وندنا سکسینہ اپنے بیان میں کہہ رہی تھیں، یہ شاید ان کے بیان کی صداقت تھی کہ پورا شہر 'خاموش' ہے۔ سچ کا سب سے عجیب پہلو یہی ہے کہ جب وہ ننگا ہو جائے تو بہت بھدا لگتا ہے۔ جب تک اس پر جھوٹ کی چھوٹی موٹی چندیاں یہاں وہاں لگی ہوں تب تک سب اسے پسند کرتے ہیں، مگر وہ چندیاں ہٹ جائیں تو پسند کرنے والے لوگ ہی واویلا مچانے لگتے ہیں۔ کافی دیر تک سمیر وہیں کھڑا رہا اور خاموشی کی دہشت کو محسوس کرتا رہا۔ چاروں طرف دن دہاڑے ہی خاموشی پھیل جائے تو وہ خاموشی بھی عجیب سی دہشت بھر دیتی ہے دلوں میں۔ واپس آ کر ٹی وی آن کیا تو دیکھا کہ اس بار ایس پی اروند کمار کا فوٹو چل رہا ہے جو کہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہے ہیں کہ ''شہر کی صورت حال معمول کے مطابق ہے، کہیں کوئی تناؤ نہیں ہے۔ کلکٹریٹ پر کوئی مظاہرہ یا گھیراؤ نہیں ہوا، نہ ہی کسی طرف سے طاقت کا استعمال ہوا۔''

سمیر کو لگا کہ اسے چاروں طرف سے ایک بھیڑ گھیرتی جا رہی ہے۔ بھیڑ کا کچھ حصہ پیلا ہے تو کچھ حصہ ہرا ہے۔ ایک طرف سے آ رہی پوری بھیڑ خاکی رنگ کی ہے۔ یہ بھیڑ اس کا گھیراؤ کرتی جا رہی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے رنگ کے حساب سے نعرے لگا رہے ہیں۔ سب کے چہرے تنے ہوئے ہیں اور مٹھیاں بھنچی ہوئی ہیں۔

سمیر نے بند پڑے سیل فون کو آن کیا اور میز پر رکھ دیا اور انتظار کرنے لگا چینل کے ہیڈ آفس سے آنے والے فون کا: ''مسٹر سمیر، یو آر فائرڈ۔''

گھیراؤ ہو چکا تھا۔ اور شہر ابھی بھی پرامن تھا...

❁❁

لکھنے والوں کا تعارف

پھنیشور ناتھ رینو

پھنیشور ناتھ رینو (1977-1921) ہندی کے ان جدید کہانی کاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے پریم چند کی درخشاں روایت کو آگے بڑھایا اور اس میں قیمتی اضافے کیے۔ انھوں نے ہندی میں آنچلک یا علاقائی کہانی کی شروعات کی جس کے ذریعے مختلف خطوں سے آنے والے ہندی فکشن نگاروں نے اپنے اپنے علاقے کی مخصوص فضا، لہجے، کرداروں اور انسانی صورت حال کو زیادہ اعتماد کے ساتھ ہندی فکشن کے مرکزی دھارے میں شامل کیا۔ رینو بہار کے ضلع اَرریا کے قصبے فوربس گنج کے قریب اوراہی ہنگنا نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم نیپال میں ہوئی جس کے بعد انھوں نے بنارس کی ہندو یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن 1942 میں وطن کی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ بعد میں، 1950 کی دہائی میں، انھوں نے نیپال کی انقلابی تحریک میں بھی حصہ لیا جس کے نتیجے میں وہاں جمہوریت کی بنیاد پڑی۔ 1970 میں انھیں ہندوستان کا اعلیٰ ترین شہری اعزاز پدم شری پیش کیا گیا جو انھوں نے چند سال بعد جے پرکاش نرائن کی رہنمائی میں چلنے والی سیاسی تحریک کے دوران احتجاجاً واپس کر دیا۔

رینو کا پہلا ناول میلا آنچل 1954 میں شائع ہوا جسے پریم چند کے گئو دان کے بعد کے دور کا ایک اہم ہندی ناول سمجھا جاتا ہے۔ ان کے دیگر ناولوں میں پرتی پری کتھا، جلوس اور جنازہ، کتنے چوراہے اور پالتو بابو روڈ شامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کے بھی متعدد مجموعے شائع ہوئے جن میں سے چند کے نام مارے گئے گلفام، لال پان کی بیگم، ٹھیس، لکشمی، اگنی خور، اچھے آدمی، ایک شراونی دوپہری اور پری اور مینو کی کہانیاں ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی یادداشتیں بھی تحریر کیں جو کئی جلدوں میں شائع ہوئیں۔ موجودہ انتخاب میں شامل کہانیاں رینو کے مجموعے اچھے آدمی سے لی گئی ہیں۔

Scanned with CamScanner

مدرا راکھشس

ہندی کی معاصر کہانی اور تھیٹر میں ممتاز مقام رکھنے والے مدرا راکھشس (اصل نام سبھاش چندر آریہ) 1933 میں لکھنؤ کے قریب بہتا نامی قصبے میں پیدا ہوے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے ادبی صحافت کو پیشے کے طور پر اختیار کیا اور اس کا آغاز کلکتہ سے شائع ہونے والے گیان اُدے کی نائب مدیری سے کیا۔ کئی رسالوں کی ادارت کے بعد انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے اسکرپٹس کے شعبے میں ملازمت کر لی۔ ڈرامے کے میدان میں ان کے اولین استادان کے باپ شوچرن لال پریم تھے جو اتر پردیش کے اُس علاقے کے مقبول عام سوانگ پیرا میں حصہ لیتے تھے۔ ادب کے میدان میں انھوں نے اپنے نانا آچاریہ چترسین شاستری کا اثر قبول کیا جو ایک نمایاں ادبی شخصیت تھے۔ مدرا راکھشس نے اپنی پچاس برس سے زیادہ کی تخلیقی زندگی میں بہت سی کہانیاں، ناول، ڈرامے اور مضامین لکھے۔ ان کے مشہور ڈراموں میں مرجیوا، یعوذ فیتھ فلّی، تیندوا، تل چٹا، گپھائیں، ڈاکو اور اعلی افسر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دس ناول اور کہانیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوے۔ مدرا راکھشس کی کہانیاں اس سے پہلے آج کے کئی شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس بار ان کی کہانیوں کا ایک نسبتاً جامع انتخاب شامل کیا جا رہا ہے جس سے ان کے موضوعات کے تنوع اور کمٹ منٹ کے استحکام دونوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اصغر وجاہت

اصغر وجاہت 1946 میں اتر پردیش کے ضلع فتحپور میں پیدا ہوے۔ انھوں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہندی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا اور تدریس کو پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ 1971 سے وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، کے ہندی کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ اصغر وجاہت کی بیس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں پانچ ناول، چھ ڈرامے، کہانیوں کے پانچ مجموعے اور ایک سفرنامہ شامل ہے۔

Scanned with CamScanner

پنکج سُبیر

پنکج سُبیر ہندی کہانی کاروں کی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پچھلے دس پندرہ سال میں لکھنا شروع کیا۔ وہ 1975 میں پیدا ہوئے اور بھوپال کی برکت اللہ یونیورسٹی سے سائنس میں ماسٹرز کیا۔ وہ کئی ہندی اخباروں میں مضامین لکھتے رہے ہیں اور اب اپنی نیوز ایجنسی چلاتے ہیں۔ ان کے ناول یہ وہ سحر تو نہیں کو 2010 میں بھارتیہ گیان پیٹھ کا نولیکھن ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ایسٹ انڈیا کمپنی تھا جس سے اس انتخاب میں شامل تینوں کہانیاں لی گئی ہیں۔

Scanned with CamScanner

جعفر زٹلی

زٹل نامہ

(کلیات)

مرتب: رشید حسن خان

قیمت: 300 روپے

اردو زبان اور ادب کے تاریخ نگاروں نے دو بڑی غلط فہمیوں کو رائج کر رکھا ہے: ایک یہ کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا، اور دوسری یہ کہ شروع ہی سے غزل اردو شاعری کا اصل سرمایہ رہی ہے۔ جعفر زٹلی اور ولی دکنی کا تعلق ایک ہی زمانے سے ہے، اور زٹل نامہ کے عنوان سے جعفر کا دیوان ولی کے دہلی آنے سے برسوں پہلے مرتب کیا جا چکا تھا۔ جعفر کے کلیات میں ایک بھی غزل نہیں۔ اس طرح یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ دہلی میں اردو کی شعری روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو اولیت حاصل ہے، اور یہ بھی کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے نہیں، سماجی حقیقت نگاری سے معمور شاعری سے ہوا جو سر تا سر نظموں پر مشتمل ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام ایک طرف شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی پہلی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اور دوسری طرف سماجی مسائل و مشکلات کے پُرزور اور پُرشور بیان کے لحاظ سے وہ اردو کا اولین شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے۔ کلامِ جعفر کی یہ بڑی اہمیت ہے کہ اس کی بنیاد پر اردو زبان اس پر فخر کر سکتی ہے کہ شروع ہی سے اردو شاعری میں سماجی مسائل و مشکلات کا بے لاگ بیان موضوعِ سخن کے طور پر ملتا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے لہجے میں بے باکی ہے اور کھردراپن۔ جعفر اس روایت کا بنیاد گزار ہے۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات، بیکاری، بدنظمی، افلاس، ان سب کے ہلکے گہرے بیانات اس کی شاعری میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ وہ با اقتدار افراد جن کے نکمے پن کے نتیجے میں یہ حالات پیدا ہو رہے تھے، ان کا نام لے کر ان کو اس کا ذمے دار کہنا، یہ صاف گوئی اور بے باکی بھی اس شاعری کا حصہ رہی ہے۔ وہ زمانہ مطلق العنان شخصی حکومت کا تھا، آج کل جیسی جمہوریت کا نہیں تھا، اُس زمانے میں واقعتاً بات پر زبان کٹتی تھی: ایسے زمانے میں یہ بے باک بلند گفتاری داد کے قابل ہے۔ دورِ اول کی اس روایت نے، جس کا سب سے بڑا نمائندہ جعفر ہے، ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ اس کے اثر سے لسانی سطح پر اُس کھردرے پن نے فروغ پایا جس کے بغیر احتجاجی شاعری سرسبز نہیں ہو پاتی: لہجے کے بھاری پن کو برقرار رکھا، پُرشور لفظیات کا ذخیرہ فراہم کیا، بیان کو ریشمی پن سے محفوظ رکھا اور اُس آہنگ کی تشکیل کی جو رومانیت سے دور ہے۔

جعفر زٹلی کا کلام شمالی ہند میں ارتقائے زبان کی ابتدائی شکل صورت کو پیش کرتا ہے۔ اس میں 'ریختہ' کی ابتدائی مثالیں محفوظ ہیں اور لفظیات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جس کو ادب، زبان، لغت اور لسانیات کا کوئی سنجیدہ طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

Scanned with CamScanner

صادق ہدایت

بوف کور

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

قیمت: 200 روپے

شہرِ رے کے نواح میں ایک خستہ و درماندہ شخص اپنی زندگی اور تخلیق کے کابوس کو کاغذ پر منتقل کر رہا ہے تاکہ خود کو پہچان پانے سے پہلے مر نہ جائے۔ اپنی تلاش کا یہ آسیب اُسے خود کو دُہراتی ہوئی ایک تاریک اور مہیب دنیا میں لے جاتا ہے جہاں وجودِ انسانی کے ناقابلِ علاج زخم تازہ ہیں۔ ڈراؤنے خوابوں کی یہ دنیا ایڈگر ایلن پو کی دنیا سے مماثل ہے اور اس کی تعبیر وجودیت کے فلسفے کی مدد سے بھی کی جاتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اہم ناول، جو اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک زندہ دستاویز اور فنی معیار کے لحاظ سے ایک مکمل شہ پارہ ہے، جدید فارسی ادب کو ادبِ عالیہ کے بڑے دھارے سے جوڑ دیتا ہے۔

اس ناول کے مصنف صادق ہدایت کو متفقہ طور پر فارسی فکشن کا پہلا بڑا نام سمجھا جاتا ہے۔ ہدایت ۱۹۰۳ء میں تہران میں پیدا ہوا اور ۱۹۳۰ء میں اس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ہدایت کی دوسری تصانیف میں تاریخی ڈرامے، طنزیہ خاکے (''قضیے'')، تنقیدی مقالے اور مغربی زبانوں کے فکشن کے ترجمے شامل ہیں۔ اپنے زمانے کی مذہبی رسومیات پر اس کی شدید طنز آمیز تحریر ''توپ مرواری'' اس کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ تاہم ''بوف کور'' کو ہدایت کا اہم ترین ادبی کارنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ زندگی سے بیزاری، موت کی کشش اور خودکشی کا میلان ہدایت کی گنجلک شخصیت کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اس تاریک طرزِ احساس کی وجہیں اس کے ذاتی احوال میں بھی تلاش کی گئی ہیں اور اپنے وقت کے ایرانی معاشرے سے اس کی عدم مناسبت میں بھی۔ وہ رفتہ رفتہ ایران میں جینے مرنے سے بالکل بیزار ہو کر ۱۹۵۰ء میں فرانس چلا گیا اور اپریل ۱۹۵۱ء میں پیرس میں گیس سے دم گھونٹ کر خودکشی کر لی۔

اس اردو ترجمے کے لیے ناول کے اصل فارسی متن کے علاوہ ڈی پی کاستیلو کے کیے ہوئے انگریزی ترجمے The Blind owl کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

Scanned with CamScanner

ارشد محمود

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

قیمت: 200 روپے

ہم نے اپنے ماحول اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس حد تک جامد، خشک، بور، بے کیف، حسن اور لطف سے عاری کر رکھا ہے کہ بحیثیت حیوان جن جبلّی خوشیوں پر ہمارا حق ہو سکتا تھا، یہ کہہ کر کہ ہم حیوان نہیں انسان ہیں، اُن سے خود کو محروم کر لیا، اور انسان ہونے کے ناتے جن خوشیوں پر حق ہو سکتا تھا انھیں یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ہم انسان نہیں مسلمان ہیں۔ یہ ہے ہمارا ثقافتی المیہ۔ نتیجہ یہ کہ ہم اجتماعی طور پر حسن کے احساس اور خوشیوں کی لذت سے آشنا ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کے بیری بن چکے ہیں۔ اب سنجیدگی کا مارا، تاریکی پسند اور جمالیاتی حسوں سے محروم انبوہِ کثیر، عالمی تہذیبِ نو سے اپنی ثقافتی، سیاسی اور معاشی دشمنی میں اضافہ کیے چلا جا رہا ہے۔ بربادی اور موت کی علامتوں سے اپنی شاہراہوں کو سجانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ خود ساختہ اخلاقیات اور پارسائی کے خبط نے ماحول میں مُردنی، گھٹن اور بے کیفی اس حد تک پیدا کر رکھی ہے کہ اس کے اندر زندگی اور دنیا کو خوبصورت بنانے یا اسے ترقی دینے کی لگن اور دلچسپی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ایک طرف ہماری طاقتور ایلیٹ (elite) حکمران کلاس ہے، جو حیوانی اور انسانی سطح کی سب جبلّی لذتوں سے بہرہ مند ہے۔ اس نے اخلاقیات اور پاک دامنی کے سب اسباق عام آدمی کے لیے رکھ چھوڑے ہیں، تا کہ عوام کے حصے کی خوشیوں پر قبضہ جاری رکھا جا سکے۔ دوسری طرف کروڑوں عوام کا وہ جمِ غفیر ہے جہالت اور غربت جن کا مقدر ہے، اور یہ مقدر اسی طاقتور طبقے کا لکھا ہوا ہے۔ وہ خوبصورتی اور لذتوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ کسی بھی سوسائٹی کی ساری تڑپ، جدوجہد اور امید کی کرن صرف متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جسے اپنے لیے اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے خوبصورتی اور خوشیاں درکار نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہمیں اپنے اوپر سے مسخ شدہ انسان کا چوغہ اتار پھینکنا چاہیے اور خوبصورت بننے، ماحول کو خوبصورت کرنے اور ہر ایک کے اپنے انداز سے خوش ہونے کے حق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اگر اس طبقے کی مزاحمت نہیں کریں گے جو ثواب اور پارسائی کے نام پر پورے معاشرے کو بلیک میل کرتا ہے، اُسے پیچھے رہنے، گھٹن زدہ اور بدنما زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے، تو ہمارے اس وطن میں تہذیب کے رہے سہے آثار بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی کاوش ہے۔

Scanned with CamScanner

ریشارد کاپوشِنسکی

شہنشاہ

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

قیمت: 200 روپے

ایران میں 1979 میں برپا ہونے والا انقلاب ہمارے خطے میں پیش آنے والا ایک نہایت اہم اور پر معنی واقعہ تھا، اور اس کے بارے میں بے شمار مضامین اور کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتاب پولینڈ سے تعلق رکھنے والے معروف صحافی ریشارد کاپوشنسکی (Ryszard Kapuscinski) کے ادبی رپورتاژ shah of shah کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد غالباً آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ایران کی جدید تاریخ کے پس منظر میں اس انقلاب کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے اور پراثر انداز میں بیان کرنے میں مشکل ہی سے کوئی اور تحریر اس بلندی کو پہنچی ہوگی۔ یہ ترجمہ پہلی بار سہ ماہی آج، کراچی کے شمارہ 14 (گرما خزاں 1993) میں اور پھر کتاب کی شکل میں 1997 میں شائع ہوا۔

آج کی شورش زدہ دنیا کی گرفت میں لانے کے ایک خاص طرح کی فہم اور خاص طرح کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس پیچیدہ دنیا کے واقعات کو اُن اصطلاحوں اور اظہار کے اُن سانچوں کی مدد سے سمجھنا اور بیان کرنا ممکن نہیں رہا جنھیں ایک نسبتاً سادہ تر دنیا کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ معمولی درجے کے صحافی بلکہ تخلیقی ادیب بھی۔ واقعات کے اس جم غفیر میں راہ کھو بیٹھتے ہیں اور اپنے بیان کو کوئی واضح اور مکمل شکل نہیں دے پاتے۔ کاپوشنسکی کے پاس یہ گر موجود ہے۔ ان کی تحریریں عام صحافتی تحریروں سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے لیے ایک خاص زمرہ وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ادب اور صحافت کے درمیان تمام امتیازات یہاں آ کر اپنی معنویت کھو بیٹھتے ہیں۔

کاپوشنسکی کے مخصوص اسلوب اور بیانیے کی ہیئت کو بعض لوگوں نے ''طلسمی حقیقت نگاری'' کی وضع پر ''طلسمی خبر نگاری'' کا نام دیا، اگرچہ خود ان کے خیال میں اسے ''ادبی رپورتاژ'' کہا جانا چاہیے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ عمدہ صحافت کا راستہ شاعری سے ہو کر گزرتا ہے کیونکہ شاعری اظہار میں درستی اور تناسب کی تربیت دیتی ہے۔ کسی وسیع حقیقت کو احتیاط سے چنی ہوئی چھوٹی چھوٹی تفصیلات ایک حساس بیانیے کی ہیئت میں مرتب کر کے بیان کیا جا سکتا ہے، اور یہ ہنر کاپوشنسکی کی تحریروں میں کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ کاپوشنسکی اُس شے پر بالکل یقین نہیں رکھتے جسے ''غیر جانبدار صحافت'' کہا جاتا ہے: ان کے خیال میں صحافی کبھی ایک لاتعلق گواہ نہیں ہو سکتا۔ وہ یورپ میں ادبی رپورتاژ کی اس روایت کا حصہ ہیں جس میں واقعہ نگار کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ کاپوشنسکی کا کہنا تھا کہ وہ دنیا کے ہر خطے میں موجود ایسے لوگوں کے لیے لکھتے ہیں جو ابھی اتنے عمر رسیدہ نہیں ہوئے کہ دنیا کے بارے میں تجسس کھو بیٹھیں۔

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(کہانیاں)
قیمت: 80 روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت: 90 روپے

انیس
(سوانح)
قیمت: 375 روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 150 روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 280 روپے

کافکا کے افسانے
(افسانے)
قیمت: 70 روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
زیرِ طبع

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت: 200 روپے

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطرِ کافور	نیر مسعود	Rs. 80
نربدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 3)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
کلمنجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs.120

Scanned with CamScanner

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریئل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
خیمہ	میرال الطحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکر کی قمیض	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیو لیامازاریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمینِ مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70
انگی کے دیس میں	ولاس سارنگ	ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال	Rs.150
امید اور دوسرے خطرناک مشاغل	لیلیٰ العلمی	ترجمہ: محمد عمر میمن	Rs.100

Scanned with CamScanner

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیر طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120

Scanned with CamScanner

۳۷

خصوصی شمارہ: ہندی کہانیاں

قیمت

۳۰۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner